دل گداز تحریریں ۔ زندگی کی تصویریں

کراچی

سچی کہانیاں

MAY
2012

PDFBOOKSFREE.PK

اندرونی صفحات پر



اس شمارے میں

☆ زندہ کہانی، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، جیتی جاگتی کہانیاں

☆ ”آتش بینوں“ سلیم فاروقی کے قلم سے.....

☆ ”مسئلہ یہ ہے“ قرآنی آیات کے ذریعے آپ کے مسائل کا حل

7 تقدیر — منزہ سہام
9 احوال — منزہ سہام
29 شہنشاہِ جذبات — راجہ محمود
43 داغدار چہرے..... — دانا ناصر
46 انگارے بنے پھول — رضوان قیوم
65 آگ کا دریا — جیجل مینلو
77 شہید کی ڈائری — منزہ سہام
79 کیا وہ ماں تھی؟ — نفیسہ فضل
83 ایک ٹیس سی ہے اٹھتی — حنا بشری
88 صراطِ مستقیم — سیمیں غزالہ نیاں
95 نسخہ کیمیا — صدف اصف
103 سفرِ حیات کٹا — لحرین الرئیس
109 گردشِ رنگ چمن — حنیف سحر
121 کارِ ابلیس آسان ہوا — محمد لبیب
130 میری مہرباں..... — ممتاز احمد
137 وہ ایک نشان — مہتاب خان
144 چالیس دن بعد — نسرین رانا
147 اندھے بہرے لوگ — ارم زہرا
157 انسان نہیں درندے — اقبال زمان
160 اُجالوں کا سفر — رخسانہ سہام مرزا
167 زندگی لکھ رہا ہوں میں — انور فرہاد
175 آپ کی ڈائری — قارئین
183 مسئلہ یہ ہے — اکارہ
191 خیال آرائی — قارئین
195 کتاب تبصرہ — عکاشہ سحر
199 پسند اپنی اپنی — قارئین
202 جن آنکھوں میں — فاطمہ بلگرامی
221 تاشون — شازلی سعید مغل
234 آتشِ جنوں — سلیم فاروقی
258 بازگشت — سہام مرزا

www.pdfbooksfree.pk

اور اب؟
آپ کا.....
سچی کہانیاں

ماہ جون2012ء سے ایک نئے انداز، نئی ترتیب اور کچھ نئے سلسلوں کے ساتھ آپ کی نگاہوں کا مہمان ہوگا۔

نئے سلسلے

❁ **سڑک کہانی**..... اُن لوگوں کی کہانیاں جن کی زندگی سڑکوں پہ سانس لیتے گزرتی ہے.....

❁ **اِس ماہ کی خاص کہانی**..... زندگی کے مختلف شعبوں سے جڑی چشم کشا کہانیوں اور واقعات سے انتخاب.....

❁ **یاد کے گہرے ساگر میں**..... شوبز کی چمکتی دمکتی دنیا سے جڑی یادوں کا سلسلہ.....

❁ **سچی کہانیاں MINI MAG**..... سچی کہانیاں کے مقبول سلسلوں آپ کی ڈائری، خیال آرائی، کتاب تبصرہ اور پسند اپنی اپنی کے علاوہ کچھ اور نئے دلچسپ سلسلے شامل ہوں گے.....

آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال یا اپنے ہاکر سے کاپی بک کرالیں..... پھر نہ کہیے گا ہمیں خبر نہ ہوئی

110۔ آدم آرکیڈ۔ شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ، کراچی

تقدیر

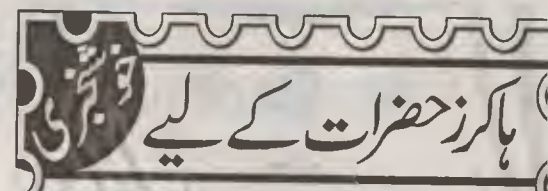
ہم جو کچھ سیکھتے ہیں وہ اپنے بڑوں سے سیکھتے ہیں اسی لیے وقت گزرنے کے ساتھ ہم بالکل اُن جیسے ہی ہوجاتے ہیں..... آپ کے اردگرد بھی اکثر ایسے لوگ ہوں گے جو اب بالکل اپنے بڑوں کا پَرتو محسوس ہوتے ہوں گے۔ اصل میں ہماری محبت ہمیں اپنے والدین جیسا بنا دیتی ہے۔ میرے والد بہت اچھی بات کہا کرتے تھے۔

وہ کہتے تھے۔ ''برائی کو کبھی برائی کی طرح مت لو بلکہ اس میں سے بھی مثبت پہلو نکالو۔''

جب انسان کی سوچ مثبت ہوتی ہے، تب سب کچھ ٹھیک ہوجاتا ہے۔ ہم سب کا المیہ یہ ہے کہ ہم دنیا کو ٹھیک کرنا چاہتے ہیں مگر اپنے بارے میں سوچتے ہی نہیں..... اگر ہر شخص صرف اپنا محاسبہ کرنا شروع کردے تو برسوں کی بگڑی تقدیریں دنوں میں تبدیل ہوجائے گی!!

منزہ سہام

www.pdfbooksfree.pk



ہاکرز حضرات کے لیے

پورے پاکستان اور خصوصاً کراچی کے ہاکرز حضرات کے لیے ادارہ ''سچی کہانیاں'' خصوصی گفٹ اسکیم کا اعلان کررہا ہے۔

اس اسکیم کے تحت جو ہاکر حضرات سب سے زیادہ ''سچی کہانیاں'' فروخت کرے گا، وہ انعام کا مستحق قرار پائے گا.....اس سلسلے میں ہاکرز مکمل کوائف کے ساتھ ایجنٹ کے ذریعے سرکولیشن منیجر سے رابطہ کریں۔

منیجر سرکولیشن

محمد اقبال زمان

Cell No. 0300-2313256

احوال

منزہ سہام مرزا قارئین کے درمیان

عزیز احوالیو! خوش رہیے اور ہنستے رہیے۔ اصل میں یہی وہ دو چیزیں ہیں جو ہمارے معاشرے سے مفقود ہوتی جارہی ہیں۔ بہرحال ہم اور آپ مل کر اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔ آپ سب نے مجھے 'احوال' میں دیکھا، اچھا لگا۔ آئندہ ماہ سے سچی کہانیاں میں کچھ تبدیلیاں لائی جارہی ہیں۔ امید ہے کہ آپ کو اچھی لگیں گی۔ ہماری پیاری رضوانہ پرنس نے فون کرکے سچی کہانیاں شمارہ اپریل کی بہت تعریف کی اور زندہ کہانی کے سلسلے کو بہت سراہا۔ شکریہ رضوانہ! اگر آپ خط لکھتیں تو بہت اچھا لگتا۔ جتنے خطوط اب تک موصول ہوئے تھے ان سب کو شامل ''احوال'' کیا جاچکا ہے۔ دیر سے آنے والے خطوط کی رسید دی جائے گی اور آپ لوگوں سے درخواست کروں گی کہ جلدی جلدی خط لکھ دیا کریں۔ اس ماہ سے بہترین خط کو 3 ماہ کے لیے سچی کہانیاں کے ساتھ دو شیزہ بھی جاری کیا جائے گا۔ ایک گزارش اور ہے کہ آپ لوگ کوپن کے ہمراہ خط لکھیں اور اپنی تصویر بھی ضرور ارسال کریں۔ چلیے اب چلتے ہیں خطوط کی جانب۔

☒ شگفتہ شفیق کراچی سے۔ ''پیاری منزہ السلام علیکم! ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ ''احوال'' پڑھا۔ بہت اچھا لگا۔ میرے دل نے بہت زیادہ دعا کی کہ اللہ پاک ناصر بھائی کو درازی عمر اور صحت عطا فرمائے، آمین۔ تمہیں اپنی سالگرہ کی خوشیاں مبارک ہوں۔ اللہ پاک تمہیں اور بھی زیادہ کامیابیوں سے نوازے۔ ''محسن'' بہت اچھا لگا۔ فائزہ شہزاد کے بہنوئی اور ارم زہرا کی پھوپی جان کی مغفرت کے لیے دعا کیں۔ ارباب قربان علی ایری کا مختصر اور جامع خط اچھا لگا۔ راجہ محمود صاحب ہر دفعہ بہترین تحریر دیتے ہیں۔ ''محبت کا چہرہ'' تکمیل نے اپنی خوب صورت یادوں کی پٹاری کھولی اور آنکھیں بھگو گئیں۔ مجھے بے اختیار اپنے پیارے پاپا یاد آگئے۔ ''اے مبا ہوئے مدینہ'' خوب صورت وسہانے سفر کا روح پرور احوال بے حد اچھا لگا۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ ہماری بیٹی کنزل 28 مارچ کو لندن جارہی ہے۔ اپنے میڈیکل Elective کرنے Kings college londan میں۔ وہاں وہ سینٹ تھامس اسپتال میں ایک مہینہ تک Elective کرے گی۔ منزہ میں نے اپنی ایک خوب صورت ڈائری اس کے حوالے کی ہے کہ اپنے سفر کا احوال اس میں لکھ کر لانا۔ ایک اسٹوڈنٹ کا سفر کا کیسا تجربہ رہتا ہے۔ پڑھ کے مزہ آئے گا بشرطیکہ کنزل لکھ کے لائے۔ اگر لکھے گی تو مجھے یہ یقین ہے کہ بہت اچھا ہو گا اس کا سفر، سفر نامہ بہت اچھا ہوگا۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں ہیں کیونکہ ''سچی کہانیاں'' کل ہی موصول ہوا ہے۔ حسب سابق تمام کہانیاں اچھی ہی ہوں گی۔ اب اجازت، اللہ حافظ۔''

☆ پیاری سی شگفتہ! سدا مسکراتی رہیے۔ پھولوں کا بہت شکریہ یہ دنیا کا سب سے حسین تحفہ ہے۔ بہت جامع خط لکھا شکریہ۔ کنزل کے لیے دعائیں ہیں۔ بیٹیاں ویسے بھی بہت پیاری ہوتی ہیں۔ انشاء آنے سے پہلے بتا تو دیا کریں اس بار ملاقات نہیں ہوئی اچھا نہیں لگا۔ امید ہے کہ جلد ملاقات ہوگی۔

☒ ممتاز احمد سرگودھا سے۔ ''انتہائی قابل احترام مینجنگ ایڈیٹر، السلام علیکم! اللہ پاک کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ وہ سب کو اپنی امان اور نعمتوں کی چھاؤں تلے رکھے، آمین۔ اپریل کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ ناصر رضا کے بغیر ''احوال'' سونا

www.pdfbooksfree.pk

سونا لگ رہا ہے۔ آپ نے خطوط کے جواب بہت ہی عمدہ اور شاندار دے کر احوال کی محفل کو خوب سجایا۔ ایک نئی موبائل کہانی اور خیال آرائی کے ساتھ حاضر خدمت ہوں۔ اداریہ بہت ہی شاندار تھا۔ ارم زہرا کی پھوپی مرحومہ کی بخشش و مغفرت اور بلندی درجات کے لیے دعا گو ہوں۔ راجہ محمود کی ''یادوں کے رنگ'' پڑھ کر صادقین کے بارے میں بہت سی قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔ محمد سلیم اختر کی ''خزاں کے بعد'' بہت شاندار کہانی تھی۔ سعدیہ کا کردار واقعی بہت قابل ستائش ہے۔ انسان کا عزم اور حوصلہ جوان ہو تو راستے کی چٹانیں بھی معمولی کنکر بن جاتی ہیں۔ مینا تاج کی ''چکن بریانی'' اچھی تھی۔ ''شہید کی ڈائری'' زبردست رہی۔ ام عادل کی ''دکھوں کے مارے'' پڑھ کر دل افسردہ ہو گیا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو آ گئے۔ کہانی بہت اچھی تھی۔ حنیف سحر کی ''گردش رنگ چمن'' کا پہلا حصہ پڑھا۔ یہ بات سو فیصد درست ہے کہ عورت کو طوائف بنانے میں غربت، افلاس اور مرد کا ہاتھ ہے۔ کہانی سیدھے انداز سے بھی لکھی جا سکتی تھی مگر اسے بے کار طول دے کر بے رنگ کہانی بنا دیا گیا اور خوامخواہ کا فلسفہ بگھارا گیا ہے۔ مرزا شبیر بیگ ساجد کی ''انسان اور فرشتہ'' پڑھ کر بے اختیار زبان سے سبحان اللہ کا کلمہ نکلا۔ عمرانہ رمضان کی ''کلام حق'' ایک مختصر، پُراثر اور عظمت قرآن کی دلالت کرتی شاندار کہانی تھی۔ موبائل کہانی بہت سبق آموز تھی۔ یہ سچ اور حقیقت ہے کہ انسان وہی فصل کاٹتا ہے جس کا وہ بیج بوتا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے۔ ''خیال آرائی'' میں سب لکھاریوں نے بہت عمدہ لکھا۔ صائمہ سحر کی برتھ ڈے پر انہیں وش نہیں کر سکا۔ اس کے لیے دلی معذرت۔ سچی کہانیاں کی پوری ٹیم اور تمام قارئین کرام کے لیے بہت سی دعائیں۔''

☆ بھیا ممتاز! اپنی رائے سے ہمیں ضرور نوازہ کریں۔ حنیف سحر صاحب کی کہانی کے سلسلے میں آپ کی رائے اُن تک پہنچ گئی ہے۔ آپ کو شائع کردہ کہانیاں اچھی لگیں، ہمیں یہ اچھا لگا اور میری تحریر آپ کو پسند آئی اس کا ذاتی طور پر شکریہ۔ احوال میں آئندہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

✉ عبدالعزیز جی آ چکوال سے۔ ''قابل صد احترام بہن منزہ، السلام علیکم! بہنا از حد دکھ کی بات ہے کہ ہماری نئی نسل کو لگتا ہے اپنے وطن سے کوئی پیار نہیں ذرا محبت نہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً وہ میری نظم پر تبصرہ ضرور کرتے۔ خدارا پاکستان کی قدر کرو۔ یہ قائم ہے تو اس کے دم سے ہم ہیں۔ اس کے ساتھ ہماری عزت و وقار ہے۔ ہماری پہچان ہے، ہمارا نام ہے۔ عزت مآب فہیم انکل، وفا صدام، نازیہ بتول، حافظ مون شاہ، ممتاز احمد، شگفتہ شفیق، مینا تاج، عکاشہ سحر، سدرہ انور، بشریٰ سعید، زنیرہ اقبال، ام عادل، صائمہ سحر، سدرہ ارباب، ہما، گڈی اور مور شاہد۔ آپ سب نے بہت اچھے تبصرے بھیجے، جیتے رہو اور خصوصی خط کی اشاعت پر ہمارے بلوچی بھائی ارباب قربان علی ایری کو ڈھیروں مبارک باد۔ زندہ کہانی میں پاکستان کا ایک بڑا نام، صادقین کے حالاتِ زندگی پڑھنے کا موقع ملا۔ جناب راجہ محمود صاحب ویلڈن۔ مینا تاج! آپ کی کہانی ہمارے لبوں پر گلاب چھوڑ گئی۔ جیتی رہو۔ فہیم انکل! آپ کو اللہ عمر خضر عطا فرمائے۔ آپ کی نظم ''حمد باری تعالیٰ نماز تہجد کے بعد ذکر و اذکار میں شامل کر لی ہے۔ دعا ہے آپ کا شفیق سایہ ہمارے اور خصوصاً سچی کہانیاں کے سر پر ہمیشہ قائم و دائم رہے، آمین۔ ''شہید کی ڈائری'' مختصر مگر زبردست، منزہ جیتی رہو۔ عائشہ کمال! آپ نے تو کمال کر دیا اور اسی طرح دکھی لوگوں کے دکھ سمیٹتی رہو۔ اگلی کہانی ہماری پیاری رائٹر سنبل کی غالباً ذاتی تحریر تھی۔ دنیا میں بہت سے رشتے ہیں جو موتیوں کی طرح ایک مالا میں پروئے ہیں لیکن جو رشتہ اولاد کا والدین سے ہے اس کا کوئی بدل نہیں۔ ''اے صبا سوئے مدینہ'' جسے میں نے سب سے پہلے پڑھا۔ بہت عقیدت و احترام کے ساتھ چشم تصور میں ہم بھی زیارت مقدسہ میں آپ کے ساتھ ساتھ رہے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ سب اہل اسلام کو وہ جگہ دکھائے، آمین۔ بہت بہت مبارک ہو بہنا اپنی امی حضور کو بھی میرا اسلام کہنا اور مبارک باد دینا۔ بہنا ایک چیز کی کمی عرصہ دراز سے کالم ''میری کہانی میری زبانی'' میں محسوس کرتا ہوں اور کسی خط میں اس سے قبل نقطہ اعتراض بھی اٹھایا کہ ''میری کہانی میری زبانی'' ایک قسم کا انٹرویو ہے۔ ساتھ تصویر کا ہونا از حد ضروری ہے۔ بلکہ فیملی پکچر شائع ہونی چاہیے اگر کوئی کرانا چاہے۔ ''خیال آرائی''، ''بے سبب اداسی'' عکاشہ اس کمپلیکس سے باہر نکلیں تو پھر کیوں؟ ارباب قربان علی ایری صاحب کاش ہم جاگ جائیں، ہوش کے ناخن لیں۔ اب بھی سب کچھ درست ہو سکتا ہے۔ ''ماں تو ماں ہے'' جس مقدس ہستی پر آپ نے قلم اٹھایا اس کا پوری کائنات میں کوئی بدل نہیں۔ سہیل خان گڈ، وفا صدام علماء دین پر اچھا لکھا۔ غصہ ایک تباہی، ممتاز احمد مخزن اخلاق

www.pdfbooksfree.pk

سے کشید کردا پیرا گراف بہت پسند آیا۔ ''کیا یہ عذاب ہے؟'' ہاں بالکل سچ ام عاول آپ نے میرے خیالات چرا لیے بے شک ہم نے مجموعی طور پر اپنی روش نہ بدلی تو اللہ معاف فرمائے۔ آخر زندگی ہے کیا یہ بھی عجب سوال ہے۔ عجب منطق عجب مخمصہ ہے۔ قلم سرائی خوب رہی۔ جیتی رہو صائمہ سحر آخر پر چلتے چلتے خیال رہے کہ کسی کی دل آزادی نہ ہو۔ نیک تمناؤں کے ساتھ نامہ بند کرتا ہوں ہر یاد کرنے والے کو سلام۔''

☆عزیز بھائی! ہماری نئی نسل بہت اچھی ہے۔ وہ باتوں پر کم اور عمل پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ یقیناً یہ آپ کی محبت ہے کہ آپ ٹائیٹل سے لے کر کہانیوں تک سب پر مفصل تبصرہ کرتے ہیں۔ چلیں آپ اپنا کام کریں اور میں اپنا یعنی کٹ کٹ..... لیکن اس سے پہلے ای آپ کو جیتے رہیے کہہ رہی ہیں۔

✉ خلیل جبار، حیدرآباد سے۔ ''محترمہ منزہ سہام صاحبہ، السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ اپریل کے شمارے میں مینا تاج کی کہانی ''چکن بریانی'' میں روانی تھی۔ بہت اچھے موضوع کا انتخاب کیا گیا۔ سلیم اختر کی کہانی ''خزاں کے بعد'' ان خواتین سے متعلق تھی جو تیزاب سے جل جاتی ہیں۔ وہ خواتین جو تیزاب سے جل جاتی ہیں ان کے لیے حوصلہ بخش کہانی ہے۔ عائشہ کمال کی کہانی ''کہی داماں'' یہ کہانی محبت کے حوالے سے عام سی لڑکی کی کہانی تھی۔ ایسے کردار ہمارے معاشرے میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ کرن محمد فاروق کی کہانی ''نفرت تھی درمیان'' دو بہنوں کے درمیان ہونے والی نفرت کے بارے میں ہے۔ اس سے سبق ملتا ہے کہ نفرت سے سوائے تباہی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ مرزا شبیر بیگ ساجد کی کہانی انسان اور فرشتہ بہت خوب صورت کہانی تھی۔ ''بھوت گھر'' عنوان اچھا تھا لیکن رائٹر کہانی کو سنبھال نہیں پایا۔ جب کہ دوسری کہانی ''کلام حق'' مختصر مگر پراثر تھی۔ اقبال زمان کی ''لہو رنگ لاتا ہے'' کراچی میں ہونے والے ایک اندوہناک واقعے پر تھی مگر یہ کہانی کم، رپورٹ زیادہ لگی۔ ارم زہرا کی ''آرزوئیں دفن ہوئیں، حسب روایت اچھی تھی۔ محترمہ رخسانہ سہام مرزا کے قلم سے تخلیق کیا گیا سفرنامہ ''اے صبا سوئے مدینہ'' سادہ الفاظ میں روح کی گہرائیوں میں اتر جانے والی تحریر تھی۔ خاص کر وہ جملہ..... ''وقت نے کیا رک کر سوچا ہے کہ کون کیا چاہتا ہے؟ اس کو تو گزرنا ہے سو بچپن گیا، جوانی گئی اور زندگی کی لمبی کہانی گئی..... اور اب میں وہاں کھڑی ہوں جہاں آرزو پہاڑ سر کرنے کی تمنا تو ہوتی ہے مگر توانائی دم توڑ رہی ہوتی ہے..... مجھے اچھی طرح یاد ہے میں جب کالج میں پڑھتا تھا اس وقت دوشیزہ رائٹرز کی تقریب میں کبھی صدیق سالک اور کبھی دوست محمد فیضی مہمان ہوا کرتے تھے اور محترمہ رخسانہ صاحبہ کھڑی ہوتی تھیں۔ آج میں خود کالج میں پڑھا رہا ہوں اور محترمہ رخسانہ صاحبہ کی جگہ ان کی بیٹی منزہ نے لے لی ہے سو واقعی دنیا میں ہر چیز عارضی ہے۔ میری محترمہ رخسانہ سہام سے یہی گزارش ہے کہ وہ مستقل سچی کہانیاں کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتی رہیں۔ اس طرح جذبے جواں رہتے ہیں۔ انور فرہاد کا ''زندگی لکھ رہا ہوں'' کا دوسرا حصہ بھی زبردست رہا جس سے ان کی بھرپور زندگی کے گوشوں کے بارے میں پتا چلا۔ سلیم فاروقی کے ناول کی پہلی قسط جاندار رہی۔ امید ہے کہ آگے چل کر اس میں مزید سنسنی خیزی پیدا ہوگی۔ سلیم فاروقی کی کہانیاں لوگ پڑھنا چاہتے ہیں۔ ان کے ناول کی قسط کم از کم 35 سے 40 صفحات پر مشتمل ہونی چاہیے تاکہ پڑھنے والے دلچسپی سے اگلی قسط کا انتظار کریں۔ صادقین کے بارے میں مضمون بہت دلچسپ اور پراثر تھا۔ ایک عدد سوبائل کہانی ''خوش نصیب'' بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ پسند آئے گی۔''

☆خلیل بھائی! بڑی کوشش کی کہ کچھ لائنیں ہی کاٹ دوں مگر آپ بھی بڑے ذہین ہیں۔ باوجود کوشش کے میں ناکام ہی رہی۔ سلیم فاروقی صاحب کی کہانی کے صفحات بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اپنی قیمتی آرا سے ہمیں نوازتے رہیے گا۔

✉ کرن محمد فاروق، حیدرآباد سے۔ ''میں نے اپنی دوسری کوشش ایک کہانی کی صورت اور ''خیال آرائی'' ارسال کی تھی، اگر وہ ناقابل اشاعت ہے تو پلیز بتا دیجیے اور اگر اشاعت ہو چکی ہے، تو پلیز یہ خوشی بھی سنا دیجیے کیونکہ میں نے دسمبر اور جنوری کا سچی کہانیاں نہیں پڑھا ہے۔ مارچ کا سچی کہانیاں بھی آج حاصل کر پائی ہوں۔ سو پلیز مہربانی فرما کر میرا خط ضرور شامل کر کے جواب دیجیے گا ممنون رہوں گی۔ میں اس خط کے ساتھ بھی ایک تحریر بھیج رہی ہوں۔ اپنی اس تحریر کو بھیجتے ہوئے، میں بہت کنفیوژ اور ڈری ہوئی ہوں۔ آپ کی اصلاح کی طلب گار رہوں گی۔ خط کا اختتام دعائے خیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہم سب کی جائز حاجات اور خواہشات اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں۔''

www.pdfbooksfree.pk

☆ کرن! میں نے تمہارے خط کا پورا پہلا پیراگراف حذف کر دیا ہے۔ اس قدر سوری کہنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی، خط لکھنے میں تو دیر سویر ہو ہی جایا کرتی ہے۔ تمہارے استاد کے انتقال کے بارے میں پڑھا، دکھ ہوا۔ اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور بھئی تمہاری دوسری کہانی تو شمارہ اپریل میں شائع ہو چکی، تمہیں شمارہ نہیں ملا؟ یہ بتاؤ حیدر آباد کی شامیں کیسی ہیں۔ مجھے بہت پسند ہیں اور یاد آتی ہیں۔

✉ محمد رضوان قیوم، راولپنڈی سے۔ ''دیگر احوال یہ ہے کہ آپ کی خدمت میں ایک مزید دلچسپ، منفرد پلاٹ پر مشتمل کہانی ''جرم کسی کا سزا کسی کو'' یا اس کا عنوان ''کرب پیہم'' بھی رکھا جا سکتا ہے، روانہ کر رہا ہوں۔ دراصل یہ کہانی مجھے ایک بزرگ عورت نے سنائی تھی۔ مجھے امید ہے کہ یہ کہانی قارئین کے لیے ایک تحفہ ثابت ہو گی۔ (اس کہانی میں جہاں آپ بہتر سمجھیں قلم چلا لیجئے گا) آپ کے پاس میری دو کہانیاں پہلے ہی موجود ہیں اور ہاں! ابھی تک گزشتہ کہانی کا انعام نہیں ملا۔ اب میں بات کرتا ہوں شمارہ اپریل کی۔ سچی بات ہے سرورق اتنا خاص نہیں تھا۔ جب کہ کہانیوں میں ''خزاں کے بعد'' محمد سلیم اختر کی اچھی، نئے پلاٹ کی حامل کہانی تھی۔ جب کہ ''تہی دامن'' عائشہ کمال کی تحریر بھی ادبی معیار کے گراف کو چھو رہی تھی۔ جب کہ عارف حسین روہیلا کی کہانی ''سونے کی بالیاں'' کا انداز تحریر قابل ستائش ہے۔ مینا تاج کی کہانی ''چکن بریانی'' مجھے ہر لحاظ سے پسند آئی۔ خاص طور پر اس میں جو موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے وہ بڑا اچھوتا اور ادبی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔''

☆ بھیا رضوان قیوم! ناصر بھائی سے کہہ دیا ہے کہ رائٹرز کو بذریعہ خط ان کی کہانیوں کی اشاعت کے بارے میں ضرور بتایا کریں۔ ویسے زیر نظر شمارے میں آپ کی کہانی موجود ہے۔ ٹائیٹل آپ کو اچھا نہیں لگا اس بارے میں متعلقہ شعبے سے کہہ دیا گیا ہے کہ توجہ دے۔ جلد ڈاکیا انعامی رقم کے ساتھ آپ کے دروازے پر ہو گا، انشاء اللہ۔

✉ جاوید عثمان زندانی، کراچی سے۔ ''محترمہ منزہ سہام صاحبہ، گلہائے عقیدت! سدا زیست کے پھول چنیں۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ اپریل کا شمارہ شہر کے حالات کی وجہ سے کچھ تاخیر سے ملا۔ ٹائیٹل بس واجبی سا تھا۔ حسب عادت سب سے پہلے اداریہ پڑھا۔ اداریے نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ''شہید کی ڈائری'' واقعی دلگداز تھی۔ بہت اچھا سلسلہ ہے۔ جتنی کہانیاں اب تک پڑھ چکا ہوں بھرپور اور پرتاثیر تھیں۔ خاص طور پر سنبل صاحبہ کی ''محبت کا چہرہ'' مینا تاج کی ''چکن بریانی'' کرن محمد فاروق کی ''نفرت کی دو سیان'' محمد سلیم اختر کی ''خزاں کے بعد'' اور راجہ محمود کی تو ہر تحریر ہماری معلومات میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ میں یہاں بطور خاص مرزا شبیر بیگ ساجد کی کہانی کا ذکر کروں گا۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ دل موہ لیا مرزا شبیر بیگ ساجد کا نام آپ کے ڈائجسٹ میں دیکھ کر کافی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ منزہ صاحبہ میں آپ کا اور ناصر بھائی کا بھی شکر گزار رہوں گا اگر میرا سلام ان تک پہنچ جائے۔ سفر کہانی میں ''اے صبا سوئے مدینہ'' رخسانہ سہام مرزا صاحبہ کی تحریر دل میں اتر گئی۔ دوسرے حصے کا انتظار رہے گا۔ اللہ ہمیں بھی اس مقدس مقام کی زیارت کروائے۔ سلیم فاروقی کی ''آتش جنوں'' کے پہلے حصے ہی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ''ناشون'' اور ''جن آنکھوں میں خواب بسے تھے'' بہت اچھی جا رہی ہیں۔ منظومات بہت کم ہوتی ہیں۔ تشنگی رہ جاتی ہے کچھ تو بڑھائی جائیں کہ شاعری کے شوقین بھی سچی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اب اجازت دیجئے ناصر صاحب نے کہانی بھیجنے کا حکم دیا ہے۔ انشاء اللہ اب کہانی کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ میری طرف سے تمام قارئین، اسٹاف اور آپ کو پرخلوص سلام۔''

☆ جاوید بھائی! کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ کا سلام مرزا شبیر بیگ صاحب تک پہنچا دیا جائے گا اور ہاں کہانیاں ضرور ارسال کرتے رہیے۔

✉ سدرہ انور علی، جھنگ صدر سے۔ ''قابل احترام آنٹی جان منزہ السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ بالکل خیریت سے ہوں گی۔ انکل ناصر کی بیماری کا پڑھا، بہت دکھ ہوا۔ ان کو خصوصی سلام اور دعائیں۔ آپ کا ''احوال'' میں آنا بھی ہمیں اچھا لگا اور بہت خوشی ہو رہی ہے، آپ سے بات کر کے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور سب قارئین کو زندگی کی سچی خوشیاں عطا فرمائے، آمین۔ اپریل کا شمارہ ملا۔ ٹائیٹل گرل تو گزارے لائق ہی ہے۔ آپ کا اداریہ ''محسن'' پسند آیا۔ ''احوال'' میں تمام بہنوں بھائیوں کے خطوط اور آپ کے جوابات پسند آئے۔ زندہ کہانی میں ''یادوں کے رنگ'' پڑھی، بہت پسند آئی۔

www.pdfbooksfree.pk

ویلڈن رابعہ محمود۔ خصوصی کہانیاں میں محمد سلیم اختر کی "خزاں کے بعد" ایک ایسی کہانی ہے کہ انسان اس سے بہت سے سبق سیکھ سکتا ہے، اگر چاہے تو!! مینا تاج کی "چکن بریانی" اگر انسان اپنے اندر ہمت پیدا کرے تو وہ تقدیر بدل سکتا ہے۔ جس کی ایک مثال سب کے سامنے ہے۔ شہید کی کہانی میں "شہید کی ڈائری" شہادت ساری دنیا کا مالک اور حکمران بننے سے زیادہ افضل ہے اور ہمارے شہداء کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ عائشہ کمال کی تحریر "تہی داماں" محبت کچھ کھونے کا نام ہی تو ہے۔ سنبل کی "محبت کا چہرہ" پڑھی جو دل کو دکھی کر گئی۔ ہمیشہ کے لیے تو کوئی بھی اس دنیا میں نہیں رہا۔ عارف ردھیلا کی تحریر سونے کی بالیاں پڑھی۔ معصوم بچیوں پر ظلم کرنے والے خود سکون سے رہ سکیں یہ ہو نہیں سکتا۔ کرن محمد فاروق کی "نفرت کی درمیاں" وہ ایک مشہور محاورہ ہے نہ کہ کپڑا پھٹے ہاتھوں، دل پھٹے باتوں، اک ذرا سی غلط فہمی اور بدگمانی گھر اجاڑ دیتی ہے۔ ام عادل کی "دکھوں کے مارے" اور حنیف سحر کی "گردش رنگ چمن" پسند آئیں۔ مرزا شبیر بیگ کی "انسان نما فرشتہ" اچھی لگی۔ آج کے جوان اس سے سبق سیکھ سکتے ہیں۔ موبائل کہانیاں خلیل جبار کی ماضی میرے سامنے، اگر اس کہانی سے بھی کوئی سبق نہ لے تو یہ اس کی مرضی کی بات ہے۔ پراسرار کہانیاں ٹھیک تھیں۔ میرے شہر کی کہانی میں ارم زہرا "آرزوئیں دفن ہوئیں" دولت کی خاطر قتل کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اقبال زمان کی "لہو رنگ لاتا ہے" اجتماعی قتل کی اس واردات نے لہو گرما دیا۔ سفر کہانی میں آنٹی رخسانہ سہام مرزا کی "اے صبا، سوئے مدینہ" پڑھی، بہت پسند آئی۔ مسجد نبویؐ اور دوسرے مقامات کی بھی زیارت ہوئی بہت خوشی ہوئی۔ "لکھ رہا ہوں زندگی میں" انور فرہاد نے دوسری قسط میں بھی زیادہ تر فلموں کا ذکر کیا۔ آخری قسط میں خدا خیر کرے۔ "تاشون" میں دلچسپی حد سے سوا ہوتی جا رہی ہے۔ ویلڈن شازلی سعید۔ انکل سلیم فاروقی کی "آتش جنوں" پہلی قسط تو پسند آئی۔ "جن آنکھوں میں خواب بسے تھے" کی تو کیا ہی بات ہے۔ شاعری میں انکل محمد فہیم کی حمد باری تعالیٰ اور رضوانہ کوثر کی "جھوٹے رشتے" پسند آئی۔ خیال آرائی میں "بے سبب اداسی" اگر عکاشہ سسٹر سب کے ساتھ اپنا دکھ شیئر کریں تو شاید ہم ان کا دکھ بانٹ سکیں۔ رمزی آثم کی کتاب "کوئی تو خواب ہو" پر عکاشہ کا تبصرہ لاجواب ہے۔ "پسند اپنی اپنی" میں روبینہ شاہین کا شعر پسند آیا۔ "بازگشت" میں انکل سہام "مقدر کا رونا کب تک؟" جب تک ہر انسان اپنے آپ کو درست نہ کرے تب تک۔ آنٹی جی انکل ناصر سے پوچھ کر بتائیے کہ میری کوئی کہانی کب تک منظر عام پر آئے گی۔ مزید انتظار نہیں ہوتا۔ سب پڑھنے والوں کو ڈھیروں سلام۔ پاکستان کو ہم نے اللہ کے سپرد کیا۔ اللہ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ حاضری ہوگی۔ تب تک اللہ نگہبان۔"

☆ سویٹ سی سدرا! بڑا سپید ھا سچا سا خط لکھا۔ تحریریں پسند کرنے کا شکریہ۔ ناصر بھائی سے کہانیوں کے سلسلے میں خط کے ذریعے اطلاع دینے کی بات کی ہے، جیسے ہی یہ سلسلہ شروع ہوگا تو پھر تم سب کی شکایت دور ہو جائے گی۔

✉ صفیہ سلطانہ، جیکب آباد سے۔ "السلام علیکم! اللہ کرے کہ آپ خیریت سے ہوں اور سنائیے کیسے مزاج ہیں۔ یہ جبری خط ہے..... ارے..... ارے..... آپ غلط سمجھے کیونکہ تین ماہ کے بعد میں نے 28 کو مارچ کا شمارہ ملتے ہی، دن شمار کیے بنا بہت مفصل اور بھرپور تبصرے کے ساتھ۔ شعروں کا تڑکا لگا کے خط لکھا تھا، مگر جب آپ سے فون پر بات ہوئی تو پتہ چلا کہ خط آپ کو نہیں ملا۔ وہ خط اس لیے بھی بے حد اہم تھا کہ اس کے ہمراہ محمد فہیم صاحب کی شاعری پر میں نے بہ نظر غائر تبصرہ لکھا تھا اور اس کی عکسی نقل بھی اپنے پاس نہیں رکھی، جس کا قلق ہے۔ اللہ کرے کہ وہ خط آپ کو مل جائے۔" "وہ درخشاں ستارہ" کے نام سے ارفع کریم کے حالات زندگی (مختصر ترین حالات زندگی) پڑھ کر بہت اچھا بھی لگا اور دکھ بھی ہوا۔

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے پہلے جانیں دیں
یہ بچے ہیں انہیں جلد سو جانے کی عادت ہے

اور اس ننھی گڑیا کی شاعری نے بھی بے حد متاثر کیا۔ اللہ کے حکم کے آگے ہماری کیا مجال ہے۔ فیضان عثمانی کی "یقین کامل" بہت اچھی لگی، ویلڈن بھیا۔ صدف آصف کی کہانی "اے جذبہ دل" پاکستان سے محبت پر بہت دلگداز داستان تھی جس نے بے حد متاثر کیا۔ احمر منصور کی کہانی بھی ایک نیا رنگ سمیٹے ہوئے تھی۔

دیگر کہانیاں بھی بے حد اچھی تھیں۔ ان پر تبصرہ چونکہ کر دیا تھا پرچہ اس وقت سامنے نہیں ہے۔ تو ایسا لگ رہا ہے جیسے رات کے باسی چاولوں پر تڑکا لگانا.....!! اب انشاء اللہ اگلے ماہ زندگی بخیر، خط لکھوں گی اور اللہ کرے کہ وہ مل بھی جائے۔"

www.pdfbooksfree.pk

☆ صفیہ جی! آپ کا مفصل خط لگتا ہے ڈاک خانے والوں نے رکھ لیا۔ آپ لکھتی ہی اتنا اچھا ہیں۔ اب ان کا کیا قصور چلیں آئندہ آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

✉ بشیر احمد بھٹی، بہاولپور سے۔ ''مارچ 2012ء سچی کہانیاں کی کہانیوں پر تبصرے سے قبل ایک چھوٹی سی شکایت ملاحظہ فرمائیں۔ دسمبر 2011ء میں ''احوال'' میں خط اور خط کے ہمراہ کہانی ''اللہ کی عدالت'' آپ کو ارسال کی۔ جنوری 2012ء کے شمارے میں آپ نے لیٹ پہنچنے والے خطوط میں میرا نام شائع کیا۔ میرا خیال ہے بچ جانے والے خطوط کو آپ کھولتے نہیں۔ اوپر سے نام دیکھ کر شائع کر دیتے ہیں۔ کہانی اپنے نمبر کی منتظر ہے یا ردی کی ٹوکری ہضم کر گئی؟ اس بارے میں ضرور مطلع کریں تاکہ میں مزید کہانیاں ارسال کر سکوں۔ اب آیئے مارچ کے سچی کہانیاں کی جانب۔ معصوم ارفع کریم کی تصویر ''حسرت ان غنچوں پر'' ٹائٹل پر موجود ہے۔ وہ درخشاں ستارہ عنوان سے معصوم ارفع کریم کا ''احوال'' نامہ شائع کر کے آپ نے (ادب) کا حق ادا کر دیا۔ ارفع کریم کی وفات بہت بڑا سانحہ ہے۔ میرا بیٹا محمد احسان اللہ عمر بیس برس۔ ایس ای کالج کا اسٹوڈنٹ تھا۔ 4 ستمبر 2010ء رمضان شریف کا چوبیسواں روزہ رات بارہ بجے ڈکٹوریہ اسپتال سی سی یو میں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ یہ ایسا صدمہ تھا جو میں نہیں بھلا سکا۔ سوچتا ہوں۔ اولاد کا دکھ بھی کیا دکھ ہوتا ہے۔ اللہ پاک ارفع کریم مرحومہ کو میرے بیٹے محمد احسان اللہ کو اور ان جیسے تمام ان پھولوں کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ جنت الفردوس عطا کرے۔ والدین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ ارفع کریم کے والدین سے استدعا کرتا ہوں کہ مرحومہ کی لحد پہ زیادہ سے زیادہ قرآن کریم کی تلاوت کریں۔ اس عمل سے بھی دل کو سکون ملتا ہے۔ میرا بھی جب دل گھبراتا ہے۔ بیٹا شدت سے یاد آتا ہے تو دعاؤں کی کتابیں لے کر بیٹے کی لحد پر چلا جاتا ہوں اور پڑھتا رہتا ہوں۔ قرآن کریم کی تلاوت اور دعاؤں سے رحمت کے فرشتے مرحومین کی قبروں پر رحمت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ بلاشک ہم مدفن مرحومین کو نہیں دیکھ سکتے مگر وہ ہمیں اللہ کی قدرت و کرم سے دیکھ لیتے ہیں۔ ارفع کریم تو جنت کا گلاب تھی۔ انشاء اللہ جنت الفردوس میں خوش و خرم ہو گی۔ اللہ میرے بیٹے محمد احسان اللہ کو بھی جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین ثم آمین۔ ''زرد پتوں کا بن'' اور ''جنون محبت'' دونوں کہانیاں اچھی کاوش ہیں۔ مختصر کہانیوں میں شہید کی ڈائری، جی علی الفلاح، وہ اجنبی ساتھی، جگ بیتی، میں دیار سنگ نے متاثر کیا۔ سلسلے وار کہانی ''تاشون'' دلچسپ رہی مگر صفحات ذرا کم ہیں۔ پراسرار کہانیوں میں وہ ''عجیب فینچی'' دو صفحے کی کہانی سبق آموز ہے۔ واقعی راستے میں پڑی ہوئی کسی بھی چیز کو اٹھانا اچھی بات نہیں مگر ہمارے ہاں تو معاملہ ہی الٹ ہے۔ ''گھائل آتما'' اپنے اختتام کو پہنچی۔ ابھی مزید کہانیوں کا مطالعہ جاری ہے۔ اس شمارے میں کوپن وغیرہ کا صفحہ غائب ہے۔ کیا یہ سلسلہ بند کر دیا گیا ہے؟ یا یہ صرف کچھ عرصہ کے لیے ہے۔ کوپن کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اس طرح قارئین کو خطوط جلدی بھیجنے کا شغف رہتا ہے۔''

☆ بھیا شبیر! بیٹے احسان کے بارے میں جان کر بہت دکھ ہوا۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جو آپ کے دکھ کو کچھ لمحوں کے لیے ہی کم کر سکیں۔ شاید اولاد کو اسی لیے آزمائش کہا گیا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تمام والدین کو اس دکھ سے محفوظ رکھے جس نے بھائی بشیر کے دل میں گھر کر لیا ہے، آمین۔ کہانیاں آپ کو اچھی لگیں، شکریہ یقین کیجیے خطوط ہمیشہ سے میں ہی کھولتی ہوں لہٰذا بنا پڑھے ضائع کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کی کہانی ہمارے پاس ہے، بہت جلد شائع ہو گی۔ امید ہے کہ آپ کی شکایت دور ہو گئی ہو گی۔

✉ اے آر رضوی، راولپنڈی سے۔ ''السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کے ادارے سے پرانا تعلق ہے تاہم آپ کو پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ میرا نام اے آر رضوی ہے اور سن اسی کی دہائی میں اسی نام سے ماہنامہ دوشیزہ میں لکھتا رہا ہوں۔ سہام مرزا حیات تھے اور رعنا فاروقی دوشیزہ کی ایڈیٹر تھیں۔ میں اس دور میں کراچی میں تھا۔ لہٰذا کئی بار ملاقات بھی ہوئی اور دو دفعہ دوشیزہ ایوارڈ کی تقریب میں شرکت بھی کی، معروف رائٹرز سے ملاقات بھی رہی۔ پھر گردش ایام اور زندگی کی مصروفیات کہ رابطہ نہ رہا۔ اب ایک طویل عرصے بعد ماہنامہ سچی کہانیاں دیکھا تو آپ کی محنت کو داد دینے اور ایک دفعہ پھر آپ کی محفل میں آنے کو دل چاہا چنانچہ آپ کی خدمت میں موبائل کہانی ''قاتل موبائل'' لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اسے کسی قریبی اشاعت میں لگا دیجیے گا۔ امید ہے کہ اس سچی تحریر کو قارئین پسند فرمائیں گے۔ آپ نے حوصلہ

www.pdfbooksfree.pk

افزائی فرمائی تو آپ سے رابطہ اور قارئین سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ محترمہ رخسانہ سہام مرزا کو میرا اسلام دیجئے گا۔ بہت سی نیک دعاؤں اور بہترین خواہشات کے ساتھ اجازت چاہوں گا، اللہ حافظ۔"

☆ رضوی صاحب! آپ "احوال" میں تشریف لائے، بہت اچھا لگا۔ کہانی ناصر صاحب کی ٹیبل پر پہنچا دی گئی ہے۔ امید ہے کہ اب آپ کچھ نہ کچھ وقت نکال کر ضرور تشریف لاتے رہیں گے۔

✉ مور شاہد وفا، کراچی سے لکھتے ہیں۔ "السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بالکل ٹھیک اور صحت یاب ہوں گے۔ اللہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ خطوط کی محفل میں اب کچھ زیادہ ہی رونق تھی۔ آنٹی منزہ سہام نے خطوط کے جوابات دے کر محفل کو شاندار کر دیا۔ آنٹی منزہ سہام نے محسن کے عنوان سے بہت اچھا لکھا۔ اُن ہی کے قلم سے "شہید کی ڈائری" پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ کچھ دن پہلے ہم نے بھی کچھ پودے اور بہت اقسام کے پھول لگائے ہیں۔ عارف سین روہیلا کے قلم سے "سونے کی بالیاں" پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ ام عادل کے قلم سے 'دکھوں کے مارے" پڑھ کر بہت دکھ ہوا اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ خلیل جبار کے قلم سے "ماضی میرے سامنے" دل دہلانے والی کہانی تھی جیسی کرنی ویسی بھرنی انجان کے قلم سے "بھوت گھر" بہت دکھی کہانی تھی۔ عمرانہ رمضان کے قلم سے "کلام حق" پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سبحان اللہ واقعی قرآن مجید بھٹکے ہوؤں کو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ اقبال زمان کے قلم سے "لہو رنگ لاتا ہے" پڑھ کر اس سنگین حادثے پر آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔ سفر کہانی ای رخسانہ سہام مرزا کے قلم سے "اے صبا سوئے مدینہ" بہت دلچسپ تھی۔ ای اللہ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے، آمین۔ انکل سلیم فاروقی کے قلم سے "آتش جنوں" کی پہلی قسط حد سے زیادہ دلچسپ تھی۔ کچھ مصروفیات کے باعث شمارہ اتنا ہی پڑھا ہے۔ اللہ تمام اہلِ وطن کو دشمنوں کی بری نظر سے بچائے، آمین۔ اور اب اس شاعری کے ساتھ اجازت

سنو اے جاناں
تمہیں بھول جاؤں یہ ممکن نہیں
جیسے دریاؤں کا الٹا بہنا ممکن نہیں
یہ ٹوٹا ہوا دل تمہیں یاد کرتا ہے
ہر گھڑی ہر پل تمہیں یاد کرتا ہے

☆ بھائی مور شاہد وفا! آپ کی شاعری "احوال" میں شائع کر دی۔ اب تو خوش ہیں۔ میرے پاس اتنی ہی گنجائش تھی کہانیاں آپ کو اچھی لگیں شکریہ۔ سلیم فاروقی صاحب تو پھولے نہیں سما رہے ہیں۔ بھئی آخر سچی کہانیاں کے ایڈیٹر تھے..... آپ سب کے درمیان رہنا انہیں بھی اچھا لگتا ہے۔

✉ محمد راشد مغل، سکھر سے۔ "میرا تعلق سکھر سے ہے اور میں درس و تدریس سے وابستہ ہوں۔ آپ کا ڈائجسٹ ماہنامہ سچی کہانیاں میں ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں، میں شاعر بھی ہوں۔ شعر، شاعری سے بہت پرانا رشتہ ہے۔ نثر پر مجھے کمانڈ نہیں ہے۔ اگر میں کوشش کروں تو نثر لکھ سکتا ہوں۔ خیر آپ کے ڈائجسٹ میں شاعری کے لیے جگہ نہیں ہے جس طرح دیگر ڈائجسٹ میں شاعری کے لیے مخصوص جگہ ہوتی ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو اپنی کچھ غزلیں ارسال کروں اگر آپ کو اور آپ کے ادارے کو پسند آئیں تو ضرور سچی کہانیاں میں شامل کریں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ میری دعا ہے کہ آپ کا ادارہ اور زیادہ ترقی کرے۔"

☆ بھیا ارشد مغل! شاعری ضرور ارسال کریں اور اس کے ہمراہ تصویر بھی بھیجیں اگر آپ کی شاعری معیاری ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

✉ ثمر احمد، کراچی سے۔ "1-12-2012 کو ایک تحریر ارسال کی تھی جواب تک شائع نہیں ہوئی۔ نہ ہی میری غزل شائع ہوئی ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ کیا وہ تحریر..... غزل معیاری نہیں؟؟ سچی کہانیاں میں اپنی تحریر پڑھ کر اچھا لگتا ہے شکریہ آپ کا۔ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا خدا آپ کو صدا خوش رکھے، آمین۔ اپنی غزل اور مضمون ارسال کر رہی ہوں۔ معیاری ہوں تو ضرور جگہ دیجئے گا انتظار رہے گا۔ شکریہ کے ساتھ اجازت دیں۔"

www.pdfbooksfree.pk

☆ثمر! اتنا مختصر خط کہ قینچی چلانے کی کوئی گنجائش ہی نہیں اور بھئی تمہاری تحریریں تو اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں، جو چیز شائع نہ ہو تو سمجھ جاؤ تم نے پوری محنت نہیں کی۔ رسالے میں کچھ تبدیلیاں لائی جارہی ہیں، ان کے بارے میں ضرور لکھنا۔

✉ام عادل، کراچی سے۔ ''محترمہ منزہ سہام السلام علیکم! کیسے کیسے مزاج ہیں، امید ہے بخیر ہوں گے۔ آپ کی ''نو اے امروز'' تو ہر ماہ ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں جو وسعت میں کم مگر وزن میں زیادہ ہونے کی وجہ سے آنکھوں کے راستے دل میں اتر جاتی ہے۔ رسالے میں آپ کا طرز تخاطب دیکھ کر دل خوش ہوا اور اب آپ سے مخاطب ہونا بھی دلی مسرت دے رہا ہے۔ آپ کی آمد ایک معطر جھونکے جیسی لگی مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کے علاوہ بھی آپ کی بہت ساری ذمہ داریاں ہیں جن کی وجہ سے ''احوال'' کی ذمہ داری آپ پر ایک اضافی بوجھ ہے۔ منزہ صاحبہ میں آپ کے روزنامہ ''فلک نائمز'' کے حوالے سے کچھ وضاحت چاہتی ہوں پلیز رہنمائی کیجیے۔ آپ کی کاوش ''فلک نائمز'' کی صورت کب تک منظر عام پر آرہی ہے؟ میں اس روزنامے میں کالم نگاری کرنا چاہتی ہوں۔ اس کا کیا طریقہ کار ہوگا۔ محترمہ فاطمہ ثریا بجیا صاحبہ ہماری بزرگ، صاحب علم اور کہنہ مشق رائٹر ہیں۔ آپ کے اور ان کے اشتراک سے یقیناً ایک بہترین اور مکمل روزنامہ ہمیں پڑھنے کو ملے گا۔ فلک نائمز کے اشتہار کے ساتھ ہی آپ کی آواز ''محسن'' پڑھی۔ سو فیصد سچ کہا آپ نے وہ قومیں ہمیشہ تنزلی کا شکار ہی ہوتی ہیں جو اپنے محسنوں کے احسانات فراموش کر کے ان سے بدسلوکی کے جرم کی مرتکب ہوتی ہیں۔ کہانیوں کی فہرست میں اپنی کہانی دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اس کی خبر پہلے ہی محترم ناصر رضا بھیا فون پر دے چکے تھے۔ کہانی کے علاوہ میری خیال آرائی نے بھی رسالے میں جگہ پائی، اتنی جگہ دینے اور میری تحاریر کو پذیرائی دینے پر تہہ دل سے شکریہ قبول کیجیے۔ آپ نے میرے پسندیدہ ترین رائٹر جناب سلیم فاروقی صاحب کی سلسلہ وار سرگزشت ''آتش جنوں'' لگا کر نہ صرف مجھے بلکہ ان کے تمام چاہنے والوں کو بہت بڑا سرپرائز دیا ہے۔ شاید اس کے لیے شکریے کا لفظ چھوٹا ہے۔ منزہ صاحبہ یقین مانیے میری اپنی کہانی لگنے کی خوشی سلیم فاروقی کی تحریر کے سامنے ماند پڑ گئی ہے۔ اب تو ہر ماہ رسالے کا انتظار اور زیادہ شدت سے رہے گا۔ منزہ صاحبہ میرے بیٹے کی صحت اکثر خراب رہتی ہے اس کی بحالی صحت کی دعا کیجیے گا۔ وہ میری واحد اولاد ہے۔ اس کی ناسازی طبیعت کی وجہ سے دل ہمہ وقت پریشان رہتا ہے۔ اسی کے ساتھ اجازت دیجیے خدا ہم سب کا حامی وناصر ہو، آمین اللہ نگہبان۔''

☆ڈیئر ام عادل! سب سے پہلے تو بیٹے کی صحت یابی کے لیے نیک تمنائیں اور بے شمار دعائیں۔ ایک ماں ہی یہ بات جان سکتی ہے کہ اولاد کی محبت کیا معنی رکھتی ہے۔ اللہ پر مکمل بھروسہ رکھو بے شک وہ نہایت مہربان ہے۔ سلیم فاروقی صاحب تک تمہاری تعریف پہنچادی۔ وہ شکریہ کہہ رہے ہیں۔ دفتر جب آنا چاہو آجاؤ میں آفس ہی میں ہوتی ہوں۔ فلک نائمز پابندی سے شائع ہو رہا ہے ابھی کیونکہ ابتدائی مراحل میں ہے اس لیے کچھ دشواریاں ہیں۔ تم ہمیں بھی دعاؤں میں یاد رکھا کرو۔

✉ارشد بخاری لکھتے ہیں۔ ''شاید آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے فروری 2012ء کے شمارے میں میرے کچھ احساسات شائع کر کے وعدہ کیا تھا کہ میری تحریر کردہ سچی داستان ''انسان اور شیطان'' جو ملک دشمنوں کی سازشوں کو بے نقاب کرتی ہے، مارچ 2012ء کے شمارے میں شائع کر دی جائے گی مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ کہانی مارچ اور اپریل کے شماروں میں شائع نہ ہوئی شاید آپ حکومتِ وقت کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور وعدہ خلافی کی روش اختیار کر رہے ہیں۔ میں نے ساری عمر صحافت، وکالت اور سیاست بیانی سے گزاری ہے اور عمر کے اس حصے میں بھی میرے لاتعداد تجربات، مشاہدات، واقعات شائع ہو چکے ہیں۔ جس کی فہرست آپ دیکھ چکے ہیں۔ اگرچہ آپ کی طرف سے پذیرائی کی بجائے مایوسی ملی ہے لیکن پھر بھی میری دعا ہے کہ سچی کہانیاں ڈائجسٹ قوم اور معاشرے کا صحیح ترجمان بنے اور کامیاب رہے۔''

☆ارشد بھائی! آپ کی کہانی کی اشاعت میں دیر صرف ناصر بھائی کی ناسازی طبع ہے اور کچھ بھی نہیں مگر آپ کا یہ جملہ سہا گیا کہ ''آپ حکومت وقت کے نقش قدم پر چل رہے ہیں'' یقین کیجیے ایسا بالکل نہیں ہے۔ برے سے برے انسان بھی حکومت کے نقش قدم پر نہیں چل سکتا ہماری بھی اتنی مجال کہاں۔ بہرحال غصہ چھوڑیے اور ''احوال'' میں آتے رہیے،

www.pdfbooksfree.pk

انتظار رہے گا۔

☒ حافظہ مون شاہ، سرگودھا سے۔ ''احوال'' میں اپنا خط دیکھ کر اور نظم پڑھ کر خوشی ہوئی اور یہ خوشی اس وقت مزید بڑھ گئی جب اپنی کہانی کو انعام یافتہ لسٹ میں پایا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ اور ان احوالیوں کا بھی شکریہ جنہوں نے میری کہانی کو پسند کیا لیکن آپ نے میری سلسلہ وار کہانی کے بارے میں نہیں بتایا وہ کب شائع ہوگی؟ ''سچی کہانیاں'' تو ہر بار شاندار ہی ہوتا ہے اور اس میں شائع ہونے والی ہر کہانی شاندار ہی نہیں لاجواب ہوتی ہے۔ ماہ اپریل کا شمارہ بہت پیارا اور اس پر موجود ماڈل نہایت خوب صورت تھی۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح بہترین اور اپنے اندر ایک گہرائی لیے ہوئے تھا۔ ''احوال'' میں ان کے شگفتہ شگفتہ جوابات دل کو بھائے۔ رخسانہ سہام صاحبہ کی سفر کہانی ''اے صباء سوئے مدینہ'' بہت شاندار رہی، دل کو تڑپا گئی۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اپنا اور اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا در دکھائے، آمین۔ راجہ محمود صاحب کے قلم سے زندہ کہانی سید صادقین نقوی ''یادوں کے رنگ'' بہت اچھی لگی۔ کہانیوں میں سونے کی بالیاں، چکن بریانی، محبت کا چہرہ بہت بھائیں۔ ''گردش رنگ چمن'' اور ''آتش جنوں'' بھی اچھے سلسلے ہیں جب کہ اس وقت میری پسندیدہ کہانی ''جن آنکھوں میں خواب بسے تھے'' ہے۔ ''خیال آرائی'' میں وفا صدام حسین غازی اور ممتاز احمد کی خیال آرائی بہت پسند آئیں۔ راجہ محمود صاحب سے فرمائش ہے کہ وہ اداکار شان اور اداکارہ ریما کے بارے میں بھی لکھیں اور اگر مناسب سمجھیں تو کبھی کبھار کسی عالم دین کے حالات زندگی پر بھی تفصیلی مضمون لکھا کریں۔ اللہ کرے ہو زور قلم اور زور کرم اور اور زیادہ پھر، آمین۔''

☆ حافظہ مون! ناراض مت ہو جانا، تمہارے خط سے بس کچھ لائنیں حذف کر دی ہیں۔ تمہاری رائے اچھی لگی۔ اس لیے نور ارا جہ صاحب تک پہنچا دی ہے۔ ای کی تحریر اچھی لگی وہ شکریہ کہہ رہی ہیں۔ امید ہے محفل میں آتی رہو گی۔

☒ وفا صدام حسین غازی تیو، حیدر آباد سے۔ ''السلام علیکم! پیاری بہن منزہ سہام باجی آپ کو ''احوال'' میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ کا ''احوال'' میں آنا ہمیں اچھا لگا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ باجی! کچھ دن پہلے میرا تبلیغ پر تین دن کے لیے جانا ہوا۔ یقین جانیے بڑا دلی سکون ملا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کام والا گروہ، اپنے نبی کے طریقوں پر چلنے والا گروہ ہر سنت کو زندہ کرنے والا گروہ۔ جس میں سندھی بھی ہیں، پٹھان بھی ہیں، پنجابی بھی اور بلوچ بھی اور مہاجر بھی سب بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ کاش پاکستان ایسا ہو جائے کاش سارے پاکستانی ایسے ہو جائیں پھر ہر طرف محبت ہی محبت ہو گی۔ اپریل کا پرچہ ملا۔ ''احوال'' میں آپ کو دیکھ کر دل خوش ہوا۔ ''احوال'' میں ساتھیوں کے خط پڑھے جن دوستوں کو میری کہانی پسند آئی ان کا شکریہ۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ راجہ محمود کے قلم سے ''یادوں کے رنگ'' پڑھ کر اچھا لگا۔ محمد سلیم اختر کے قلم سے ''خزاں کے بعد'' اچھی لگی۔ مینا تاج کے قلم سے ''چکن بریانی'' اچھی لگی۔ آپ کے قلم سے ''شہید کی ڈائری'' اچھی لگی۔ بے شک شہید زندہ ہوتے ہیں۔ عائشہ کمال کے قلم سے ''تہی داماں'' دکھ بھری کہانی تھی۔ سنبل کے قلم سے ''محبت کا چہرہ'' اچھی کہانی تھی۔ عارف حسین کے قلم سے ''سونے کی بالیاں'' دکھ بھری کہانی تھی۔ کرن محمد فاروق کے قلم سے ''نفرت تھی درمیاں'' عبرت انگیز کہانی تھی حنیف سحر کے قلم سے ''گردش رنگ چمن'' عجب کہانی تھی اور سلیم فاروقی کے قلم سے ''آتش جنوں'' پڑھی۔ اچھی کہانی ہے اگلی قسط کا انتظار ہے۔ بہن بس اتنا ہی پڑھ پایا ہوں۔ آپ سے التجا ہے خط کے پہلے حصے پر قینچی نہ چلائی جائے پلیز اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔''

☆ بھائی وفا صدام حسین! بے شک نبی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے ہی میں عافیت ہے۔ اللہ کرے یہ بات تمام مسلمانوں کو سمجھ میں آجائے آپ کو کہانیاں اچھی لگیں تو ہماری محنت بھی ٹھکانے لگی۔ جہاں تک قینچی نہ چلانے کا سوال ہے تو بھیا گھوڑا گھاس سے کیسے دوستی کر سکتا ہے۔ آپ سب کے خطوط دیکھ کر تو قینچی صاحبہ ویسے ہی للچانے لگتی ہے۔ ویسے یہ زیادتی ہے احوال اور قینچی کا ساتھ اتنا پرانا ہے اور آپ لوگ ہیں کہ مانتے ہی نہیں۔

☒ محمد شعیب وفا کرم ایجنسی سے۔ ''خادم نے کچھ عرصہ پہلے دو عدد کہانی بعنوان ''تنہائی سی تنہائی ہے'' اور ''زندگی ٹھہر ذرا'' آپ کے رسالے کے لیے بھیجی تھیں لیکن نامعلوم کس وجہ سے وہ اب تک رسالے کے اوراق پر آنے سے قاصر ہیں اور اب ایک نئی کہانی ''جینے کی حسرت'' اور ''خیال آرائی'' کے ساتھ آپ کے ''احوال'' میں شرکت کر رہا ہوں اگر

www.pdfbooksfree.pk

رسالے کے معیار اور قارئین کی پسند کے مطابق ہوں تو ضرور شاملِ اشاعت کیجیے اگر مجھے جلدی چھپنے کا موقع ملا تو وعدہ رہا ہر ماہ ایک کہانی آپ کو ضرور بھیجوں گا، انشاء اللہ، تبصرہ ضرور کرتا مگر اس ماہ کا شمارہ مجھے لیٹ موصول ہوا اور نہ پرانے اور نئے لکھاریوں کو ضرور سراہتا کہ یہ ان کی محنت کا حق ہے مگر کیا کروں اب صرف دعائے خیر ہی کر سکتا ہوں۔ امید ہے کہ میرے کہانی اور خط رسالے میں شامل فرمائیں گے اور شکریہ کا موقع دیں گے۔"

☆ بھائی شعیب! آپ کی کہانیوں پر کام ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ جلد آپ کو مطلع کیا جائے گا۔ رسالے کے بارے میں کچھ تو لکھتے! چلیں اگلی بار سہی۔

✉ روبینہ منور کراچی سے۔ "ایڈیٹر صاحبہ آداب! میں آپ کی بہت مشکور ہوں کہ آپ نے میری چھوٹی سی تحریر یعنی کہانیاں کے مقبول سلسلے "خیال آرائی" میں شائع کر کے میری ہمت افزائی کی ہے۔ میں تہہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور آپ کے لیے دعا گو ہوں، اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔ اور آپ کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے، ایک بار پھر دل کی گہرائیوں سے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔"

☆ روبینہ! سچی کہانیاں تو آپ لوگوں کا اپنا پرچہ ہے۔ لکھتی رہیے، ہمیں انتظار رہے گا۔

✉ غزالہ شاہین عبدالقیوم، حیدرآباد سے۔ "قابلِ احترام ایڈیٹر صاحبہ، السلام علیکم! اللہ آپ کو صحت اور تندرستی عطا کرے اور آپ کا رسالہ "سچی کہانیاں" ترقی کے راستوں پر گامزن رہے، آمین۔ پُراسرار کہانی کے سلسلے کی ایک کہانی "مہرباں ایسے" ارسال کر رہی ہوں۔ اُمید ہے کسی قریبی اشاعت کا حصہ بنائیں گی۔"

☆ ڈیئر غزالہ! آپ کی کہانی ناصر رضا صاحب کو بھجوا دی ہے اور جلد آپ کا انعام آپ تک پہنچے گا۔

اس ماہ کا خصوصی خط

شفق شیکی، سیالکوٹ سے۔ "خوبصورت سرورق اور موٹا تازہ شمارہ اپریل 2012ء دل کو بہت بھایا۔ اس بار "احوال" بے حد طویل ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد مزیدار باتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس بار سب سے خوب صورت خط عکاشہ جی کا تھا۔ "سچی کہانیاں" کی کہانیاں ہر ماہ اپنی خوب صورتی اور نئے پن کے ساتھ ساتھ دل کے اندر گھر کر جاتی ہیں۔ "محبت کا چہرہ" دل میں محبت کے جذبوں کو بہت زیادہ ابھار گئی۔ بے حد عمدہ تحریر تھی۔ "دکھوں کے مارے" سخت دکھی کر گئی۔ "آرزوئیں دفن ہوئیں" دل کو چیر دینے کی حد تک سفاک سچائی تھی اس تحریر میں۔ "سونے کی بالیاں" اور "تہی داماں" بھی شاندار رہی تھیں۔ فی الحال اتنا ہی مطالعہ کر پائی ہوں اسی لیے یہ چھوٹا تبصرہ قبول کریں۔ شہرِ اقبال میں ابھی موسم میں کچھ ٹھنڈک باقی ہے۔ پیارے کراچی میں موسم کس جوبن پر ہے؟ ضرور بتائیے گا۔ سب نئے لکھنے والوں کو خوش آمدید۔ میرے پرچے ہو رہے ہیں دعا گو رہیے گا۔ اک شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔

سفر زندگی تمام ہوتا ہی نہیں ہے
کہ ہر ایک رستے آبلہ پائی کا شکار ہیں بہت

☆ شفق! تمہارا خط مجھے بہت اچھا لگا۔ مختصر بھی اور کچھ کچھ مکمل بھی۔ بہرحال اب صرف اپنے امتحانوں پر توجہ دو رزلٹ بہت اچھا آنا چاہیے۔ مٹھائی ہماری طرف سے ہوگی ٹھیک ہے نا؟

نوٹ: ان قارئین کے خطوط تاخیر سے ملنے کے باعث شاملِ "احوال" نہ ہو سکے۔ سہیل خان، کورنگی کراچی۔ تنویر خالد، دوکوٹہ۔ عائشہ خورشید، کراچی۔

پھر ملیں گے گر خدا لایا

منزہ سہام

www.pdfbooksfree.pk

راجہ محمود

شہنشاہِ جذبات

قاتل اجمیری کا خیال

جن فضاؤں نے مجھ کو دیکھا ہے
اُن فضاؤں کو یاد آؤں گا

پاکستانی فلمی افق کا جگمگا تا ستارہ اور لیجنڈری فنکار محمد علی کا احوالِ زیست



www.pdfbooksfree.pk

ہال میں اُس نوجوان مقرر کی آواز گونج رہی تھی اور سامعین یوں اس کی تقریر کے سحر میں گم تھے جیسے انہیں چپنا ٹائز کر دیا گیا ہو۔ نوجوان کی آواز میں گرج تھی' لوچ تھی' لہجے میں ایک تمکنت اور انداز میں وقار تھا۔ اس کا تلفظ دلکش تھا اور جملوں کی ادائیگی میں ندرت تھی۔ ان تمام خوبیوں کے ساتھ اس نے اپنی تقریر سے ماحول پر سکتہ سا طاری کر دیا تھا۔ جج صاحبان بھی مبہوت سے اس نوجوان مقرر پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ ان کے تاثرات دیکھ کر یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ اس انٹر کالجز تقریری مقابلے کا فاتح یہی نوجوان رہے گا۔

نوجوان نے اپنی تقریر کا اختتام کیا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ جج صاحبان بھی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے اور جب مقابلے کے فاتح کا اعلان ہوا تو سب کی توقع کے عین مطابق اسی نوجوان کو بہترین مقرر قرار دیا گیا۔ مردانہ وجاہت کا نمونہ اس نوجوان کا نام محمد علی تھا جو گورنمنٹ سٹی کالج' حیدرآباد کی نمائندگی کر رہا تھا جہاں وہ بی اے کا طالب علم تھا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ محمد علی نامی اس نوجوان نے تقریری مقابلہ جیتا ہو بلکہ وہ اپنی زبردست آواز اور دلکش اندازِ بیان کے باعث متعدد بار تقریری مقابلوں کا فاتح رہ چکا تھا۔ اس کے اساتذہ کو اپنے اس ہونہار طالب علم پر فخر تھا جو کالج کے وقار میں اضافے کا باعث بنا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں اپنی آواز کا جادو جگانے والے محمد علی کو شاید ادراک بھی نہیں ہوگا کہ آنے والے وقت میں کیسی کیسی کامیابیاں ہاتھ باندھے اس کی منتظر ہیں اور تقدیر کے پنوں پر اس کے لیے ایسا کچھ بھی لکھا ہے کہ ایک عالم اس کی گھن گرج والی آواز اور اس کی مردانہ وجاہت سے مالا مال شخصیت کا دیوانہ ہو جائے گا۔

19 اپریل 1931 کو دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہونے والے محمد علی نے ہندوستان کے صوبے اتر پردیش (یوپی) کے علاقے رام پور کے ایک خالص دین دار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد مولانا سید مرشد علی جید عالم دین تھے۔ محمد علی کے آباؤ اجداد کا شجرہ نسب سلسلۂ نقشبندیہ کے جدِ امجد حضرت مجدد الف ثانیؒ سے جا ملتا ہے۔ ان کے والد کا تعلق بنیادی طور پر افغانستان کے تاریخی شہر غزنی سے تھا۔ ایک رات ان کے خواب میں جدِ امجد حضرت مجدد الف ثانیؒ آئے اور انہیں غزنی چھوڑ کر ہندوستان ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ مرشد کے حکم پر مولانا سید مرشد علی نے فوراً رختِ سفر باندھا اور ہندوستان کے شہر رام پور میں سکونت اختیار کی۔ گھرانہ چونکہ مذہبی تھا لہٰذا بچوں کو انگریزی تعلیم دلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ دو بھائیوں اور دو بہنوں میں سب سے چھوٹے محمد علی کو چودہ سال تک اردو' عربی اور فارسی زبانوں کے علم سے آراستہ کیا گیا۔ محمد علی کی پیدائش کے فوری بعد ان کے اہلِ خانہ رام پور سے رہوتک آ گئے تھے جو صوبہ ہریانہ کا حصہ تھا اسی لیے محمد علی کا بچپن رام پور اور پیالہ کی گلیوں میں گزرا تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹا ہونے کے باعث محمد علی کو سب پیار سے منا کہتے تھے۔ وہ ابھی بہت چھوٹا تھا کہ والدہ داغِ مفارقت دے گئیں' یوں اس کی پرورش والدؒ بڑے بھائی ارشاد علی اور بڑی بہنوں کے زیرِ سایہ ہوئی۔ گھر میں دین دار ماحول تھا تو اس کی تربیت بھی اسی نہج پر کی گئی تھی۔ نماز' روزے کی پابندی سختی سے کرائی جاتی تھی۔ اسی ماحول میں محمد علی نے عمر کی چودہ منزلیں طے کر لی تھیں۔ لڑکپن کے اس دور میں جبکہ ایک بچہ جوانی کی حدوں میں داخل ہونے کی طرف گامزن ہوتا ہے اور اس میں دنیا کو زیر و زبر کرنے کی خواہشیں انگڑائیاں لے کر جاگ رہی ہوتی ہیں۔ محمد علی بھی عمر کے اسی فیز سے گزر رہے تھے کہ پاکستان کے نام سے دنیا کے نقشے پر ایک نئی ریاست نمودار ہوئی اور ہندوستان کے مسلمان اپنے اس نئے ملک کی طرف جوق در جوق ہجرت کرنے لگے۔ ملک میں ہونے والے اس سیاسی ہنگام سے محمد علی کا گھرانہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور تقسیمِ ہند کے تھوڑے عرصے بعد ہی محمد علی کے والد اپنے اہل و عیال کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔

سندھ کا تاریخی شہر حیدرآباد وہ جگہ تھی جہاں محمد علی کے خاندان نے سکونت اختیار کی لیکن کچھ عرصے یہاں رہنے کے بعد ان کی فیملی ملتان منتقل ہو گئی تھی جہاں ملت ہائی اسکول میں محمد علی کو ساتویں جماعت میں داخل کرا دیا گیا' تاہم اس کی فطری ذہانت کو دیکھتے ہوئے تھوڑے دنوں میں اساتذہ نے اسے ترقی دے کر نویں جماعت میں بھیج دیا۔ ابھی اس نے ملت ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا ہی تھا کہ گھر والے دوبارہ حیدرآباد میں آ بسے۔ یہ 1951 کا زمانہ تھا۔ سندھ کا یہ تاریخی شہر حیدرآباد جو کلہوڑا خاندان کے عہد میں سندھ کا دارالخلافہ رہا تھا' اس وقت اپنی آب و ہوا کے حوالے سے بہت مشہور تھا خصوصاً حیدرآباد کی فرحت بخش شامیں ملک بھر میں بے حد مقبول تھیں۔ اس وقت یہ بات زبان زدِ عام تھی کہ کراچی کے اکثر رؤسا یا سیٹھ لوگ حیدرآباد کی شاموں کا لطف اٹھانے کے لیے اپنا بزنس ایک ایڈ حیدرآباد میں گزارنے کے لیے آتے ہیں۔ یہاں کی شاموں کی ہی وجہ سے اس شہر کے قدیم مکانات اس طرح بنائے جاتے تھے کہ ان میں ہوادان ضرور ہوتا تھا۔ اسی نسبت سے حیدرآباد کو ہوادانوں کا شہر بھی کہا جاتا تھا۔ افسوس..... اب جدید طرزِ تعمیر نے حیدرآباد کی یہ شناخت ختم کر دی ہے۔



محمد علی (زیبا) خوشگوار لمحوں کی ایک یاد

ان ہی فرحت بخش شاموں کے شہر میں محمد علی کی نوجوانی کا دور گزرنے لگا۔ ان کا گھر فردوس سنیما کی گلی میں تھا۔ حیدرآباد میں محمد علی کا تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔ گورنمنٹ سٹی کالج' حیدرآباد سے انہوں نے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ مذکورہ کالج شہر کے قلب میں واقع ہے۔ اس کے ساتھ کلاتھ مارکیٹ ہے جبکہ دوسری جانب حیدرآباد کا تاریخی بازار ہے جسے فقیر کاچڑ کہا جاتا ہے۔ محمد علی کی زندگی کے سنہرے دن اسی کالج سے وابستہ ہیں۔ محمد علی پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی نمایاں تھے خصوصاً فنِ خطابت میں انہیں کمال حاصل تھا اور اس حوالے سے انہوں نے اپنے کالج کے لیے کئی انعامات جیتے۔

بڑے بھائی ارشاد علی ریڈیو پاکستان میں ڈرامہ آرٹسٹ تھے۔ اس وقت حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن ہوم اسٹیٹ ہال کی تاریخی عمارت میں تھا جو کہ قلعہ چاڑی پر واقع ہے۔ آج اس عمارت میں حسرت موہانی

www.pdfbooksfree.pk

لائبریری ہے۔ بڑے بھائی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے محمد علی نے بھی 1956ء میں ریڈیو پاکستان سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ ریڈیو پر وہ ڈرامے کرنے لگے اور اپنی صداکاری سے بہت جلد سامعین میں مقبول ہوگئے۔ ڈراموں کے علاوہ وہ بچوں کے مختلف پروگرامز بھی کرتے تھے۔ اس وقت محمد علی کو ایک ڈرامے کا معاوضہ دس روپے کی صورت میں ملتا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو پر مصطفیٰ قریشی، روبینہ قریشی، قربان جیلانی، بدر ہاشمی اور حمایت علی شاعر جیسے صداکار کام کرتے تھے۔ ریڈیو پر کام کے دوران انہوں نے حیدرآباد تھیٹر کی ترقی و ترویج کے لیے بھی سخت جدوجہد کی تھی۔ دوستوں کے مطابق محمد علی تھیٹر کی بہتری کے لیے دن رات ایک کرتے تھے۔ اسی طرح تھیٹر کے اداکاروں کی فلاح و بہبود کے لیے بھی ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے۔ اُن کے احباب انہیں پیار سے بھورے میاں کہتے تھے۔ تھیٹر کے لیے ان کی کاوشیں جاری تھیں کہ اچانک براڈ کاسٹر کی حیثیت سے ان کا تبادلہ بہاول پور ریڈیو کر دیا گیا جہاں انہوں نے کچھ عرصہ کام کیا اور پھر ریڈیو پاکستان، کراچی آ گئے۔

کراچی آنا محمد علی کے لیے مبارک ثابت ہوا تھا۔ اگر وہ اس شہر میں نہ آتے تو شاید تمام عمر براڈ کاسٹر کی حیثیت سے گزار دیتے اور سلور اسکرین کو ایسا فنکار نہ مل پاتا جس نے اپنے فن سے ایک عالم کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ کراچی ریڈیو پر محمد علی کو ذوالفقار بخاری کا ساتھ ملا جو زیڈ اے بخاری کے نام سے جانے جاتے تھے۔ کچھ ہی عرصے میں بخاری صاحب سے محمد علی کا تعلق اس نہج پر پہنچ گیا کہ محمد علی انہیں اپنا روحانی باپ کہنے لگے اور زیڈ اے بخاری کو محمد علی کا Mentor of acting کہا جانے لگا۔ بخاری صاحب کے زیرِ سایہ محمد علی کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ بخاری صاحب ریڈیو پاکستان، کراچی میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر تھے اور ریڈیو کا معتبر نام تھے۔ ان کی تجربہ شناس نظروں نے نوجوان محمد علی کے اندر چھپے جوہر کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ اس نوجوان میں ایسی صلاحیتیں ہیں جو اسے بہت آگے لے جاسکتی ہیں۔

ان ہی دنوں فضل احمد کریم فضلی ایک فلم بنا رہے تھے۔ فضلی صاحب فلمی صنعت کے دو عظیم ہدایت کاروں حسنین فضلی اور سبطین فضلی کے بڑے بھائی تھے۔ وہ سرکاری ملازم تھے اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے دونوں بھائیوں کی طرح انہوں نے فلم و فن سے وابستہ ہونے کا ارادہ کرتے ہوئے ایک فلم ساز ادارہ ''دبستانِ محمود'' کے نام سے قائم کرلیا تھا اور اسی ادارے کے تحت ایک فلم کا بھی اعلان کر دیا تھا۔ فضلی صاحب اپنی یہ پہلی فلم تمام نئے چہروں کو لے کر بنانا چاہتے تھے اور اسی لیے نئی کاسٹ کی تلاش میں تھے اور اس تلاش میں اُن کی نظریں ریڈیو کے فنکاروں پر تھیں گو کہ تمام نئے چہروں کو لے کر فلم بنانا بہت حوصلے کا کام ہوتا ہے اور ایسا تجربہ انڈسٹری میں کم کم لوگ ہی کرتے ہیں مگر جنہیں اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ ہوتا ہے، وہی ایسے چیلنج لیتے ہیں اور فضلی صاحب کا شمار انڈسٹری کے ان ہی باحوصلہ فلم سازوں میں ہوتا تھا۔ فضلی صاحب نے ریڈیو کے فنکاروں میں فلمی چہرے تلاشنے شروع کیے تو زیڈ اے بخاری نے نوجوان محمد علی سے انہیں متعارف کروایا۔ محمد علی کی وجیہ شخصیت کو دیکھتے ہی فضل احمد کریم فضلی نے اسے فلم میں ہیرو کے کردار کے لیے منتخب کرلیا۔ تھوڑے ہی دن میں فلم کی بقایا کاسٹ بھی فائنل ہوگئی جو کہ پوری کی پوری نئے چہروں پر مشتمل تھی جس میں سے زیادہ تر ریڈیو کے فن کار تھے۔ فلم کی ہدایت کاری فضلی صاحب نے خود سنبھالی اور فلم کی موسیقی کا شعبہ کراچی کے ایک گلوکار اور کمپوزر نہال عبداللہ کے سپرد کیا گیا۔ اس نئے موسیقار کا تعلق بھی ریڈیو سے تھا۔ فلم ''شاکر'' کے نام سے شروع کی گئی تھی مگر بعد میں نام بدل کر ''چراغ جلتا رہا'' کر دیا گیا۔ اس فلم کی ہیروئن زیبا تھیں۔ وہ بھی نئی دریافت تھیں۔ محمد علی کو ہیرو کا کردار ملا تھا مگر جب انہیں کہانی بتائی گئی تو انہیں ولن کا کردار زیادہ پاور فل لگا تو انہوں نے فضلی صاحب سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔ ''فضلی صاحب! کیا مجھے ولن کا کردار نہیں مل سکتا؟''

''کیوں بھئی! لوگ تو ہیرو کے کردار مانگتے ہیں اور تم ہو کہ ہیرو کو چھوڑ کر ولن بننا چاہتے ہو؟'' فضلی صاحب نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، مجھے ولن بننا ہے کیونکہ ولن کے کردار میں کرنے کے لیے بہت کچھ ہے۔'' محمد علی نے کہا۔

''سوچ لو بھئی پھر بعد میں شکوہ نہیں کرنا۔''

یوں محمد علی کو ان کی خواہش پر ولن کا کردار دے دیا گیا۔ فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی تو انڈسٹری میں اس فلم کو لے کر چہ مے شروع ہوگئے کہ فضلی تمام نئی کاسٹ خصوصاً ریڈیو کے فنکاروں کو ساتھ لے کر فلم بنا رہا ہے۔ کچھ نے حیرت کا اظہار کیا تو اکثریت نے اس انوکھے تجربے کا مذاق اڑایا۔ ہمارے یہاں کی فلمی صنعت کا ہمیشہ سے یہ چلن رہا ہے کہ جس نے بھی نئے تجربات کرنے کی کوشش کی اس کا مذاق اڑا کر حوصلہ شکنی کی گئی۔ فضلی صاحب کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا مگر وہ ان باتوں پر توجہ دینے کی بجائے اپنے



علی زیب، فلم ''یادیں'' کا ایک منظر

پروجیکٹ میں لگے رہے۔ ''چراغ جلتا رہا'' کی تمام تر شوٹنگ کراچی میں ہوئی۔ چونکہ تمام فنکار نئے تھے اس لیے ڈیٹس کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا اور شوٹنگ اپنے شیڈول کے مطابق تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کرتی رہی۔ ''چراغ جلتا رہا'' اس حوالے سے بھی

www.pdfbooksfree.pk

منفرد تھی کہ یہ واحد پاکستانی فلم ہے جس کے لیے معروف ہندوستانی گلوکار طاعت محمود نے گیت گائے تھے۔ فلم مکمل ہوکر 9 مارچ 1962ء میں ریلیز کے لیے پیش ہوئی۔ نئی کاسٹ کے ساتھ فلم بنانا حقیقتاً ایک انوکھا تجربہ تھا اور اب اس تجربے کے نتیجے کا وقت آ پہنچا تھا۔ یہ فلم ایم اے جناح روڈ پر واقع نشاط سنیما پر نمائش کے لیے پیش ہوئی۔ اس فلم کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی کہ اس کا افتتاح بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کے ہاتھوں ہوا۔

9 مارچ کا وہ دن محمد علی سمیت ان تمام نئے فن کاروں کے لیے بہت اہم تھا۔ ان سب کو خاص طور پر فضلی صاحب کو اپنی پہلی کاوش کے نتیجے کا انتظار شدت سے تھا کہ آیا فلم بین ان کی کاوش کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ نوجوان محمد علی کے دل کی حالت بھی اتھل پتھل ہو رہی تھی' اس نے فلم میں انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لایا تھا۔ ریڈیو کے حوالے سے تو اس کا ایک نام تھا مگر سلور اسکرین کی کامیابی سے اس کے کیریئر کو ایک راہ مل جاتی۔ فلم کا پریمیئر شو ختم ہوا تو ہر کوئی فلم کی تعریف کر رہا تھا خصوصاً ہیرو سے زیادہ محمد علی کے کام کو سراہا جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر نہ صرف نوجوان محمد علی کو خاصہ حوصلہ ملا تھا بلکہ ہدایت کار سمیت پوری ٹیم خوشی سے سرشار تھی۔ محمد علی کے لیے وہ دن بہت عجیب تھا جب وہ پریمیئر شو میں شرکت کرنے آئے تھے تو ایک گمنام نوجوان تھے مگر جب وہ سنیما سے نکل رہے تھے تو دیکھنے والا بے اختیار پکار اٹھتا تھا۔ ''وہ دیکھو..... ولن جا رہا ہے۔'' محمد علی نے ولن کے کردار میں اپنی کردار نگاری کے کچھ ایسے رنگ بھرے تھے کہ اس کے آگے ہیرو ماند پڑ گیا تھا۔ ہیرو کا کردار عارف نامی ایک نوجوان نے کیا تھا مگر وہ محمد علی کے سامنے دب کر رہ گیا تھا اور پھر وہ کبھی فلم اسکرین پر دوبارہ نظر نہیں آیا۔ اس امر سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوان محمد علی کو کردار کو پہچاننے کی کیسی غضب کی شدبد تھی حالانکہ یہ ان کی پہلی فلم تھی مگر اس نے محض اسکرپٹ پڑھ کر اندازہ لگا لیا کہ کس کردار میں زیادہ مارجن ہے اور پھر اپنے اس فیصلے کو درست بھی ثابت کر دکھایا۔ ''چراغ جلتا رہا'' کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم نے کراچی میں سلور جوبلی منائی مگر انڈسٹری کی اندرونی روایتی چپقلش کے باعث ملک کے دوسرے حصوں میں اس کی ریلیز نہ ہو سکی۔ اس فلم کی ایک اور خصوصیت اس حوالے سے بھی رہی کہ فلم جب سنسر کے لیے اسلام آباد گئی تو یہ فلم خصوصی طور پر اس وقت کے صدر جنرل ایوب خان نے دیکھی تھی۔ انہیں بھی یہ فلم پسند آئی تھی۔

''چراغ جلتا رہا'' کے بعد محمد علی نے تین فلمیں کیں جن میں ہدایت کار منور رشید کی فلم ''بہادر'' ہدایت کار اقبال یوسف کی ''دال میں کالا'' اور ہدایت کار جاوید ہاشمی کی ''دل نے تجھے مان لیا'' شامل تھیں۔ ان تینوں فلموں میں محمد علی ولن کے روپ میں ہی نظر آئے۔

سال 1963ء محمد علی کی زندگی میں ایک اور موڑ لے کر آیا۔ اس برس بطور ہیرو ان کی پہلی فلم ''شرارت'' ریلیز ہوئی۔ فردوس بیگم ان کے روبرو ہیروئن کے روپ میں تھیں۔ اس فلم نے بھی اچھا بزنس کیا۔ نوجوان محمد علی نے اب تک جتنی فلمیں کی تھیں' وہ سب کی سب کراچی کی تھیں۔ فلموں کا اصل گڑھ یعنی لاہور کے اسٹوڈیوز میں انہوں نے قدم نہیں رکھا تھا مگر اس کے لیے محمد علی کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اگلے برس یعنی 1964ء میں فلم ''خاندان'' میں انہیں بطور ہیرو کاسٹ کیا گیا۔ لاہور کی فلم نگری میں قدم رکھا تو انہوں نے کراچی کو مستقل

www.pdfbooksfree.pk

خیر باد کہہ دیا اور لاہور میں ایک فلیٹ خرید کر کے رہائش اختیار کرلی۔ 1964ء میں ہی ان کی ایک اور فلم ''خاموش رہو'' ریلیز ہوئی۔ یہ فلم ان کے کیریئر کے لیے بریک تھرو ثابت ہوئی۔ ''خاموش رہو'' میں ان کی اداکاری کو ناقدین اور عوام الناس نے بے حد سراہا اور وہ فلمی حلقوں میں موضوعِ گفتگو بن گئے اور انہیں یکے بعد دیگرے فلمیں ملنے لگیں' تاہم محمد علی کو کسی ایسی فلم کی تلاش تھی جو راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دے۔ خوش قسمتی سے جلد ہی ان کے کیریئر میں وہ فلم آ گئی۔ ہمایوں مرزا کی زیرِ ہدایت فلم ''آگ کا دریا'' کا اعلان ہوا تو کاسٹ میں ہیرو' ہیروئن کے طور پر محمد علی اور شمیم آراء تھے۔ یہ فلم 1966ء میں ریلیز ہوئی اور اس نے ملک بھر میں دھوم مچا دی۔ اس فلم سے محمد علی کو سپر اسٹار اسٹیٹس حاصل ہوا۔ ''آگ کا دریا'' ہی کی کامیابی کے باعث محمد علی اور شمیم آراء کی جوڑی بھی مقبولیت کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ 60ء کے عشرے میں یہ جوڑی فلم بینوں کی پسندیدہ ترین فلمی جوڑیوں میں سے ایک تھی۔ اس فلم کی فقید المثال کامیابی سے محمد علی کی زندگی کا رخ یکسر بدل گیا تھا۔ اب ان کا نام فلموں کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا اور ہر فلم ساز یا ہدایت کار اپنی فلم میں انہیں کاسٹ کرنا چاہتا تھا حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب وحید مراد جیسا چاکلیٹی ہیرو نوجوانوں میں بے حد مقبول تھا مگر محمد علی کا اپنا الگ چارم تھا' ان کا اپنا ایک جداگانہ انداز تھا جو انہیں دوسرے ہیروز سے ممتاز کرتا تھا۔ ان ہی دنوں محمد علی فلیٹ سے اپنے ذاتی بنگلے میں منتقل ہو گئے تھے جو انہوں نے گلبرگ' لاہور میں بنوایا تھا۔ ''آگ کا دریا'' کے بعد محمد علی' شمیم آراء کی ایک اور خوبصورت فلم ''صاعقہ'' ریلیز ہوئی۔ اس فلم نے بھی پورے پاکستان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ یہ جوڑی اس قدر مقبول ہوئی کہ حقیقی زندگی میں بھی دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اس وقت اس قسم کی افواہیں گردش کرنے لگیں کہ محمد علی' شمیم آراء کی منگنی ہو گئی ہے' تاہم اس منگنی کی دونوں نے نہ تو تردید کی اور نہ ہی تصدیق جس سے اس افواہ کی صداقت پر یقین ہونے لگا۔ اب ان کی منگنی ہوئی تھی یا نہیں مگر اس بات میں دو رائے نہیں تھیں کہ ان کے درمیان کچھ نہ کچھ ضرور تھا جس کی پردہ داری تھی مگر پھر اچانک جانے کیا ہوا کہ اس بے نام تعلق میں دراڑ پڑ گئی اور دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ شمیم آراء کے بعد محمد علی کا تعلق ایرانی اداکارہ شہ پارہ سے جڑ گیا' یوں فلمی صحافیوں کے ہاتھ ایک اور کہانی آ گئی مگر اس کہانی کا انجام بھی اس وقت ہو گیا جب محمد علی ایران گئے تو ان پر کھلا کہ مذکورہ اداکارہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔ اس انکشاف کے بعد یہ



ایک ایوارڈ تقریب میں محمد علی اور زیبا

www.pdfbooksfree.pk

انفیکٹر بھی دم توڑ گیا۔

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب ہدایت کار قبال یوسف اپنی فلم ''تم ملے پیار ملا'' کی عکس بندی کے لیے اپنے یونٹ کو کراچی لے گئے تھے اور روز و شب فلم کی شوٹنگ تیزی سے جاری تھی۔ اس فلم کے ہیرو ہیروئن محمد علی اور زیبا تھے۔ ان دونوں نے اپنے فلمی سفر کا آغاز ''چراغ جلتا رہا'' سے کیا تھا' تاہم زیبا' محمد علی کی ہیروئن نہیں تھیں اور دونوں ایک دوسرے سے دور دور رہے تھے مگر اس فلم کی شوٹنگ کے دوران دونوں ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے چلے گئے اور کیوپڈ کا تیر ایسا چلا کہ یہ قربت پہلے محبت میں بدلی اور پھر شادی کے حسین بندھن میں ڈھل گئی۔

''تم ملے پیار ملا'' ابھی تکمیل کے مراحل میں تھی کہ 29 ستمبر 1966ء کو ناظم آباد میں واقع اداکار آزاد کے گھر سہ پہر تین بجے قاضی سید احتشام نے دونوں کا نکاح پڑھا دیا۔ حقِ مہر کی رقم 37,500 روپے تھی۔ نکاح کے فوری بعد یہ تو یہاں ہتا جوڑا تقریباً شام پانچ بجے اسٹوڈیو پہنچا جہاں ہدایت کار اقبال یوسف نے اُس دن اُن دونوں کا محض ایک شاٹ لے کر شوٹنگ پیک اپ کروا دی اور پھر اُسی شام دونوں نے اپنے ساتھیوں اور دوستوں کو انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں ایک پارٹی دی۔ اس تقریب میں علی' زیب کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ اُسی رات دونوں دلہا دلہن تقریباً آٹھ بجے کراچی سے لاہور پہنچے تھے۔ اگلے دن اُن کی شادی کی خبر تمام اخبارات میں تھی جو عوام کے لیے چونکا دینے والی ثابت ہوئی تھی۔ شادی کے فوری بعد یہ نیا جوڑا حج اور عمرے کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب روانہ ہو گیا تھا۔

زیبا کی یہ تیسری شادی تھی۔ محمد علی سے پہلے وہ اداکار سدھیر اور عبدالصمد نامی شخص کی بیوی رہ چکی تھیں۔ عبدالصمد سے زیبا کی ایک بیٹی ثمینہ تھی جبکہ محمد علی سے زیبا کی کوئی اولاد نہیں ہوئی' تاہم محمد علی نے ثمینہ کو بالکل سگی بیٹی کی طرح محبت دی۔ وہ اسے اتنا چاہتے تھے کہ اسے ثمینہ بیٹی کہتے تھے۔

محمد علی کا فلمی سفر تیزی سے عروج کی جانب گامزن تھا۔ ان کی ہر نئی فلم خوب بزنس کر رہی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں محمد علی نوجوانوں کا craze بن گئے تھے۔ مردانہ وجاہت سے مالا مال ان کی شخصیت' اس پر گھن گھرج سے بھرپور دلکش آواز چار چاند لگا دیتی تھی۔ وہ کردار کو حقیقی رنگوں سے سجا دیتے تھے۔ ان کی خاص خوبی یہ تھی کہ وہ لمحے میں چہرے کے تاثرات بدلنے میں کمال رکھتے تھے۔ اس پر جذباتی مکالموں کی ایسی ادائیگی کہ فلم بینوں کی آنکھوں سے واقعتاً آنسو نکل پڑتے تھے۔ نقادوں نے انہیں شہنشاہِ جذبات کے خطاب سے نوازا تھا۔ ان کی شخصیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے فلم سازوں نے کردار لکھوانے شروع کر دیئے تھے خاص طور پر ایسے کردار جن میں ہیرو کو بیک وقت نوجوان سے لے کر بوڑھے کا کردار کرنا ہوتا تھا۔ ایسے کرداروں کے لیے محمد علی موزوں ترین ہیرو تھے۔ وہ حقیقی معنوں میں ورسٹائل فنکار تھے۔ انہوں نے کھلنڈرے ہیرو کے کردار جتنی آسانی سے کیے' اتنی ہی آسانی سے تاریخی کردار بھی ادا کیے۔ اگر یہ کہا جائے کہ تاریخی نوعیت کی فلموں میں تاریخی کرداروں کے لیے ان سے بہتر انتخاب کوئی نہ تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ جج' نواب' ڈاکو' وحشی' تاریخی کردار اور باحیثیت افراد کے کردار ادا کرنے کے لیے وہ آئیڈیل فنکار تھے۔

محمد علی بحیثیت فن کار تو سب کے سامنے عیاں تھے لیکن یہ بات شاید کم لوگ جانتے ہوں کہ ان میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ 1971ء کی جنگ کے بعد بھارت کی قید سے رہائی پانے والے ہمارے فوجی جوان جب پاکستان آئے تو محمد علی ان کا استقبال کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ 1971ء کی جنگ کے فوری بعد ہونے والے ماسکو کے فلمی میلے میں محمد علی نے سیاہ لباس زیب تن کیا تھا جو ان کی طرف سے بھارتیوں کے خلاف احتجاج تھا۔

اپنے عروج کے دنوں میں ذوالفقار علی بھٹو سے ان کے خصوصی مراسم تھے۔ بھٹو کے دورِ حکومت میں اسلامی سربراہ کانفرنس کا انعقاد لاہور میں ہوا تو سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل نے محمد علی کے گھر



پر ہی قیام کیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو سے دوستی کا خراج محمد علی کو اس وقت دینا پڑا جب ضیاء دورِ حکومت میں انہیں پانچ ماہ کی جیل ہوئی۔ اس سے پہلے 1976ء میں ایک جلسے میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کی حمایت کرنے پر کراچی میں ان کی فلموں کا بائیکاٹ بھی ہو چکا تھا جو دس ماہ تک جاری رہا تھا۔ محمد علی کی پانچ ماہ کی قید کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ یہ 1981ء کا ذکر ہے' ضیاء الحق نے لاہور کی تقریباً تمام قابلِ ذکر شخصیات کو جیل میں قید کر دیا تھا۔ ان میں حمید اختر' شعیب ہاشمی' حبیب جالب' محمود علی قصوری' مظہر علی خان' عبداللہ ملک' رضا کاظم' اداکار حبیب' راؤ رشید' ڈاکٹر مبشر حسن' آئی اے رحمان' جج سعید ملک' ردن ملک' اداکار محمد علی اور درجنوں جمہوریت پسند افراد شامل تھے۔ یہ سارے سیاسی قیدی تھے۔ ان سے عام قیدیوں جیسا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ محمد علی نے جیل کے یہ ایام بہت ہمت اور حوصلے سے گزارے تھے حالانکہ یہ ان کے عروج کا دور تھا اور وہ شاہانہ زندگی گزارتے تھے۔ تمام سیاسی قیدی لاہور کی کوٹ لکھپت جیل میں تھے جہاں وقت گزاری کے لیے ان قیدیوں نے والی بال کی ٹیم بنالی تھی۔ ایک ٹیم کے کپتان حمید اختر اور نائب کپتان محمد علی تھے۔ اس ٹیم میں حبیب جالب سمیت دیگر افراد بھی تھے جبکہ دوسری ٹیم میں ایک وکیل' اداکار حبیب اور کچھ دوسرے لوگ تھے۔ دونوں ٹیموں کے درمیان اکثر مقابلے ہوتے رہتے تھے اور اکثر ایسا ہوتا کہ محمد علی کے غلط کھیل کی وجہ سے ان کی ٹیم ہار جاتی تھی جس پر حبیب جالب غصے سے انہیں ٹیم سے نکالنے کا مطالبہ کرتے۔ ایک بار دونوں ٹیموں کے مقابلے میں میاں محمود قصوری نے ٹرافی دینے کا اعلان کیا۔ محمد علی کی غلط سروں کی وجہ سے ان کی ٹیم ہار گئی اور ٹرافی

www.pdfbooksfree.pk

دوسری ٹیم نے جیت لی۔ حبیب جالب اس ہار پر اتنے شدید غصے میں تھے کہ انہوں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا لیکن اس قسم کی لڑائیوں اور ناراضگیوں کے باوجود محمد علی اور حبیب جالب میں دوستی اور محبت کا اٹوٹ رشتہ تھا۔ صبح ناشتے سے فارغ ہوکر دونوں تاش لے کر بیٹھ جاتے اور ہر بازی پر سگریٹ کی ڈبی رکھی جاتی۔ ایک بار تاش کھیلتے ہوئے حبیب جالب نے بازی میں دو ڈبیہ جیتیں اور دونوں اگلی بازی میں لگا دیں۔ وہ بازی بھی حبیب جالب جیت گئے تو چاروں ڈبیاں بازی میں لگا دیں۔ یہ بازی بھی جالب صاحب کے نام رہی اور وہ آٹھ ڈبیوں کے حقدار بن گئے۔ پاس بیٹھے حمید اختر نے انہیں سمجھایا کہ بس اب باز آجاؤ' سگریٹ کی یہ ڈبیاں آٹھ دنوں کے لیے کافی ہیں مگر حبیب صاحب نہیں مانے اور اگلی بازی میں یہ آٹھوں ڈبیاں لگا دیں مگر یہ بازی محمد علی جیت گئے۔ اکثر یوں ہوتا کہ محمد علی کو جب پتہ چلتا کہ حبیب صاحب کے پاس سگریٹ ختم ہوگئے ہیں تو وہ جان بوجھ کر ہار جاتے اور یوں حبیب جالب کی سگریٹوں کا مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔ جیل میں محمد علی کا کھانا گھر سے آتا تھا جسے وہ جیل کے دوستوں کے ساتھ مل کر کھاتے تھے۔ ان کے مداح اکثر مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے بھجواتے تھے جنہیں وہ قیدیوں میں بانٹ دیتے تھے۔

محمد علی جتنے بڑے فنکار تھے اس سے کہیں زیادہ بڑے انسان تھے۔ ان کے سینے میں ایسا مہربان دل دھڑکتا تھا جو ہر وقت ہر ایک کی پریشانی اور تکلیف دور کرنے کو مچلتا رہتا تھا۔ ان کی زندگی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جب انہوں نے مشکل کے وقت میں اپنے دوستوں اور ساتھی فنکاروں کی اور ایسے لوگوں کی بھی مدد کی جن کا اُن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا مثلاً ریاض شاہد کی فلم ''یہ امن'' سنسر کے مسائل میں پھنسی تو یہ محمد علی ہی تھے جنہوں نے بھاگ دوڑ کر کے ریاض شاہد کی فلم کو سنسر کے معاملات سے آزاد کرایا اور یوں فلم کی ریلیز ممکن ہوسکی۔ اسی طرح جب ادا کارہ فردوس حکومت کی جانب سے واجب الادا بھاری ٹیکس کی پریشانیوں میں الجھیں تو محمد علی نے ہی اس کڑے وقت میں اپنی ساتھی ادا کارہ کی مدد کی تھی۔ انہوں نے گوہر علی کی فلم ''مانگ میری بھردو'' میں بغیر معاوضے کے کام کیا تھا کیونکہ گوہر علی مالی پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے۔

1977ء میں جبکہ محمد علی اپنے عروج کو اُتار کر رہے تھے کہ اچانک وہ بیمار پڑ گئے انہیں گردے کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔ تین سال تک وہ اس بیماری سے لڑتے رہے پھر 1980ء میں ڈاکٹروں نے آپریشن کے ذریعے ایک گردہ نکال دیا۔ جب وہ اس بیماری سے سنبھلے تو انہیں شوگر کا مرض لاحق ہوگیا۔ شہرت نے محمد علی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ دورِ عروج میں بھی ان کا رویہ انکسار سے بھرپور ہوتا تھا۔ 1969ء میں جبکہ وہ اپنے کیریئر کی بلندی پر تھے' اس وقت انہوں نے ریڈیو پاکستان' لاہور سے نشر ہونے والے ایک گھنٹے کے ڈرامہ ''چاند نہیں نکلا'' میں کام کیا تھا۔ یہ ان کی ریڈیو سے محبت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ محمد علی نے دو فلمیں بھی پروڈیوس کیں جن میں ''آگ'' اور ''جیسے جانتے نہیں'' شامل ہیں' یہ دونوں فلمیں باکس آفس پر کامیاب رہی تھیں۔

محمد علی کا احترام ملک میں ہی نہیں' ملک سے باہر بھی کیا جاتا تھا۔ جب وہ ہندوستان گئے تو وہاں کی پارلیمنٹ کے ایک رکن یونس احمد نے انہیں شال تحفے میں دی تھی۔ اسی طرح ایک بار جب وہ بنگلہ دیش میں ایک فلم کی شوٹنگ میں مصروف تھے' اس وقت کے بنگلہ دیشی صدر جنرل ارشاد احمد نے انہیں قرآن مجید بطور تحفہ دیا تھا۔ انہیں ہندوستان میں

'نوشاد ایوارڈ' سے بھی نوازا گیا تھا۔

محمد علی نے اپنے کیریئر میں تقریباً پچاس ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا ہے جو خود اپنی جگہ ایک انفرادیت ہے۔ ان کی جوڑی سب سے زیادہ زیبا بیگم کے ساتھ پسند کی گئی۔ زیبا اور محمد علی نے ایک ساتھ کل 70 فلموں میں کام کیا جن میں 59 فلمیں ایسی ہیں جن میں وہ ہیرو' ہیروئن کی حیثیت سے پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہوئے۔ ان میں ایک بھارتی فلم ''کلرک'' بھی شامل ہے۔ یہ جوڑی پاکستان فلم انڈسٹری کی سب سے قابلِ احترام جوڑی سمجھی جاتی تھی اور علی زیب کے نام سے مشہور تھی۔ اس جوڑی کی کامیاب فلموں میں ''تم ملے پیار ملا' انسان اور آدمی' انصاف اور قانون' افسانہ زندگی کا' دامن اور چنگاری' پھول میرے گلشن کا' جب جب پھول کھلے' نوکر' محبت زندہ ہے' شمع' عورت ایک پہیلی' جیسی فلمیں شامل ہیں۔ اس جوڑی کی بطور ہیرو ہیروئن پہلی فلم ''ہیڈ کانسٹیبل'' تھی جو 1964ء میں ریلیز تھی۔

سنگم کے ساتھ محمد علی چالیس فلموں میں نظر آئے جن میں سے 32 فلموں میں یہ دونوں ہیرو ہیروئن تھے۔ محمد علی' شبنم کی پہلی فلم ''آسرا'' (1969ء) تھی اور آخری فلم 1987ء میں ریلیز ہونے والی ''تیری بانہوں میں'' تھی۔ اس جوڑی کی بڑی فلموں میں ''دو ریاں'' اور ''آس پاس'' شامل ہیں جبکہ ''بانو رانی' اچھے میاں' آئینہ اور صورت' انتخاب'' اور ''نصیب'' اس جوڑی کی قابلِ ذکر فلمیں ہیں۔

دیبا اور محمد علی ''چراغ جلتا رہا'' میں متعارف ہوئے جس میں دونوں کے سائیڈ رول تھے۔ بطور ہیرو' ہیروئن اس جوڑی کی پہلی فلم ''دل کے ٹکڑے'' تھی اور آخری فلم ''کرائے کے قاتل'' رہی۔ یہ دونوں 28 فلموں میں اکٹھے نظر آئے جن میں سے 19 فلموں میں مرکزی کردار کیے۔ دیبا محمد علی کی بڑی فلم ''آئینہ'' ہے جبکہ اس جوڑی کی قابلِ ذکر فلموں میں ''دل کے ٹکڑے' حقیقت' شکوہ'' اور ''امبر'' شامل ہیں۔

رانی اور محمد علی 33 فلموں میں جلوہ گر ہوئے جن میں سے 13 فلموں میں بطور ہیرو' ہیروئن نظر آئے۔ اس جوڑی کی پہلی فلم ''سفید خون'' اور آخری فلم ''خون اور پانی'' تھی اور قابلِ ذکر فلموں میں ''شہنشاہ' ہزار داستان' کالو' سیتا مریم مارگریٹ' بدنام'' شامل ہیں۔

محمد علی اور شمیم آرا کی جوڑی 60ء کے عشرے کی مقبول ترین جوڑی تھی۔ اس جوڑی کی کامیاب ترین فلم ''آگ کا دریا'' ہے' یہی وہ فلم ہے جو محمد علی کے کیریئر کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ اس جوڑی کی ایک سپر ڈپر ہٹ فلم ''صاعقہ'' تھی۔ ''وحشی'' بھی اس جوڑی کی بڑی فلموں میں سے ایک ہے۔ اس جوڑی نے کل دس فلمیں کیں جن میں سے 9 میں مرکزی کردار ادا کیے۔ اس جوڑی کی آخری فلم ''خاک اور خون'' تھی۔

سنگیتا کے ساتھ محمد علی 18 فلموں میں نظر آئے جن میں سے آٹھ میں وہ سنگیتا کے ہیرو بنے۔ اس جوڑی کی پہلی فلم ''انصاف اور قانون'' تھی اور بطور ہیرو' ہیروئن پہلی فلم ''تیرے میرے سپنے'' ہے۔ ''عورت ایک پہیلی' نام میرا بدنام'' اور ''جانے نہیں دوں گی'' اس جوڑی کی سپر ہٹ فلمیں ہیں۔

ممتاز اور محمد علی پہلی بار ''تم سلامت رہو'' میں ایک ساتھ دکھائی دیئے' تاہم ہیرو' ہیروئن کی حیثیت سے اس جوڑی کی پہلی فلم ''صورت اور سیرت'' ہے۔ اس جوڑی کی کامیاب ترین فلم ''منزل'' ہے جبکہ قابلِ ستائش فلموں میں ''آن داتا' سنگرام'' اور ''ذرا سی بات'' شامل ہیں۔

فردوس اور محمد علی یوں تو ''غدار'' نامی فلم میں پہلی بار نظر آئے' تاہم ''تاج نا گن بجے بین'' بطور ہیرو' ہیروئن اس جوڑی کی پہلی فلم تھی۔ اس جوڑی نے کل

www.pdfbooksfree.pk

12 فلمیں کیں اور 7 فلموں میں مرکزی کرداروں میں نظر آئے۔ اس جوڑی کی کامیاب فلمیں ''جاگ اٹھا انسان'' اور ''سرحد کی گود میں'' ہیں۔

بابرہ شریف کے ساتھ محمد علی نے یوں تو 33 فلمیں کی ہیں مگر ان میں محض دو فلمیں ایسی ہیں جن میں یہ دونوں ہیرو ہیروئن کے روپ میں نظر آئے۔ بابرہ کے چھوٹے قد کی وجہ سے محمد علی کے ساتھ وہ سوٹ نہیں کرتی تھیں۔ فلم ''سلاخیں'' میں بابرہ نے محمد علی کی بیٹی اور نواسی کا کردار بہت خوبصورتی سے نبھایا ہے۔

محمد علی نے کل 277 فلموں میں کام کیا جن میں سے 248 اردو 17 پنجابی 8 پشتو 2 ڈبل ورژن ایک ہندی اور ایک بنگالی فلم ہے جبکہ ایک دستاویزی فلم میں ان کی خوبصورت آواز کو شامل کیا گیا ہے۔

محمد علی نے ایک خاص انداز سے زندگی گزاری۔ علی زیب کو فلمی دنیا کی شاہانہ جوڑی کہا جاتا تھا۔ محمد علی کا رہن سہن اور نشست و برخاست کسی شہنشاہ سے کم نہیں تھا۔ لاہور میں محمد علی کی کوٹھی ایسی پرآسائش تھی کہ کسی بادشاہ کا محل لگتی تھی۔ ان کا انداز زندگی بھی شاہانہ تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ جب وہ ملک سے باہر جاتے تھے تو اعلیٰ ترین ہوٹلز کے اعلیٰ کمروں میں رہائش اختیار کرتے تھے حتیٰ کہ امریکہ میں بھی پانچ ستارہ یا مذید ستارہ ہوٹل کے ڈیلکس کمرے ان کا انتخاب ہوتے تھے۔

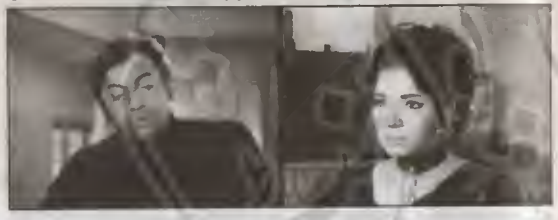
یوں تو محمد علی نے 277 فلموں میں کام کیا لیکن انہیں ایک فلم میں کام کرنے کا پچھتاوا ہمیشہ رہا اور وہ فلم منوج کمار کی ہندوستانی فلم ''کلرک'' تھی۔ محمد علی اکثر کہتے تھے کہ ''کلرک'' میں کام کرنا ان کے کیریئر کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ دراصل ''کلرک'' کے معاملے میں ان کے ساتھ دھوکہ ہوا تھا۔ جب وہ ہندوستان گئے تھے تو منوج کمار جو ان کے دوستوں میں سے تھے اس نے محمد علی اور زیبا کو اپنی فلم میں کام کرنے کا اصرار کیا۔ محمد علی کو اسکرپٹ سنایا گیا تو انہیں کردار بہت پاور فل لگا تھا جس میں کام کا بہت مارجن تھا۔ اسکرپٹ پڑھ کر محمد علی نے فلم سائن کر لی مگر جب فلم ریلیز ہوئی تو یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئے کہ ان کا کردار ایڈیٹنگ میں مختصر کر دیا گیا تھا جبکہ ان کے مقابل اداکار کا کردار بڑھا کر جاندار کر دیا گیا تھا۔ انہیں منوج کمار پر بہت بھروسہ تھا مگر اس نے محمد علی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی جس کا افسوس محمد علی کو ہمیشہ رہا تھا۔

1990ء میں محمد علی نے غریب اور نادار لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے ''علی زیب'' کے نام سے ایک فاؤنڈیشن قائم کیا جس کے تحت سینکڑوں افراد کی مالی اعانت کی مدد کی گئی۔ اس فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام سرگودھا اور فیصل آباد میں اسپتال بھی قائم کیے گئے جہاں بے شمار مریضوں کو مفت طبی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ محمد علی نے نواز شریف دور حکومت میں ثقافتی مشیر کی حیثیت سے خدمات بھی انجام دیں اور کچھ عرصہ انہوں نے کنسرکشن کا کاروبار بھی کیا۔

1994ء میں انہوں نے پی ٹی وی کی ڈرامہ سیریل ''ضرورت'' کی آخری تین قسطوں میں بھی کام کیا۔ 1995ء میں انہوں نے فلموں کو خیرباد کہہ دیا۔ ان کی آخری فلم ''دم مست قلندر'' تھی۔ جب ایک ٹی وی شو میں فلموں سے کنارہ کشی کے حوالے سے سوال کیا گیا تو ان کا کہنا تھا کہ فلم انڈسٹری کا ماحول پہلے جیسا نہیں رہا اور جس طرح کی فلمیں بن رہی ہیں اُنہیں دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ اب فلموں کو خدا حافظ کہہ دینا چاہیے۔ 1998ء میں انہیں دل کا دورہ پڑا تو امریکہ میں ان کا بائی پاس ہوا۔ جب وہ صحت یاب ہو کر واپس آئے تو اس وقت کے وزیراعظم نواز شریف نے خود اُن کے گھر جا کر عیادت کی تھی۔

محمد علی کے کیریئر سے بہت سے منفرد اعزازات جڑے ہوئے ہیں۔ انہیں پاکستانی فلموں کا لیجنڈری اسٹار کا خطاب ملا۔ دبئی میں انہیں پاکستان کے بڑے فن کار کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ وہ پاکستان کے علاوہ برطانیہ' امریکہ' کویت' ترکی' سعودی عرب' چین اور ہندوستان میں بھی یکساں طور پر مقبول فن کار تھے۔ وہ پاکستان کے واحد اداکار ہیں جنہیں تمغۂ امتیاز سے نوازا گیا۔ چار مارچ 2010ء کو امریکی نشریاتی ادارے سی این این نے ایک سروے کے تحت ایشیا کے 25 بہترین اداکاروں کی فہرست بنائی تو محمد علی بھی اس میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ ندیم اور وحید مراد بھی اس فہرست کا حصہ تھے۔ وس نگار ایوارڈز اور تمغۂ حسن کارکردگی بھی ان کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ تمغہ 1984ء میں اُسی ضیاء الحق نے انہیں عطا کیا تھا جس نے پیپلز پارٹی کی حمایت کرنے پر انہیں جیل میں بند کر دیا تھا۔ وہ پاکستان کے واحد فن کار تھے جن کی ذات کو مدنظر رکھ کر افسانہ لکھا گیا۔ اُس افسانے کا عنوان ''محمد علی کا ڈرائیور'' تھا۔ اس کے مصنف ناصر رضا تھے۔ انہوں نے یہ افسانہ کرشن چندر کے افسانہ ''دلیپ کمار کا ئی'' سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔

یہ زندگی کے آخری ایام کا قصہ ہے۔ ایک روز اچانک اُن کے دل میں خیال آیا کہ حیدرآباد جا کر اپنے پرانے گھر اور پرانے واقف کاروں سے ملا جائے' بس اسی خیال کے تحت ڈرائیور کو ساتھ لیا اور حیدرآباد کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اُن کی گاڑی جب حیدرآباد شہر کی حدود میں داخل ہوئی تو بیتے لمحوں کی تمام یادیں جیتے جاگتے منظر کی صورت اُن کی نگاہوں کے سامنے آ گئیں۔ سٹی کالج میں طالب علمی کے دور کا نوجوان محمد علی یکایک چھلانگ لگا کر سامنے آ گیا۔ منظر بدلا تو ہوم اسٹیٹ ہال میں واقع ریڈیو پاکستان کا مائیکروفون کان میں سرگوشیاں کرنے لگا اور ریڈیو کے پرانے دوست اور ساتھیوں کے چہرے نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ ٹنڈی



سڑک آرٹس کونسل' رانی باغ کا تھیٹر اور بھی جانے کیا کچھ اُن کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ وہ ماضی کی ان ہی سنہری یادوں میں گم تھے کہ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ محمد علی نے چونک کر نظریں اٹھائیں' گاڑی عین اُس گلی کے سامنے کھڑی تھی جہاں اُن کا پرانا گھر تھا۔ انہوں نے گردن گھما کر سڑک کے اُس پار نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر دل دکھ سے بھر گیا کہ جس جگہ فردوس سنیما ہوا کرتا تھا' اب وہاں پیٹرول پمپ وجود میں آ چکا تھا۔ یہ ایک لمحہ فلم انڈسٹری کے عروج و زوال کی پوری کہانی بیان کر گیا اور اُن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ڈرائیور گاڑی کو گلی کے اندر لے جانا چاہتا تھا مگر محمد علی نے اسے روک دیا اور گاڑی سے اتر کر

www.pdfbooksfree.pk

پیدل گلی میں داخل ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر گلی میں شور مچ گیا۔

"ارے..... یہ تو محمد علی ہیں۔"

"دیکھو محمد علی آئے ہیں۔"

گلی میں موجود لوگ قریب آ کر معافی کرنے گئے اور وہ روایتی مسکراہٹ کے ساتھ سب سے ملتے ملاتے اپنی آپا کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہ آپا حیدرآباد کے معروف سخانی مسعود جاوید کی والدہ تھیں اور اسی گلی میں برسوں سے رہتی تھیں۔ محمد علی انہیں آپا کہا کرتے تھے۔ وہ بھی شور سن کر گھر کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی تھیں۔ محمد علی نے انہیں سلام کیا تو آپا نے سلام کا جواب دیتے ہوئے بے اختیار پوچھا۔

"بہو کو نہیں لائے؟"

اس بے تکلفانہ سوال سے ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن کا محمد علی سے کیا تعلق تھا۔

"آپا! جلدی میں آیا ہوں اب آؤں گا تو آپ کی بہو کو ضرور لاؤں گا۔" محمد علی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا مگر انہیں دوبارہ حیدرآباد آنا نصیب نہیں ہوا تھا۔

گھر والوں کا منا' دوستوں کے لیے بھورے میاں' ساتھی اداکاروں کا علی بھائی اور فلمی صحافیوں و نقادوں کے اس شہنشاہ جذبات کی بھرپور زندگی 19 مارچ 2006ء کو اختتام پذیر ہو گئی۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ محمد علی صبح گیارہ بجے باتھ روم جانے کے لیے بستر سے اٹھے مگر ابھی چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ لڑکھڑا کر بیڈ روم کے فرش پر ہی گر پڑے۔ آواز سن کر زیبا دوڑی دوڑی آئیں اور محمد علی کو فرش پر گرا ہوا دیکھ کر اپنے ملازم عباس کو آواز دے کر پکارا۔ ملازم اور زیبا نے سہارا دے کر انہیں کرسی پر بٹھایا مگر اُن کی حالت انتہائی تشویش ناک تھی فوراً



زیبا، محمد علی فلم "انصاف اور قانون" کے ایک منظر میں

ڈاکٹر کو بلوایا گیا مگر زندگی کا سفر مکمل ہو چکا تھا۔ تقریباً دن ڈیڑھ بجے محمد علی نے کلمۂ شہادت پڑھا اور اُن کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور رُوح اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ اُس وقت بیٹی ثمینہ امریکہ میں تھی۔ باپ کی وفات کی خبر سن کر وہ دوڑی چلی آئی اور اس کی آمد کے بعد محمد علی کا جنازہ آہوں و سسکیوں کے ساتھ اٹھایا گیا۔ نمازِ جنازہ 21 مارچ بروز منگل کو بعد نمازِ ظہر گلبرگ کے سامنے واقع میدان میں ادا کی گئی اور پھر اُن کا جسدِ خاکی لاہور میں حضرت میاں میر صاحبؒ کے مزار کی چوکھٹ پر سپردِ خاک کر دیا گیا۔

محمد علی نے 75 برس دنیا کے اسٹیج پر اپنا کردار بخوبی ادا کر کے اپنے دستخط اپنے کام کی صورت ثبت کر کے اس فانی دنیا کو چھوڑ گئے اور اپنے لاکھوں پرستاروں کو سوگوار کر گئے۔

☆☆☆

ردا ناصر

داغدار چہرے سے پیدا ہوتی تابانی

گل حمید کا خیال
ظلمتیں حد سے بڑھی ہیں کوئی پھوٹے گی کرن؟
اب مقدر میری دھرتی کا سنور جائے گا

آسکر ایوارڈ یافتہ پہلی پاکستانی شرمین عبید چنائے کے کیریئر کی حقیقی کہانی

"سیونگ فیس" صرف تیزاب سے جلائے گئے عورت کے چہرے کی تصویر نہیں ہے ان ظالم اور بے رحم مردوں کے خلاف کی جانے والی جدوجہد کا نام بھی ہے جو زندگی' خوبصورتی اور روشنی کے دشمن ہیں۔ شرمین عبید چنائے کی اس دستاویزی فلم نے آسکر ایوارڈ 2012ء حاصل کیا ہے اور ساری دنیا میں اپنے ملک کے نام' مقام اور پہچان کا باعث بنی ہے۔

دستاویزی فلموں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے شرمین کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس حوالے سے وہ بہت سا ایسا کام کر چکی ہیں



www.pdfbooksfree.pk

جو ایک عورت ہونے کے باوجود انہیں دستاویزی فلم سے وابستہ بے شمار مردوں سے ممتاز کرتی ہے۔

2010ء میں شرمین کو اُن کی ایک نہایت ہی خوبصورت، یعنی دستاویزی فلم "چلڈرن آف دی پاکستان" پر انٹرنیشنل ایمی ایوارڈ دیا گیا تھا۔

شرمین عبید چنائے نے زندگی کی زمین پر اپنا پہلا قدم شہر کراچی میں پیدائش کی صورت 1978ء میں رکھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کی صورت Smith College امریکہ سے اکنامکس میں بیچلرز کی ڈگری پھر امریکی یونیورسٹی آسٹین فورڈ سے انٹرنیشنل پالیسی اسٹڈیز کے علاوہ کمیونی کیشن میں ماسٹرز کیا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ صحافت اور سیاسیات کا علم حاصل کرنے والی شرمین نے فلم میکنگ کے حوالے سے کوئی ڈگری نہیں لی۔ اس حوالے سے وہ گفتگو کے درمیان پوچھے جانے والے ایک سوال کے جواب میں کہتی ہیں۔

"میں دورانِ تعلیم امریکہ سے چھٹیوں پر پاکستان آئی تھی تو یہاں موجود افغان مہاجرین کا ایک کیمپ دیکھنے گئی تھی۔ وہاں میں نے اُن کی خصوصاً بچوں کی جو حالت دیکھی تھی تو اُن کے بارے میں ڈاکیومنٹری بنانے کا سوچا تھا۔ میں ہمیشہ سے ایسی مختصر ڈاکیومنٹری فلموں کو دیکھنے میں دلچسپی رکھتی تھی جو اپنے دیکھنے والوں تک کوئی بڑا بامعنی پیغام پہنچانے کا باعث بنتی ہوں۔"

2002ء میں شرمین نے تعلیم کے حصول کے بعد پاکستان واپسی پر دستاویزی فلم کی دنیا میں پہلا قدم رکھا۔ اس پہلی فلم میں اُن کے ساتھ اسمتھ کالج اور نیویارک ٹائمز نے فنڈز کی صورت تعاون ہی نہیں کیا تھا بلکہ فلم سازی کے equipments کے علاوہ اور دوسری سہولیات بھی فراہم کی تھیں اور پھر اس کے بعد یہ سلسلہ چلتا ہی چلا گیا تھا جس کے نتیجے میں شرمین اب تک سولہ دستاویزی فلمیں بنا چکی ہیں اور "چلڈرن آف دی طالبان" "دی لاسٹ جنریشن" "میررز چلڈرن" "پاکستانیز بُل گیم" "دومن آف ہولی کنگ ڈم" اور "افغان ان ویلڈ" جیسی فلمیں سی این این، چینل فور، سی بی سی، الجزیرہ، بی بی سی اور دکھائی جا چکی ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی بہت ضروری ہے کہ "دومن آف دی ہولی کنگ ڈم" سعودی عرب کی ایک خاتون کے حوالے سے وہ ڈاکیومنٹری ہے جس کی شوٹنگ کی اجازت شرمین کو سعودی حکومت نے پہلی بار نہایت خصوصی طور پر دی تھی۔

شرمین عبید چنائے کا تعلق اُن لوگوں کے قبیلے سے ہے جو زندگی کو گزارنے نہیں، برتنے پر یقین رکھتے ہیں۔ اپنے زندگی نامے پر اپنے کام کی صورت ایسے دستخط پر یقین رکھتے ہیں جو وقت کی کتاب پر شناخت کا باعث بنے، سو وہ دستاویزی فلموں کی تخلیق والے کام کے ساتھ صحافتی امور اور "سٹیزنز آرگنائزیشن آف پاکستان" نام کے ایک ادارے کی روحِ رواں بھی ہیں۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد اور کام تاریخ پاکستان کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ بنانا ہے۔

"سیونگ فیس" شرمین کے اس آسکر ایوارڈ یافتہ کام کا خیال اُن کے ساتھی ڈائریکٹر ڈیبل یک کے ذہن میں آیا تھا کہ پاکستانی نژاد برطانوی ڈاکٹر محمد جواد کی زندگی اور اُن کے کام یعنی پاکستان میں تیزاب کا شکار عورتوں کا علاج ڈاکیومنٹری کا موضوع بنایا جائے۔

"سیونگ فیس" کی کہانی جنوبی پنجاب سے تعلق رکھنے والی دو ایسی عورتوں (رخسانہ اور زکیہ) کا نوحہ ہے جن کی زندگی تیزاب میں گھول دی گئی۔ اس ڈاکیومنٹری میں ان تیزاب کا شکار ہونے والی عورتوں کا علاج اُن کے معالج پاکستانی نژاد برطانوی ڈاکٹر محمد جواد کی اُن عورتوں کو زمانے کے آئینے کے سامنے کھڑا کرنے کی کوشش اور ان عورتوں پر تیزاب پھینکنے والے مردوں کے خلاف معاشرے اور عدالت میں آواز اٹھانی، کیس لڑتی راولپنڈی کی وکیل ذکیہ کی جدوجہد بھی موجود ہے جس کا حاصل مجرم کا جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا ہے۔ اس فلم کی شوٹنگ اسلام آباد، راولپنڈی اور جنوبی پنجاب کے بہت سے مضافاتی مقامات پر کی گئی۔ یہ فلم سب سے پہلے امریکہ میں ریلیز کی گئی تھی اور اکتوبر 2011ء میں آسکر کے لیے نامزد ہوئی۔ اس ایوارڈ والی نامزدگی اور پھر ایوارڈ کے حصول سے پہلے شرمین اور خاصے اہم ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں۔ ان میں انٹرنیشنل ایمی ایوارڈ، یونائٹڈ ایوارڈ فار ہیومن رائٹس، ساؤتھ ایشین ایسوسی ایشن ایوارڈ، ون ورلڈ میڈیا ایوارڈ، ٹرانسٹ آف دی ایئر ایوارڈ، ایکسکوڈ ڈیوپونٹ ایوارڈ کے علاوہ سنے گولڈن ایگل ایوارڈ بھی شامل ہیں۔

اپنی اس کامیابی پر شرمین کہتی ہیں۔ "ایک مرد اپنے غصے، نفرت اور انتقام میں عورت کے چہرے پر تیزاب پھینکنے میں ایک لمحہ لگاتا ہے لیکن وہ تیزاب کا شکار عورت ساری زندگی اس عذاب کو جھیلتی ہے۔ اس موضوع کو ڈاکیومنٹری "سیونگ فیس" کی شکل دینے میں ہمیں تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ لگا۔ ہم نے اس پر بہت محنت کی۔ ہمیں اس کام کے حوالے سے یہ امید تو یقینی طور پر تھی کہ "سیونگ فیس" کو بین الاقوامی پلیٹ فارم پر بہت زیادہ Acknowledgement حاصل ہوگی لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ آسکر کے لیے نامزد ہی نہیں، ایوارڈ بھی حاصل کرے گی۔"

شرمین ایک اچھی پروڈیوسر اور ڈائریکٹر ہی نہیں، ایک منفرد سوچ اور خیال رکھنے والی کہانی کار بھی ہیں۔ تقریباً چودہ، پندرہ برس کی عمر میں پہلی کہانی لکھنے والی شرمین اس کام کے حوالے سے کہتی ہیں۔

"میں اپنی کہانی کے لیے اُن موضوعات کا انتخاب کرتی ہوں جن کی طرف اور لکھنے والوں کی نظر نہیں جاتی ہے۔"

شرمین عبید چنائے اپنے کام کے حوالے سے ایک خاص نام "آسکر کے حصول کے بعد بہت خاص کا درجہ حاصل کرنے والی شرمین عام زندگی میں ایک عام ہی سی عورت کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ شادی شدہ زندگی کی حامل شرمین ایک اچھی بیٹی، بہو ہونے کے علاوہ ایک پیاری سی بیٹی تقریباً ڈیڑھ، دو سالہ امیلیا کی ماں بھی ہیں۔ اپنی تمام تر مصروفیات میں سے بھی وقت نکال کر گھر کا سودا خود لانے اور پکانے کی شوقین شرمین کو اس فلم کی دنیا سے رشتہ جوڑے تقریباً گیارہ برس کا عرصہ ہو رہا ہے۔ اس دوران میں بہت سے ایسے مقام آئے جب شرمین کے کام کو وہ مقام اور اہمیت نہ دی گئی جس کے لیے وہ اور اُن کا کام deserve کرتا تھا لیکن شرمین نے بہت حوصلے، ہمت، ذہانت اور مستقل مزاجی سے اپنا سفر جاری رکھا ہے اور یہ "سیونگ فیس" کا آسکر حاصل کرنا اسی کا رمسلسل کا Reward ہے۔

موجودہ وقت میں ہمارے پیارے ملک پاکستان کے چہرے کو بے شمار لوگ ہیں جو داغدار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، کرپشن، دہشت گردی، مذہبی انتہاپسندی اور خواتین کے ساتھ غیر انسانی سلوک..... ان داغوں کے درمیان اس داغدار چہرے پر عزت اور کامیابی کا یہ نشان بہت "اہم" ہے۔ اہمیت کے اس احساس پر دل کی گہرائیوں سے

Thanks to Sharmeen!

www.pdfbooksfree.pk

2 خصوصی کہانیاں اپنے موضوع اور خیال کے اعتبار سے منفرد اور مختلف سچی کہانیاں

محمد رضوان قیوم

ازکار رفتہ پھول

صفیہ سلطانہ مغل کا خیال

شبِ گل جب میرے خرابے کا مقدر ٹھہری
میں نے چاند تاروں سے ضیاء مانگی تھی

بر ہنہ پا زیست کی پُر خار راہ پر چلنے والی ایک باحوصلہ عورت کا قصہ خاص

یہ کہانی مجھے جن پچاسی سالہ بزرگ خاتون شائستہ بیگم نے سنائی ہے' وہ شدید بیماری کے عالم میں بستر سے لگی ہوئی ہیں۔ اپنی کہانی سناتے ہوئے نقاہت کی وجہ سے اُن کی آواز خاصی مدہم تھی اس لیے میں نے اپنے کان اُن کے لبوں کے بہت قریب کرکے کہانی سنی اور لکھی ہے۔ قارئین گرامی اس کہانی میں بیان کردہ معلومات اور کرداروں کے نام سننے میں اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کیجیے گا۔ شائستہ بیگم نے اپنی کہانی کا آغاز کچھ یوں کیا تھا۔

''میں موجودہ بھارت کے شہر امرتسر کے ایک مضافاتی گاؤں بھوند میں ایک ایسے غریب خاندان میں پیدا ہوئی جہاں کی معاشی حالت انتہائی ہلاکت بہ تھی۔ میرا باپ نورو بس اڈے پر لیموں کی 'نمبو' سنتو اور دیگر مشروبات کی ریڑھی لگایا کرتا تھا یوں وہ گرمیوں میں تو گزارہ لائق مزدوری کر لیتا تھا لیکن سردیوں میں اس کے کام کی ٹھنڈ ہمارے گھر کے چولہے پر بھی پڑتی تھی یعنی گھر میں بھوک ہی بھوک منڈلاتی تھی۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ گھر میں میرے علاوہ ایک بھائی تو صیف بھی تھا۔ ہمیں جب بھوک ستاتی تو مجبوراً ہم بہن بھائی گاؤں کے ہندو' سکھ گھروں میں جا کر کھانے اور پیسوں کی بھیک مانگا کرتے تھے۔ کبھی کسی جگہ سے ایک آدھ پیسہ اور بچا کھچا کھانا مل جاتا تو کسی جگہ سے دھتکے ملتے تھے۔

اُس گاؤں میں مسلمانوں کے چند ہی گھرانے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ سارے کے سارے ہماری طرح کے بھکاری ہی تھے۔ ان میں سے زیادہ تر ہندو' سکھوں کے ہاں خاصی ذلت والی نوکریاں کیا کرتے تھے۔ خبر' قصہ مختصر یہ کہ ایک تو ہم پہلے ہی انتہائی غربت کے نہایت کٹھن حالات سے گزر رہے تھے کہ اچانک میرا باپ ایک ہندو جاگیردار پرکاش سندر کی حویلی کی چھت پر بھاری آہنی پیڈسٹل فین



لے جاتے ہوئے اوپری سیڑھی پر سے پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے مر گیا تھا..... ابا کی موت کی خبر سن کر اماں' میں اور بھائی روتے پیٹتے پرکاش سندر کی حویلی پہنچے تو وہاں اُن کی میت حویلی کے باہر خون میں لتھڑی ہوئی پڑی تھی جس کے گرد گاؤں کے اکثر دیہاتی' ہندو' سکھ کھڑے تھے۔ اُن میں اکا دکا مسلمان بھی تھے۔ اماں تو ابا کی میت دیکھتے ہی گر کر بے ہوش ہوگئی تھیں جبکہ میں اور تو صیف' ابا کی لاش سے چمٹ کے رو رو کر ہلکان ہونے لگے تھے کہ وہاں کھڑے گاؤں کے واحد مطب کے حکیم جی بولے تھے۔ ''کم از کم ٹھاکر یا حویلی کے کسی اور فرد کو تو اس موقع پر یہاں مرنے والے کی بیوہ اور بچوں کی دلجوئی کے لیے ہونا چاہیے تھا۔ ارے' یہ بڑے لوگ ہیں' انہیں کسی غریب مزدور کے مرنے کا کیا درد؟ بچو.....! صبر کرو۔ اللہ بہتر کرے گا۔''

اماں کے چہرے پر ٹھنڈا پانی ڈال کر انہیں ہوش میں لایا گیا اور ہم روتے پیٹتے گھر پہنچے۔ تھوڑی دیر بعد ابا کی میت گھر کے باہر کاٹھ کی چارپائی پر رکھ دی گئی کیونکہ آنگن میں اتنی جگہ نہ تھی۔ گھر کے اندر ہم بہن بھائی ایک دوسرے سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ ماں اپنے سر پر پٹی باندھے بین کر رہی تھی کہ اب ہمارا سہارا کون بنے گا؟ تم ہمیں کس کے سہارے چھوڑ گئے ہو؟ اماں کی اس آہ وزاری کی وجہ سے ہمارا دل اور تڑپ جاتا اور ہم اور زور زور سے رونے لگتے۔

ابھی ابا کی میت گھر کے باہر ہی رکھی ہوئی تھی کہ ہمارے گھر میں پرکاش سندر اُس کے تین چار نوکر اور اس کا بیٹا مرلی پرکاش آئے' روتی ماں نے اُن کا چہرہ دیکھا تو چلاتے ہوئے کہا۔

''کاش میرا مجبور غریب خاوند تمہاری حویلی میں

www.pdfbooksfree.pk

آج بھوک پیاس سے مجبور ہو کر مزدوری کے لیے نہ جاتا۔ دیکھو آج اس کے مرنے سے ہم سب بے آسرا اور میرے بچے یتیم ہو گئے ہیں۔"

پڑوس کی ایک بوڑھی عورت نے کہا کہ یہ بے چاری بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی ہے۔

"مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے کہ یہ بے چارہ غریب اتنی دردناک موت مرا لیکن میرے نورو کمرمودے جملے نے مجھے بتایا ہے کہ نورو اپنی غلطی کی وجہ سے مرا ہے۔ اس نے چاہا نورو کو کہا تھا کہ وہ اتنا بھاری پنکھا اکیلا نہ اٹھائے لیکن وہ نہ مانا' کہنے لگا کہ مجھے جلدی ہے' میں نے مزدوری کے پیسوں سے بیوی بچوں کے لیے کھانے پکانے کا سامان لے کر جانا ہے۔ بہرحال اب ان باتوں کا کیا فائدہ کہ کیسے مرا' کیوں مرا؟" پرکاش سندر نے اپنی بھاری اور بارعب آواز میں کہا پھر اس نے اپنے منشی پریم سنگھ کے ہاتھوں میں 100 روپے رکھتے ہوئے کہا۔ "اس رقم سے نورو کی تدفین اور میت میں آنے والوں کی روٹی پانی کا انتظام کر دینا اور ہاں' تو نے اس جنازہ میں میری موجودگی کا احساس دلانا ہے۔ مجھے آج ضروری کام کے سلسلہ میں لالہ موسیٰ کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لیے جانا ہے۔" اس نے بڑے مغرور انداز میں توصیف اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ بچو.....! پریشان بالکل نہ ہونا' میں واپس آ کر تمہاری گزر بسر کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔ یہ میرا تم لوگوں سے وعدہ ہے۔

شام کے وقت ابا کو گاؤں کے مقامی قبرستان میں دفنا دیا گیا تھا۔

منشی پریم سنگھ نے بڑے اچھے طریقے سے میت میں آنے والوں کو کھانا کھلایا۔ سچی بات ہے کہ اس روز ہم نے زندگی میں پہلی بار اتنا اچھا کھانا پیٹ بھر کر کھایا تھا۔ ہم نے خوب جی بھر کے گوشت اور زردے سے اپنے آپ کو سیر کیا۔ اس دوران محلے اور پڑوس کے ہندو' سکھ ہمارے گھر تعزیت کے لیے آتے رہے۔ ادھیر پریم سنگھ تین روز تک ہماری خبر گیری کرتا رہا۔ اس نے جاتے وقت اماں کے ہاتھ پر پرکاش سندر کی جانب سے دیئے گئے 100 روپے میں سے بقیہ 40 روپے رکھ دیئے اور جاتے ہوئے کہہ گیا کہ وہ کسی مسئلے کے لیے یا کسی ضرورت کے لیے بلا جھجک حویلی آ سکتی ہے۔

منشی پریم سنگھ کی جانب سے دیئے گئے روپے چند دنوں میں ہی کافور کی طرح خرچ ہو گئے جیسے وہ تھے ہی نہیں۔ گھر میں ایک بار پھر بھوک افلاس نے اپنا ڈیرہ جما لیا۔ اب ہمارے گھر میں نہ کڑوی روٹی کی صورت میں پلاؤ' قورمہ آ رہا تھا اور نہ ہی کوئی پاس پڑوس سے ہم پر ترس کھا کر دال سبزی کا پیالہ دے رہا تھا۔

"ہائے اماں.....! بھوک لگی ہے اماں.....!

بھوک سے میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔" توصیف نے واویلا شروع کر دیا تھا۔ اماں پریشان نگاہوں سے ہونٹوں کی طرح ہمیں دیکھتے ہوئے خاموشی سے روئے جا رہی تھی۔ بالآخر مجبوراً بھائی اور میں فوری طور پر مؤذن حکیم الدین کے پاس گئے۔ اسے اپنے خاندان کی بھوک افلاس کے بارے میں بتایا تو اس نے ہمیں اپنے حجرے میں اردگرد کے مسلمانوں کے گھروں سے آئے مختلف کھانوں کے پیالوں میں سے آیا ہوا ایک پیالہ اٹھا کر ہمیں دیا اور کہا۔ "تم روزانہ آ جایا کرو اور کھانا لے جایا کرو۔" ہم خوشی خوشی خیرات کا یہ کھانا گھر لے آئے اور اس طرح اپنا پیٹ بھرا۔

شام کو مؤذن حاجی حکیم خصوصی طور پر اپنے بالوں اور داڑھی پر خضاب لگائے' صاف ستھرے کپڑے پہن کر ہمارے گھر آیا۔ اس نے پہلے ہم

سب بچوں کو پیسے اور ٹافیاں دیں۔

تھوڑی دیر بعد اس نے اماں کو اپنے پاس بلا کر کہا۔ "تم کب تک دربدر پھر کر اور بھیک مانگ کر اپنا گزارہ کرو گی؟ کسی ایسے شریف انسان سے نکاح کیوں نہیں کر لیتی جو نہ صرف تیرے بچوں کو پیٹ بھر کر روٹی کھلائے اور تو سہاگن بھی بن جائے۔ دیکھ بیوہ کی اس معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

"شرم کر' میں تیری بیٹی کی طرح ہوں' تیری پہلے بھی اس گاؤں اور شہر میں تین بیویاں موجود ہیں اور تو نے انہیں کس عذاب میں رکھا ہوا ہے' سب جانتے ہیں۔" اماں نے اسے لتاڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا جی' میں نے تو تیرے فائدے کے لیے ایک مشورہ دیا تھا' آگے تیری مرضی ہے' لیکن سوچ لے' اگر تو مجھ سے نکاح کر لے تو انشاء اللہ' تیرے بچے اور تو کبھی بھوکے نہیں رہیں گے کیونکہ اللہ کے کرم سے میرے حجرے میں دیسی گھی کا تڑکا لگی دالوں' چوغے کو گوشت کی بوٹیوں سے بھرے پیالے آتے ہیں اور ساتھ ہی مسجد کے ساتھ میری رہائش بھی ہے۔" اس کی ان باتوں کے جواب میں اماں نے اسے لعن طعن کر کے باہر نکال دیا تھا۔

دوسرے دن جب ہمیں کسی نے پوچھا تک نہیں' گھر میں بھوک نے اپنا ڈیرہ ڈالا تو اماں نے مجھے کہا کہ چل' منشی پریم سنگھ کے پاس حویلی میں چلتے ہیں۔ ویسے بھی اس نے کہا تھا کہ اگر کوئی پریشانی ہو یا بھوک ستائے تو آ جانا۔

اماں اور میں جب حویلی پہنچے تو اتفاق سے منشی پریم سنگھ نے ہی دروازہ کھولا۔ اس نے اماں اور مجھے دیکھا تو ہمیں اپنے ایک چھوٹے سے کمرے میں بٹھا کر کہا کہ میں ابھی ٹھاکر پرکاش سندر کو بلا کر لاتا ہوں پھر وہ جیسا حکم کریں گے' میں ویسا ہی کروں گا کیونکہ میں تو خود ان کا ملازم ہوں اور ان کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہی جملا مودا جھوٹا کر کے ساتھ ہمارے گھر آیا تھا۔ وہ اپنی رال ٹپکاتا ہوا اوٹ پٹانگ باتیں کرتا کمرے میں آ گیا۔ وہ نیم پاگلوں کی طرح الٹی سیدھی حرکتیں کرتا نہ جانے منہ میں کیا کیا بڑبڑا رہا تھا جس کی کچھ سمجھ آ رہی تھی اور کچھ نہیں لیکن اس کا مطلب سمجھ آ جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد منشی پریم سنگھ آیا' اس نے کہا کہ ٹھاکر صاحب اس وقت حویلی سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ تم ایسا کرو کہ فی الحال دو روپے مجھ سے لے لو اور اپنا گھر جان پان کرو۔

"منشی صاحب' یہ ہمارے مہمان ہیں' ان کی کچھ سیوا کرو۔" جملے نے ناک میں بولتے ہوئے چمیٹوں کی طرح کہا۔

"تو چپ کر اور نکل یہاں سے۔" منشی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"یہ کون ہے؟" اماں نے منشی سے پوچھا۔

"یہ ٹھاکر صاحب نے اپنے گلے میں مندر کا گھنٹہ باندھا ہوا ہے جو ہر وقت بجتا رہتا ہے۔" وہ کمرے سے چلا گیا تو منشی نے مزید بتایا۔ "درحقیقت یہ اس حویلی کا کھلونہ ہے' یہ سب کو ہنساتا ہے۔"

"یہ آیا کہاں سے ہے؟"

اماں نے جب منشی سے سوال پوچھا تو اس نے مسکرا کر کہا۔ "یہ میں نہیں بتا سکتا۔" وہ مسکراتا رہا۔ اس نے اس سوال کا جواب نہ دیا تھا پھر اس نے ہمیں کہا کہ تم کل یہاں آنا' میرا وعدہ ہے کہ میں ٹھاکر پرکاش سندر سے کہہ کر تمہاری مالی امداد کا بندوبست کروا دوں گا۔

اگلی صبح منشی اور ٹھاکر خود ہی ہمارے گھر آ گئے۔ ٹھاکر نے آتے ہی کہا۔ "ہماری حویلی میں نورو کی موت واقع ہوئی ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم

www.pdfbooksfree.pk

تمہیں بے آسرا' بھوکا پیاسا نہ چھوڑیں۔" اس نے اماں کو کہا۔ "تو اس سڑی بدبودار کوٹھری کو چھوڑ کر میری حویلی میں آجا۔ میں تجھے نہ صرف رہائش دوں گا بلکہ نوکری کی شکل میں تیرا مستقل روزگار بھی لگا دوں گا۔" ٹھاکر نے 50 روپے اماں کو دیئے۔ "شام کو نہا دھو کر' اچھے کپڑے پہن کر حویلی خالی ہاتھ آ جانا۔ وہاں بھگوان کا دیا' سب کچھ ہے۔"

شام کو جب ہم سب گھر والے ٹھاکر کی حویلی کی طرف جانے لگے تو ایک ہندو پڑوسن نے طنز کرتے ہوئے کہا تھا۔ "تم لوگ اس شخص کی حویلی میں جا رہے ہو جس نے نورو کی میت حویلی کی حد سے باہر لاوارثوں کی طرح پھینک دی تھی۔ ٹھاکر اچھا انسان نہیں ہے' تم وہاں جا کر پچھتاؤ گے۔"

اماں نے جواباً کہا۔ "تو ہم لوگوں سے جل رہی ہے۔"

ہم جب حویلی کے دروازے پر پہنچے تو منشی نے ہمیں اپنے اس کمرے میں بڑی عزت سے بٹھایا جہاں ہم پہلے بھی آئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ٹھاکر اندر کمرے میں آیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک تو شریف لگ رہا تھا جبکہ دوسرا آدمی لمبے قد' بڑی بڑی مونچھوں والا اور چہرے ہی سے سخت اور بدمعاش لگ رہا تھا۔ ٹھاکر نے آتے ہی کہا۔

"تم نے میری بات مان کر اچھا کیا ہے۔ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ ہاں ٹھاکر بیرم کمار یہ نورو کی بیوہ اور اس کے بچے ہیں۔" ٹھاکر نے اپنے چھوٹے بھائی سے مخاطب ہو کر کہا پھر دوسرے کا تعارف کروایا۔ "یہ میرا اسسٹنٹ ہے۔ ہاں بھئی سندر' تو نے ان کو حویلی میں بلا تو لیا ہے' اب بتلا' اس یتیم کا کرنا کیا ہے؟ بس ان سب کو حویلی کے مختلف کاموں میں لگانا ہے۔ نورو کی بہو اندر حویلی کی صفائی کرے گی جبکہ یہ لڑکی .....کیا نام ہے تیرا؟"

"جی شانتہ!" میں نے شرما کر کہا۔

"ارے' شرماتی کیوں ہے؟ زور سے بات کیا کر۔" بیرم کمار نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "چھوکرے کو کس کے حوالے کریں؟"

"اسے فی الحال چھوڑو۔"

اتنے میں جھلا مودا آیا' اس نے وہی دیوانگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ میرا بھی ان سے تعارف کروادیں۔

"ہاں' یہ مودا صاحب ہیں' اس حویلی کے چھوٹے ٹھاکر ہیں۔" پرکاش سندر نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر صاحب' آپ ایسا کریں کو فوری طور پر باورچی خانے میں جا کر آٹے کی بوریاں ڈبوں میں ڈالیں اور بعد میں گھوڑے پر کاٹھی ڈال کر تانگہ تیار کریں۔ مجھے تیرے ساتھ راجوری گاؤں جانا ہے۔ ہاں تو بچی شانتہ کو بڑی بیگم کے پاؤں دبانے' خدمت کرنے کے لیے رکھ لیتے ہیں۔"

ہمیں حویلی کے اندر لے جایا گیا' وہاں کی دنیا ہی کچھ اور تھی۔ وہ حویلی بڑی شان و شوکت والی تھی' داخلی دروازہ انتہائی مضبوط تھا' اس کے پیچھے لوہے کا ایک اور دروازہ تھا۔ اس کے بعد بارہ دالان تھے اور پھر تین چار بڑے بڑے کمرے تھے۔ پہلے کمرے میں ایک نوجوان لڑکی موجود تھی۔

"یہ چھوٹی ٹھاکرانی سریشہ دیوی ہیں۔" ٹھاکر نے بتایا۔

اس نے ہمیں دیکھ کر اپنی ناک پر رومال رکھ لیا۔ دوسرے کمرے میں ایک ادھیڑ عمر کی اپاہج عورت موجود تھی جس کی ٹانگیں ایک آہنی اسٹینڈ سے بندھی ہوئی تھیں جس طرح آج کل گلوکوز لگانے والا اسٹینڈ ہوتا ہے۔ اس کے قریب ٹھاکر ہمیں لے کر گئے تو انہوں نے ان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "یہ شانتہ تیری خدمت کرے گی۔ او لڑکی..... تو نے بڑی ٹھاکرائن کی روزانہ ٹانگیں دبانی ہیں اور ان کی خدمت کرنی ہے۔" مودا حملہ ساتھ ساتھ تھا' اس نے چپکے سے میرے کان میں کہا۔

"ٹھاکرائن کو یہاں پوچھتا کوئی نہیں ہے اور ان کی ٹانگ ٹوٹ چکی ہے۔"

"تو چپ کر۔" ٹھاکر نے اس کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "دفع ہو یہاں سے' اس سائیس نے تو ہمیں بہت تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ لگتا ہے' اس کا کوئی علاج کرنا پڑے گا۔"

اس حویلی میں بیرم کمار کی پتنیوں سے بھی تعارف کروایا گیا۔ ان کی تعداد دو تین کے قریب تھی اور اس کے علاوہ دونوں بھائیوں کے ان کی مختلف بیویوں سے چھوٹے بڑے کافی بچے تھے۔ وہ سب مل جل کر تھے اور ان کو اپنے امیر ہونے کا غرور شدت سے تھا۔ وہ اپنے نوکروں کو کبھی منہ نہ لگاتے تھے۔ حویلی کا کھلونہ مودا حملہ تھا۔ حویلی کی عورتیں اور بچے اس کی اوٹ پٹانگ حرکتوں سے بہت محظوظ ہوتے تھے۔ بعض دفعہ وہ ایسی ایسی ہنسنے والی باتیں کرتا تھا کہ ہمیں خود بھی ہنسی آجاتی تھی۔ وہ کبھی بندر بن کر اچھل کود کرتا اور کبھی گھوڑا بن کر بچوں کو پیٹھ پر سوار کرواتا۔ اگر حویلی کے سب چھوٹے بڑے اسے زیادہ تنگ کرتے تو وہ جل بھن کر گندی گندی گالیاں دیتا تھا۔

ہمیں اس حویلی کے سرونٹ کوارٹر میں چھوٹے چھوٹے دو کمروں پر مشتمل معمولی سہولت والا کوارٹر دے دیا گیا۔ اس سرونٹ کوارٹر میں ہم تینوں خوشی خوشی زندگی گزارنے لگے۔ اماں اور میں حویلی کی چاکری کے بعد جب اپنے کوارٹر میں آتے تو رات گئے تک ہم جاگ کر خوب باتیں کرتے۔ اماں کا خیال تھا کہ اس حویلی میں سب باسیوں کا مزاج سخت اور مغرور ہے۔

"بس منشی پریم سنگھ اور بڑی ٹھاکرائن نورتی خوش اخلاق ہیں لیکن اماں' وہ مجھ سے سارا دن ٹانگیں اور سر دبواتی رہتی ہیں۔ وہ مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی۔ وہ مجھے ذرا سا آرام بھی نہیں کرنے دیتی۔ ان کے کام سے فارغ ہوتی ہوں تو چھوٹی ٹھاکرائن مجھ سے اپنا کمرہ صاف کرواتی ہیں۔"

"بھئی' کیا کریں' جب زندگی گزارنی ہے تو محنت مزدوری میں نخرہ کیسا' یہ تو سب برداشت کرنا ہی پڑے گا۔"

ٹھاکر دن بھر کانگریس کے جلسوں میں مصروف رہتے تھے۔ ان کی حویلی میں آئے دن میٹنگ وغیرہ ہوتی رہتی تھی۔ ان میٹنگوں کے اجلاس میں شریک ہندو سکھ بعد میں مودے جملے کو اپنے پاس تفریح کے لیے بلا لیتے تھے۔ وہ سب کے سامنے مسلم لیگ اور کانگریس کے لیڈروں کی نقلیں اتار کر ان کو ہنسایا کرتا تھا۔ سب لوگ اسے تنگ کرتے تھے۔

منشی پریم سنگھ اکثر ہمارے کوارٹر میں آ کر ہمارا حال احوال پوچھتا اور خوب باتیں کیا کرتا تھا۔ اب وہ بالکل گھر کا بندہ بن گیا تھا۔ وہ بلا جھجک' بغیر کسی روک ٹوک کے ہمارے کوارٹر میں آتا تھا۔ ہم دونوں بہن بھائی ان کو پریم چاچا کہا کرتے تھے۔ اماں بہت خوش رہنے لگی تھیں' اُن کی شکل دیکھ کر ایسا لگتا جیسے وہ ابا کی موت کا غم بھلا چکی ہیں۔

ایک دن اماں نے منشی پریم سنگھ سے کہا۔ "آپ سے جب میں نے پہلی ملاقات میں پوچھا تھا کہ یہ جھلا مودا کون ہے؟ تو آپ نے پوری بات نہیں بتائی تھی۔"

منشی نے کہا۔ "یہ جھلا مودا درحقیقت شری یادو یعنی ٹھاکر پرکاش سندر کے باپ کی رکھیل کا بیٹا

www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ ٹھاکر صاحب نے بعد میں اسے قتل کروا دیا تھا لیکن اس کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام محمود رکھا گیا جو کہ بعد میں موہا کے نام سے پکارا جانے لگا' اس کے بارے میں شری یادیو رام کہتے تھے کہ جب سے یہ جھلا پیدا ہوا ہے' اس دن سے ان کے دیرینہ مسائل حل ہو گئے ہیں۔ اس پر شاید کسی سائے نے قبضہ کیا ہوا ہے اس لیے انہوں نے اس کی مسلمان ماں کو قتل کروا دیا لیکن اسے اپنا کام کا سمجھ کر زندہ رکھا۔ وہ تو مر گئے لیکن یہ بڑا ہو کر اب تمام حویلی کا کھلونا بن گیا ہے۔ یہ بے چارہ ناجائز ہونے کی وجہ سے نہ تو بڑے بھائی کا رتبہ پا سکا اور نہ ہی چھوٹے بچوں کی طرف سے اس کو چچا ہونے کا شرف حاصل ہو سکا لیکن یہ باتیں تم اس حویلی میں کسی کو نہ بتانا۔ اگر تم نے میری یہ بات ان کے سامنے کر دی تو ٹھاکر صاحب میری ہڈیاں توڑ دیں گے۔''

مودہ جھلا سارا دن حویلی کے اندر رہنے والے باسیوں کا خونی رشتہ دار ہونے کے باوجود ان کی چاکری کیا کرتا تھا۔ بعض دفعہ تو اس حویلی کے رہنے والے اس سے اتنا تذلیل والا کام لیتے تھے کہ جسے دیکھ کر ہمیں بھی گھن آتی تھی۔ بیرم کمار اس سے اپنے مقبل میں بندھے گھوڑوں' کتوں کی لید اور فضلہ اٹھوایا کرتا تھا۔ ان کو نہلوایا کرتا تھا۔

حویلی کا ماحول انتہائی بے باک' فحش قسم کا تھا' چھوٹی بڑی ٹھاکرانیاں اپنے دیوروں سے آپس میں انتہائی ننگی اور مردانہ گالیوں سے بات کرتی تھیں۔ یہ بات بھی ہم نے دیکھی تھی کہ یہ لوگ آپس میں ایسی حرکات کرتے کہ انہیں شرم نہ آتی بالخصوص مرلی پرکاش اپنی جوان سوتیلی ماں کے ساتھ اس طرح بات کرتا تھا جیسے وہ اس کا سوتیلا بیٹا نہیں' کوئی عاشق ہو۔

حویلی کے تمام مرد ہر وقت شراب کے نشے میں دھت رہتے تھے۔ بیرم کمار' مرلی پرکاش کی نظریں حویلی میں کام کاج کرنے والی عورتوں کے جسموں کا طواف کرتی رہتی تھیں۔ وہ بظاہر ہمیں تو کچھ نہ کہتے تھے لیکن ان کی نگاہوں اور باتوں سے ہمیں ان کے اندر چھپے ہوس بھرے شیطان کی بو صاف محسوس ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ منشی پریم سنگھ جب بھی ہمارے کوارٹر میں آتا تو ماں سے بے موقع الٹی سیدھی فحش گفتگو کرتا تھا۔ ماں اسے ہوں ہاں کر کے ہر ممکن ٹالنے کی کوشش کرتی تھی۔ یہ صورتِ حال ہمارے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھی۔

میں اور ماں سارا دن حویلی کی چاکری کرتے تھے حالانکہ ٹھاکر پرکاش سندر نے مجھے اپنی بڑی بیوی ٹھاکرانی نورتی کی خدمت کے لیے رکھا تھا لیکن سریشٹہ دیوی مجھ سے اپنا جسم دبواتی تھی۔ میں جب انہیں دباتی تو وہ بار بار مجھے کہتی تھی کہ اور زور زور سے دبا' کیا تیرے اندر دم نہیں ہے؟ ان سے فارغ ہوتی تو پھر حویلی کی کوئی نہ کوئی عورت مجھے بلا کر مجھ سے خدمت لیتی۔ ان کے اندر رحم نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ٹھاکرانی نورتی کو نہ جانے کون سی ایسی بیماری تھی کہ اس کا علاج کوئی حکیم طبیب نہ کر پا رہا تھا۔ وہ بمشکل چل پاتی تھی۔ اسے ٹھاکر پرکاش سندر بھی گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ وہ پرکاش سندر کی عدم توجہ کے باعث بہت بے زار تھی۔ میں جب ان کی خدمت کرتی تو وہ مجھ سے خوش ہو جاتی تھیں اور اکثر کہتی تھیں۔ ''تمہیں کبھی موقع ملے تو فوراً یہاں سے بھاگ جانا۔''

میں ان سے پوچھتی۔ ''کیوں؟'' لیکن وہ اس کا جواب نہیں دیا کرتی تھیں۔

ایک دن میں نے ایک بڑی عجیب تبدیلی ماں میں محسوس کی جس سے مجھے تشویش ہوئی' وہ یہ تھی کہ ماں کا پیٹ معمول سے ہٹ کر پھول رہا تھا۔ اس کو شاید تو صیف نے بھی محسوس کیا تھا۔ ماں سارا دن سیب' شہتوت اور نت نئے میوے کھاتی رہتی تھی۔ وہ ہمیں بھی دیتی تھی۔ میں نے ایک بار اس سے تشویش بھرے انداز میں پوچھا تو اس نے مجھے کہا کہ اسے پیٹ کے گولے کی بیماری لاحق ہو گئی ہے اور وہ جلد شہر میں بڑے ہسپتال جا کر اسے دکھلائے گی۔ اسے ہنگے فروٹ' میوے نہ جانے کون دیتا تھا؟

ایک دن موہا جھلا ہمارے کوارٹر میں آیا۔ اتفاق سے میں اور تو صیف موجود تھے۔ ماں کوارٹر میں نہیں تھی۔ میں نے اسے ماں کا لایا ہوا سیب دیا تو اس نے مجھے واپس دیتے ہوئے کہا کہ میں تم سے اب سیب نہیں لڈو کھاؤں گا۔

''لڈو کس بات کے؟'' میں نے پوچھا۔

جھلے نے اپنے جھلے والے مخصوص انداز میں کہا کہ تمہارا بھائی جو آنے والا ہے۔

''یہ تو کیا بکواس کر رہا ہے؟'' اس کی بات سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ تو صیف نے بھی اسے غصہ سے ڈانٹا تھا بلکہ اس کے جسم پر دو چار تھپڑ لگا دیئے مگر جھلا تیز تیز بولنے لگا کہ میں تو تم سے لڈو کھاؤں گا' تمہارا بھائی آنے والا ہے۔ یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔

شام ہوئی اور ماں آئی تو میں نے جب ماں کے پیٹ کی جانب دیکھا تو واقعی اس کا پیٹ اس امر کی چغلی کھا رہا تھا کہ اس کے اندر کوئی گناہ پنپ رہا ہے۔ اب میرے سامنے بڑی مشکل یہ تھی کہ میں کس طرح بحیثیت بیٹی' ماں سے یہ بات پوچھوں کہ وہ کس سے اپنا منہ کالا کروا رہی ہے؟ اور کیوں؟

دوسری جانب حویلی کے باسیوں کے وہی طور طریقے تھے جیسا کہ اس کہانی کے شروع میں بیان کیا تھا کہ وہ لوگ عیاشی' فحاشی کی زندگیوں میں گم تھے۔

ایک دن میں نے بڑی ٹھاکرانی کا بدن کوٹنے کے دوران انہیں کریدنے کی کوشش کی۔ ''آپ نے ایک دن مجھے کہا تھا کہ تمہارا بس چلے تو یہاں سے بھاگ جانا' آپ نے ایسا کیوں کہا تھا؟''

وہ خاصی دیر تک خاموش رہیں اور پھر بولیں۔ ''شائستہ یہ حویلی' حویلی نہیں بلکہ ایسا جنگل ہے جہاں انسان نہیں' حیوان بستے ہیں۔ یہاں کوئی کسی کی بیوی نہیں' بس یہ سمجھو کہ سب کچھ.....'' وہ بات کرتے کرتے رک گئیں۔ انہوں نے ادھورا جملہ مکمل کیا۔

''یہاں رشتے صرف نام کے ہیں۔ چل جا' مجھے آرام کرنا ہے۔'' وہ روہانسی تھیں لیکن مجھے ان کی اس بات پر اس لیے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہمیں تو حویلی کے مردوں نے ہاتھ تک نہ لگایا تھا اور دوسری جانب ماں نے بھی اس کی کوئی شکایت نہ کی تھی۔ ہاں' یہ ضرور ہے' مرد بڑی عجیب نظروں سے ہمیں دیکھتے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہ ان کی عادت ہے۔

ایک دن ایسا بھی آیا جب ماں کا پیٹ مکمل طور پر پھول کر واضح نظر آ رہا تھا۔ اب مجھے اور تو صیف کو ہر طرف سے طعنے مل رہے تھے کہ تمہارا بھائی آنے والا ہے۔ حویلی کے کمینوں کے طعنے سن سن کر ہمارے کان پک گئے تھے۔ بالآخر ایک دن جب مجھ سے نہیں رہا گیا تو میں نے ماں کو جھنجوڑ کر کہا کہ بتلاؤ' یہ گناہ تم نے کیوں کیا؟ کون تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کر رہا ہے؟

ماں نے اپنی نگاہیں نیچے کرتے ہوئے کہا۔ ''شائستہ' میں تمہیں یہ بات کل صبح بتاؤں گی کہ میں نے کس مجبوری کے تحت اپنے ضمیر کا سودا کیا ہے۔ بیٹی.....! میں تیری' تو صیف اور اپنے ضمیر کی مجرم ہوں۔ مجھے معاف کر دینا اور ہاں' جتنی جلدی ہو سکے' یہاں سے بھاگ جاؤ۔''

''پر کیوں؟ ہمیں یہاں کیا تکلیف ہے؟ یہاں

www.pdfbooksfree.pk

ہمیں من چاہا کھانا مل رہا ہے رہنے کو ٹھاکر صاحب نے چھت دی ہوئی ہے۔ دیکھا جائے تو ہم جس جھونپڑی میں رہتے تھے وہاں کے رہنے والے ہمارے پڑوسی بدحالی زندگی گزار رہے ہیں۔"

ماں نے روتے ہوئے کہا۔ "بیٹا.....! وہ لوگ بے شک ہم سے برا کھاتے پیتے ہیں اور ہم سے کمتر ہیں لیکن انہوں نے میری طرح اپنی مجبوریوں کا سودا نہیں کیا ہے۔ شائستہ تم جب بڑی ہوگی تو تمہیں معلوم ہوگا کہ انسان بے بسی کے عالم میں اپنی مجبوریاں کیسے بیچتا ہے؟"

"خدا کے لیے ماں.....! مجھے بتا تو نے کس کے آگے اپنی مجبوریوں کا سودا کیا ہے؟ کون ہے اس کا خریدار؟" میں نے روتے ہوئے پوچھا۔

"صبح بتاؤں گی تو بھی سو جا اور مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

میں نے بستر پر پڑے پڑے ماں کی جانب دیکھا' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ مسلسل چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ لگتا تھا' کوئی گہری سوچ اسے سونے نہیں دے رہی تھی۔ نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔

صبح میں گہری نیند میں تھی کہ تنک کر کے کوٹھری کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور پھر اسی لمحے کسی ٹانگے کے چلنے کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ پہلے تو میں گہری نیند میں سمجھی کہ یہ میرے خواب کا حصہ ہے۔ تو صیف بھی گہری نیند سو رہا تھا' وہ بھی اٹھ گیا۔ اس نے بھی گھبرائے ہوئے انداز میں چلاتے ہوئے کہا کہ اماں کسی ٹانگے والے کے ساتھ گئی ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھی۔ میں نے اور تو صیف نے فوراً حویلی کے باہر آ کر محلے میں دیکھا لیکن وہاں تانگہ نہ تھا البتہ تانگے کے پہیوں کے نشان گیلی مٹی پر نمایاں تھے۔ تو صیف' ماں.....! اماں.....! چلاتا ہوا دور تک گیا لیکن مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ اتنی جلدی میں ماں کو پتہ نہیں کس تانگے والے کے ساتھ چلی گئی تھی؟ یہ سوال میں اور تو صیف حیرانگی کے عالم میں ایک دوسرے سے کرنے لگے۔ میں ٹافٹ مودے جھلے کے پاس گئی' اسے میں نے بتایا کہ ماں نہ جانے کس تانگے والے کے ساتھ چلی گئی ہے۔

مودے نے اپنے جھلے پن میں کہا۔ "روتی گھبراتی کیوں ہو؟ لگتا ہے' وہ تیرا بھائی لینے گئی ہے۔"

میں اس وقت چنی طور پر اتنی پریشان تھی کہ میں نے غصے میں اس دیوانے کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ تو صیف نے بھی جھلے کے یہ الفاظ سن لیے تھے۔ اس نے بھی دو چار زوردار کے لاتیں اس بے چارے کی کمر پر دے مارے لیکن وہ بالکل پاگلوں کی طرح تالی بجا کر کہنے لگا۔

"شائستہ آج تو میں تجھ سے مٹھائی کھاؤں گا۔"

میں نے فیصلہ کیا کہ میں بڑی ٹھاکرانی نورتی کو جا کر بتاتی ہوں کہ ماں کسی کے ساتھ چلی گئی ہے لیکن تو صیف نے مجھے کہا کہ بڑے ٹھاکر کو جا کر یہ بات بتاتے ہیں' وہ ہماری مدد کریں گے۔ میں نے اور تو صیف نے حویلی کا بند بڑا داخلی دروازہ زور زور سے بجانا شروع کر دیا۔ صبح صبح کا وقت تھا۔ حویلی کے تمام مکین یقیناً گہری نیند سو رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گزشتہ رات حویلی میں چھوٹی ٹھاکرانی سریشہ دیوی کے بچے کی سالگرہ منائی گئی تھی۔ یہ تقریب رات دیر تک چلی تھی اس لیے حویلی کے مکین رات دیر سے سوئے تھے۔ بار بار دروازہ کھٹکھٹانے کے باوجود حویلی کا دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ میرے اور تو صیف کے ہاتھ اس سوئے دروازے کو کھٹکھٹا کھٹکھٹا کے دکھ گئے تھے۔ مودہ جھلا پیچھے آ گیا۔ اس نے ہم دونوں کو کہا کہ یہ دروازہ ایسے نہیں کھلے گا۔ میں حویلی

مودا خود بخود ہمارے پیچھے حویلی سے باہر نکل کر کھیتوں اور اردگرد گھوم پھر کر ماں کو ڈھونڈنے میں ہماری مدد کرنے لگا۔ محلے کے چند مرد بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔ دن گیارہ بجے تک ماں کا کچھ پتہ نہ چلا تو ہمیں پریشانی اور تشویش لاحق ہوئی۔ وہاں موجود محلے والوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ تمہاری ماں کو ڈھونڈنے میں حویلی کے ٹھاکر کچھ کر سکتے ہیں لیکن یہ ہمت کون کرے کہ ان بے رحم ٹھاکروں سے یہ بات کرے؟ ہم دونوں بہن بھائی بہت زیادہ سہمے ہوئے تھے۔ اماں کو ہر صورت میں ڈھونڈنا تھا۔ ٹھاکروں کے پاس جانے کے سوا اب کوئی چارہ نہ تھا۔ محلے کے ایک بوڑھے ہندو نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ حویلی چلتا ہوں۔ وہ ہندو ہم دونوں کو اپنے ساتھ حویلی میں ٹھاکروں کے پاس لے آیا۔

بیرم کمار اور مرلی ابھی تک نشہ میں دھت سو رہے تھے جبکہ پرکاش سندر اٹھ چکا تھا لیکن وہ ہماری پریشانی سے قطع نظر ایک صوفے پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ہندو جب ہمیں ٹھاکر پرکاش سندر کے پاس لے کر گیا تو اس نے غصہ کرتے ہوئے کہا کہ تم میری نظروں سے دفع ہو جاؤ..... میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

اس ہندو نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "جناب' یہ آپ کے خدمت گار ہیں' یہ دونوں بچے اپنی ماں کی وجہ سے پریشان ہیں۔ آپ سے بنتی ہے کہ بھگوان کے واسطے ان کی کچھ مدد کریں۔"

ٹھاکر رعونت سے اخبار کو لپیٹتے ہوئے صوفے سے اٹھا اور اس نے کہا۔ "الہ تو ایسا کر کہ تھانے دار امرت پچن کو میرا پیغام دے کہ میں نے اسے بلایا ہے۔" تو صیف اور لالہ اس کے پاس پہنچے تو امرت پچن تھانے دار جھٹ سے حویلی میں ٹھاکر کے اندر سوتے ہوئے مُردوں کو اپنے طریقہ سے اٹھاتا ہوں۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' حویلی کے باہر پڑے اینٹوں کے چار پانچ ٹکڑے اٹھائے اور زور زور سے اس دروازے پر مارنا شروع کر دیے۔ میں نے اسے منع بھی کیا تھا کہ اچانک ڈرز ڈرز کی خوفناک آوازوں سے حویلی کے دروازے کھلے۔ حویلی کے اندر سے بیرم کمار' پرکاش سندر' مرلی سخت غصے میں نکلے۔ ٹھاکر پرکاش سندر نے چلا کر کہا۔

"کس نے حویلی کے دروازے پر یوں پاگلوں کی طرح اینٹیں پھینکی ہیں؟"

تو صیف نے روتے ہوئے کہا کہ جی' وہ ہماری اماں نہ جانے کہاں چلی گئی ہے؟

"پہلے یہ بتا کہ تم میں سے کس نے اینٹیں حویلی کے دروازے پر ماری تھیں؟"

"میں نے ماری تھیں بھائی جان....." جھلے نے ناک کے ذریعے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"تم نے ماری تھیں؟" پرکاش سندر اور بیرم کمار نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیے۔ جھلے کے منہ سے خون نکلنے لگا لیکن اس نے اس حالت میں بھی کہا کہ ٹھاکر صاحب' تو صیف اور شائستہ کی ماں نہ جانے کس تانگے والے کے ساتھ چلی گئی ہے۔ ان کی مدد کریں۔

"کمینے..... میں ان کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ آ جائے گی' اس نے جانا کہاں ہے؟ ادھر ہی ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ ہسپتال گئی ہوگی..... کم بخت نے اتنی پی تھی شراب کا سارا نشہ خراب کروا دیا۔ میں تو بڑے مزے سے گہری نیند سو رہا تھا۔" مرلی نے شرابی انداز میں ہچکی لیتے ہوئے کہا۔

ٹھاکروں نے حویلی کے دروازے پھر سے بند کر دیئے' وہاں سے مایوسی ہوئی تو میں نے تو صیف کو کہا کہ ماں کو ہم اپنے طور پر تلاش کرتے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

پرکاش سندر کے روبرو پیش ہوگیا۔اس کے ساتھ چند پولیس اہلکار بھی تھے۔پرکاش سندر نے اسے ماں کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تو تھانے دار نے اسے کہا کہ جیسا حلیہ آپ اس عورت کا بتا رہے ہیں' اس سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ عورت حمل سے تھی' وہ لازماً عمل زچگی کے لیے کسی ہسپتال یا دائی کے پاس گئی ہوگی۔

''وہ تو مجھے بھی پتا ہے کہ وہ حاملہ تھی لیکن میں نے تجھے اس لیے بلایا ہے کہ تو اسے تلاش کر۔''

''اچھا ٹھاکر صاحب.....'' تھانے دار امرت بچن نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

دوپہر بارہ بجے تک دور دراز کے تھانوں' چوہدریوں' ٹھاکروں کو یہ خبر دے دی گئی کہ وہ اپنے اپنے علاقہ میں اس گم شدہ عورت کو تلاش کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ زچگی سے متعلق ہسپتالوں' دائیوں کے ٹھکانوں کو کنگھالا گیا لیکن اماں کا کہیں سراغ نہیں مل سکا تھا۔بالآخر دن دو بجے تھانے دار نے حویلی میں آکر یہ ہولناک خبر سنائی کہ بھوندگاؤں سے دس میل دور سوٹر گاؤں میں ایک عورت کی لاش ملی ہے جبکہ اس کے قریب ایک نوزائیدہ بچہ نیم بے ہوشی کے عالم میں ملا ہے۔ٹھاکر پرکاش سندر' بیرم کمار' نے توصیف اور مودا جب اس گاؤں میں پہنچے تو وہاں ایک جگہ کھیتوں میں اماں کی لاش پڑی ہوئی تھی اور ایک زندہ نوزائیدہ بچے کو ایک دیہاتن نے اپنی گود میں اٹھایا ہوا تھا۔میں اور توصیف' ماں سے لپٹ کر رونے لگے۔

''ہائے..... بے چاری حرام کا بچہ جن کر مر گئی.....'' وہاں کھڑے ایک دیہاتی نے ہمدردی کے انداز میں دل جلا جملہ کہا۔اس علاقہ کا تھانے دار' پولیس اہلکار اور مقامی دیہاتیوں کا ہجوم لاش اور بچے کے گرد حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ان کی طرح طرح کی باتیں ہمارے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔تھانے دار نے مقامی دیہاتیوں سے پوچھا کہ یہ عورت کیسے یہاں پہنچی؟انہوں نے بتایا کہ نہ جانے یہ کہاں سے آئی ہے کیونکہ یہاں صرف یہ مردہ عورت اور بچہ ملا ہے۔انہوں نے مزید بتایا کہ بچوں کا یہاں سے گزر ہوا تو انہوں نے اس عورت کو تڑپتے دیکھا تھا۔اس وقت اس میں جان تھی۔

ٹھاکر بیرم کمار نے تھانے دار سے کہا۔''اگر اس حرام زادی نے حرام کا بچہ جننا تھا تو اتنی دور کیوں آئی؟''

''ہاں' یہ بات تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔''سوٹبر تھانے کے تھانے دار نے کہا اور پھر وہاں کھڑی ایک بوڑھی دیہاتن سے پوچھا۔''کیا اس گاؤں میں کوئی دائی وغیرہ ہے کہ نہیں؟

''ہاں' نجونام کی ایک ایسی دائی موجود ہے جو کہ زانی' فاحشہ عورتوں کے بچے چپکے سے پیدا کرواتی ہے۔''

تھانے دار نے فوری طور پر اپنے دو پولیس اہلکار بھیج کر دائی کو بلوایا۔

نجو دائی شکل وصورت سے ہی حرافہ اور بدقماش لگ رہی تھی۔

تھانے دار نے اس سے سخت لہجہ میں ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔''یہ عورت جو تیرے سامنے پڑی ہوئی ہے تو اسے جانتی ہے؟''نجو خاموش سہمی ہوئی کھڑی رہی' تب تھانے دار نے اسے دھمکی دی اور کہا کہ میں تیری کھال تھانے میں کھنچواؤں گا تو تیرے فرشتے بھی بولیں گے پھر تھانے دار نے بڑی بے رحمی سے اس کی پٹیا پکڑ کر اسے جھنجوڑا۔

''ابے.....اپنے ہاتھوں میں قانون کو نہ لے.....''وہاں کھڑے بیرم سنگھ نے تھانے دار کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔

تھانے دار نے بڑے پرجلال انداز میں چلاتے ہوئے کہا کہ سردار جی' میں کسی قانون کو ہاتھ میں نہیں لے رہا ہوں' میں دراصل' اس کی قانونی مدد کر رہا ہوں۔

''کیسی مدد؟''ٹھاکر پرکاش سندر نے اس سے پوچھا۔

''مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اس نجو دائی نے ہی اس عورت کی زچگی میں مدد کی ہوگی۔''

نجو ابھی تک خاموش بت بنی کھڑی تھی' اس کے ہونٹ خوف سے کپکپا رہے تھے۔

''چلو اوئے.....اس مردہ عورت اور بچے کو تھانے لے کر چلو.....''تھانے دار نے اپنے اہلکاروں کو کہا۔

اماں کی لاش کو بڑی ذلت بھرے انداز میں ایک ہتھ ریڑھے پر رکھا گیا جبکہ بچے کو میری گود میں دے دیا گیا۔نجو جو سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی تھی' اسے تھانے دار نے بڑی کرخت آواز میں گھرکا۔

''تو بھی چل میرے ساتھ تھانے' وہاں میں تیری ہڈیاں توڑتا ہوں۔میرا تجربہ بتلاتا ہے کہ تیرا ہاتھ اس عورت کی نا جائز زچگی میں ضرور ہے۔''

''ارے.....کیوں اپنی ہڈیاں تھانے میں گھوائے گی' کیا کیچ ہے' تھانے دار صاحب کو یہیں بتا دے؟''مجمع میں سے ایک بڈھا بولا۔

نجو فوراً تھانے دار کے پاؤں میں گر کر بولی۔ ''خدا کے واسطے' مجھے تھانے نہ لے کر جاؤ' میں آپ کو سب سچ سچ بتاتی ہوں۔''

''جلدی بک کیا بکنا چاہتی ہے؟ان سب لوگوں کے سامنے بتا تاکہ یہ بھی سنیں۔''

نجو نے وہاں کھڑے کھڑے کہنا شروع کیا۔''اس عورت نے اپنا نام سکھاں بتلایا تھا۔اس نے مجھے کہا تھا کہ میں کسی کا تخم اپنے شکم میں اٹھائے پھر رہی ہوں اور میں نے اسے ضائع کرانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن یہ ضائع نہ ہو سکا لہٰذا اس نے مجھے نوٹوں کا لالچ دے کر کہا تھا کہ میں اس نا جائز بچے کی زچگی میں مدد کروں۔یہ آج صبح میرے پاس آئی تھی۔میں نے اس کے دیئے گئے 200 روپے کی بھاری رقم لے کر اسے ایسی دوائیاں دی تھیں جو کہ زچگی کے عمل کو آسان بناتی ہیں لیکن افسوس' وہ دوائیاں اسے نقصان کر گئیں۔ان دواؤں کا زہر اس کے پیٹ میں پھیل گیا تھا اور میں اسے بچا نہ سکی۔''

''تھانے دار صاحب' نجو دائی نے پچھلے ماہ بھی حرام کو جننے والی ایک فاحشہ عورت کو بارد یا تھا۔''مجمع میں سے نہ جانے کہاں سے آواز آئی تھی۔

''یہی بیان اگر میں نے تھانہ میں جا کر اس سے لیا ہوتا تو تم کہتے کہ میں نے اس سے زبردستی بیان لیا ہے۔''

سوٹبر تھانہ تک ماں کی لاش کو ریڑھے پر لے جایا گیا۔دونوں ٹھاکر مجھے بچے سمیت وہاں لے گئے۔پہلے تو متعلقہ تھانے دار نے نجو کی خوب گھنچائی کی لیکن بعد میں ٹھاکر پرکاش سندر نے تھانے دار کی مٹھی گرم کرتے ہوئے کہا کہ اس کیس کو یہیں ختم کر دے لہٰذا کیس دبا دیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ نجو کی بھی جان بخشی ہوگئی۔

مجھے ماں پر شدید غصہ اور رونا ساتھ ساتھ آرہا تھا۔اسے مردار جانور کی طرح ہتھ ریڑھی پر گاؤں کی جانب لے جایا جا رہا تھا۔توصیف مسلسل سکتہ کے عالم میں ماں کو دیکھے جا رہا تھا۔میں نے اسے رلانے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا سکتہ نہیں ٹوٹا۔میں اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہتا کہ ماں مر گئی ہے لیکن مودا جھلا میری بات یہ کہہ کر کاٹ دیتا تھا کہ آج تو تمہاری خوشی کا دن ہے' تمہارا بھائی کا آیا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

اس کی بات سے وہاں کھڑے تماش بین دیہاتی ہمارا مذاق اڑانے لگتے تھے۔ ماں کے جنازے میں کسی گاؤں والے نے شرکت نہیں کی۔ اسے کھڑا کھودکر جانوروں کی طرح دبادیا گیا۔

شام ہوئی تو ٹھاکر پرکاش بیرم کمار نے ہم دونوں بہن بھائی کو اپنی حویلی کے گیٹ پر روکتے ہوئے کہا۔ ”ٹھاکرانی سریشہ دیوی اور دیگر ٹھاکرانیاں ہمیں اس بات پر زور دے رہی ہیں کہ تم دونوں ایک بدقماش ماں کی اولاد ہو لہٰذا تم دونوں حویلی کے اندر قدم نہیں رکھ سکتے۔“

پرکاش سندر نے حویلی کا دروازہ ہمارے لیے بند کردیا تھا۔ میں اور توصیف شدت غم سے رونے لگے۔ یہ ہمیں کس ناکردہ جرم کی سزا مل رہی تھی؟ اماں نے نہ جانے کس ظالم کا گناہ اپنے شکم میں پال کر اسے جنم دیا تھا؟ اور سزا ہمیں مل رہی تھی۔

مودا جھلا ہم دونوں بہن بھائی کو اپنی کوٹھری نما رہائش میں لے گیا۔ وہاں اس نے ہمیں اپنی کوٹھری کے پچھواڑے میں جگہ دے دی تھی کیونکہ ہمیں ہماری کوٹھری سے بھی بے دخل کرکے وہاں پر تالا ڈال دیا گیا تھا۔ یہ مودے کا ہم پر پہلا احسان تھا کہ اس نے ہماری رہائش کا عارضی بندوبست کردیا تھا۔ وہ پاگل پنے والے انداز میں اپنے طور پر ہماری خدمت بھی کرنے لگا تھا۔ وہ اکثر ہم بہن بھائی کے لیے طرح طرح کی کھانے پینے کی چیزیں لے آتا تھا اور رات دیر تک ہمارے کوارٹر میں بیٹھا دیوانگی میں ایسا الٹا سیدھا بولتا تھا کہ اس کی دس باتوں میں سے ایک بات سمجھ آتی تھی۔

ادھر محلے کے لوگ ہم دونوں بہن بھائی کو کوٹھری کے پاس دیکھتے تو ہم پر آوازے کستے بلکہ کچھ عورتیں مجھے کنواری ماں کہتی تھیں کیونکہ میری ماں کا وہ بچہ میری گود میں ہوتا تھا۔ میں لوگوں کے لیے ایک تماشہ بن گئی تھی۔

ایک دن بعد وہ بچہ انتہائی بیمار ہوگیا تھا۔ وہ روئے جارہا تھا۔ سچی بات ہے وہ مجھ سے سنبھل نہیں رہا تھا۔ مودا اپنی کوٹھری سے چائے کی پتی ابال کر لے آیا تھا۔ اس سے بھی اسے کوئی آرام نہیں آیا تھا۔

رات تو میں نے بڑی مشکل سے گزاری جب صبح ہوئی تو میں نے محلے سے گزر کے لوگوں کی منتیں کرنا شروع کردیں کہ میرا مر رہا ہے۔ خدا کے لیے میری مدد کرو لیکن نہ جانے کیوں ان کے دل پتھر ہوگئے تھے یا پھر وہ ٹھاکروں سے ڈر رہے تھے؟ انہوں نے میری التجا پر کان نہیں دھرے۔ دوپہر کو اتفاق سے محلے کا بندو بوڑھا جو اہر لعل میرے پاس آیا' اسے میں نے اپنا دکھڑا درد کرسنایا اور اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر منتیں کیں کہ خدارا' میرا یہ پیغام کسی طرح بڑی ٹھاکرانی صاحبہ کو پہنچادو کہ میں نے تمہاری دل و جان سے خدمت کی ہے' میں بہت پریشان ہوں' میری گناہ گار ماں کا گناہ (بچہ) مجھ سے اب سنبھل نہیں رہا' میری مدد کرو۔ خوش قسمتی سے جواہر لعل نے اپنی بیوی کے ذریعہ میرا پیغام بڑی ٹھاکرانی تک پہنچایا تھا۔

شام کے وقت نوری ٹھاکرانی حویلی کے دو نوجوان بچوں کے سہارے چلتی ہوئی میرے پاس آئیں۔ انہوں نے جب ہم دونوں بے بس بہن بھائیوں کی حالت دیکھی تو بہت پریشان ہوئیں۔

”مجھے تو بتلایا گیا تھا کہ تم دونوں اپنی خالہ کے پاس پتو کی گاؤں چلے گئے ہو' یہ کیا ماجرا ہے؟“

”بڑی ٹھاکرانی صاحبہ' ہمیں ٹھاکر پرکاش سندر نے کہا تھا کہ آپ نے اور سریشہ دیوی نے حویلی میں ہمارا داخلہ بند کردیا ہے۔“

”یہ سراسر جھوٹ ہے۔ میں تو خود لاچار ہوکر حویلی کے پچھواڑے میں پڑی ہوں۔ حویلی کے ٹھاکروں نے مجھے بوڑھا' لاچار' ناکارہ سمجھ کر ایک طرف مرنے کے لیے پھینک دیا ہے۔ شائستہ تم میرے ساتھ حویلی چلو اور اپنے کوارٹر میں رہو۔ آج آنے دو پرکاش سندر کو میں ان سے نمٹوں گی۔ ماں کے گناہ میں ان بچوں کا کیا قصور ہے؟ چلو شائستہ تم میرے ساتھ آؤ۔“

ابھی ٹھاکرانی مجھ سے یہ باتیں کررہی تھیں کہ پیچھے چھوٹی ٹھاکرانی سریشہ دیوی غصے میں چیختی چلاتی ہوئی آگئی۔ ”یہ ناپاک' گندے لوگ اور خاص طور پر یہ ناجائز بچہ کسی قیمت پر حویلی میں نہیں آئے گا۔“

مودا جھلا پیچھے سے چلایا۔ ”بیگم صاحبہ' یہ ناجائز بچہ حویلی کے اندر ہی کسی کا گناہ معلوم ہوتا ہے۔“

”بکواس بند کر..... دوں گی تیرے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ.....“ سریشہ دیوی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

اب دونوں ٹھاکرانیوں میں بحث شروع ہوگئی تھی۔ بڑی ٹھاکرانی کہتی تھی کہ شائستہ حویلی کے اندر پہلے کی طرح آکر کام کرے گی جبکہ سریشہ دیوی بضد تھی کہ میں کسی قیمت پر بھی ان کے ناپاک قدم اندر نہ آنے دوں گی۔ میں نے سریشہ دیوی کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا کہ ہمارا اس معاملہ میں کیا دوش ہے؟

”تو بکواس بند کر.....“ وہ مجھے مارنے کے لیے دوڑی تو بڑی ٹھاکرانی نے آگے بڑھ کر اسے روک دیا۔ اس جھگڑے کے دوران ٹھاکر پرکاش اور بیرم کمار بھی وہاں آگئے۔

پرکاش کو دیکھتے ہی بڑی ٹھاکرانی نے ان پر چلاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ان بچوں کو حویلی سے دور رکھنے کے لیے سریشہ دیوی کے ساتھ میرا نام کیوں لیا؟“

”میں نے تمہارا نام مصلحتاً لیا تھا' ویسے مجھے سریشہ دیوی اور بیرم کمار نے شائستہ اور توصیف کو حویلی کے اندر قدم رکھنے سے روکا تھا۔ اگر یہ دونوں اپنے ناجائز بھائی کے ساتھ اس حویلی کے اندر قدم رکھتے تو نہ جانے کس کس کی بدنامی ہوتی اور لوگ بلاوجہ باتیں بناتے۔“ پرکاش سندر نے اپنی چھوٹی چچی کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔

”یاد رکھو' یہ حویلی تمہاری نہیں بلکہ میرے باپ کی طرف سے جہیز میں دی ہوئی ہے۔ میں چاہوں تو تمہیں دھکے دے کر اس حویلی سے نکلوا سکتی ہوں۔“

”تو مجھے بلیک میل کررہی ہے۔“ پرکاش نے کہا۔

”میں تجھے خبردار کررہی ہوں کہ یہاں وحشی نہیں' انسان بن کر رہ اور انسانوں کی قدر کرنا سیکھ۔“ بڑی ٹھاکرانی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

سریشہ دیوی پھر اکڑ گئی۔ اس نے ٹھاکر پرکاش سندر سے کہا کہ تم مجھے طلاق دو یا اس بڑی ٹھاکرانی کو فارغ کرو۔ دونوں ٹھاکرانیاں آپس میں لڑنے لگی تھیں۔

ٹھاکر پرکاش سندر اپنی جوان اور بوڑھی بیویوں کے درمیان چکی کے پاٹ کی طرح پس رہا تھا۔ اچانک سریشہ دیوی چلائی۔

”دور کر اس گندگی کے ٹوکرے کو.....“ اس نے میری گود سے بچہ چھین کر زمین پر پٹخنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس بچے کو بڑی مضبوطی سے اپنے سینے سے لگایا ہوا تھا۔ نوری ٹھاکرانی نے ان سب کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اماں کی جانب سے کیے گئے گناہ میں توصیف اور شائستہ کا کیا دوش ہے؟ آخر بڑی مشکل سے یہ فیصلہ ہوا کہ اس ناجائز بچے کو حویلی میں نہیں رکھا جائے گا۔

www.pdfbooksfree.pk

"کیوں.....؟" میں نے چھوٹی ٹھاکرانی سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"گندکو گندگی کے ڈھیر میں پھینکا جاتا ہے' گھر میں سجا کر نہیں رکھا جاتا۔ اس گندگی سے بو پیدا ہوگی۔"

ابھی وہ یہ بات کر رہی تھی کہ گاؤں کے مندر کا ایک پنڈت جس کے گنجے سر پر چوٹی سی انگلی برابر چھپکلی رہتی تھی' وہ حویلی کے دالان میں آیا اور ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہوگیا۔ ٹھاکر پرکاش سندر نے مجھے کہا کہ شائستہ اس بچے کو پنڈت کے حوالے کردے۔

"پر کیوں؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

ٹھاکر نے غصے سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں بہن بھائی اس صورت میں حویلی کے اندر آسکتے ہو جب یہ بچہ تمہارے ساتھ نہ ہو۔ چل دے اسے پنڈت کے ہاتھ میں۔"

نورتی ٹھاکرانی نے بھی مجھے ایسا کرنے کے لیے کہا تو ناچار میں نے بچہ کو پنڈت کی طرف بڑھایا۔

پنڈت نے بچہ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسے چومتے ہوئے بولا۔ "اب یہ ناجائز بچہ گاؤں کے مندر کی صفائی ستھرائی اور خدمت کرکے اپنی ماں کے پاپ دھوئے گا۔" وہ یہ کہہ کر بچہ اٹھائے فوراً حویلی سے نکل گیا۔

وہ بچہ چاہے ناجائز تھا لیکن تھا تو میری ماں کا۔ مجھے اس کے جانے کا بہت دکھ تھا۔ سارے لوگ وہاں کھڑے تھے۔

نورتی دیوی نے مجھے کہا۔ "شائستہ تو پہلے کی طرح حویلی میں آکر میری خدمت کیا کر۔" تو صیف کے بارے میں بیرم کمار نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مودے جملے کے ساتھ ان کے اصطبل کے جانوروں کی خدمت کرے گا۔ میں حویلی میں پہلے کی طرح بڑی ٹھاکرانی کی خدمت کرنے لگی تھی۔ میں نے بڑی ٹھاکرانی کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے ہم دونوں بہن بھائی پر ترس کھا کر ہمیں دوبارہ حویلی میں بلالیا تھا۔

حویلی کے باقی لوگ ہم سے زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ ایک دن بڑی ٹھاکرانی نے مجھے کہا تھا۔ "اس حویلی کے تقریباً تمام مرد زانی' شرابی اور عیاش ہیں' یہ لوگ شراب' شباب کے رسیا ہیں۔ تجھے کبھی موقع ملے تو یہاں سے بھاگ جانا۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں تیری بھی عزت یہاں پامال نہ ہوجائے۔"

کافی دن گزر گئے' ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زندگی میں ٹھہراؤ اور بہتری آگئی ہے۔ تو صیف' بیرم کمار کے اصطبل میں سارا دن کام کرتا۔ وہ رات کو تھک ہار کر سو جاتا تھا۔ اس سے میری کوئی خاص بات نہیں ہو پاتی تھی۔ ادھر حویلی کے اندر کسی باہر کے فرد کو آنے کی اجازت نہ تھی' صرف ایک دو ملے دار یا ان کے پرانے جاننے پہچاننے والے آتے تھے یا حویلی والے مودا جملا کو مشکل میلہ اور مذاق وغیرہ کے لیے کبھی کبھی بلا لیتے تھے۔ حویلی کے کمین بچے' بوڑھے اسے نت نئے انداز سے تنگ کرتے تو وہ جل کر انہیں گالیاں دیا کرتا تھا جس کا کوئی برا نہیں مانتا تھا۔

وقت اسی طرح گزر رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا' تو صیف کی شخصیت اور اس کے رہن سہن کے طور طریقے میں ہندوانہ انداز بڑھتا جارہا ہے۔ وہ اپنے ماتھے پر تلک لگا کر "السلام علیکم!" کی جگہ ہاتھ جوڑ کر نمستے' پرنام کہنے لگا تھا۔ میں نے جب اس کے یہ ہندوانہ طور طریقے دیکھے تو اسے ٹوکا۔

"یہ تو کیا کرنے لگا ہے؟ یاد رکھو ہم مسلمان ہیں اور مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے ہیں۔"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں کبھی کبھار نماز پڑھ لیتی اور قرآن شریف بھی پڑھ لیتی تھی لیکن وہ اسلام سے بالکل ہی پھر گیا تھا۔

ایک دن مودے جملے نے مجھے کوٹھری میں آکر بتایا کہ بیرم کمار تو صیف کو روز اناس مندر میں لے کر جاتا ہے جہاں تیری ماں کا جنما ہوا بچہ پل رہا ہے اور وہاں کا پنڈت اسے ہندو مذہب کی جانب راغب کر رہا ہے۔ یہ میرے لیے ایک نئی پریشانی تھی۔ مودے کی بات سچ تھی۔ اس ہندو پنڈت نے نہ جانے تو صیف کو کیا پٹی پڑھائی کہ وہ اسلام سے بالکل ہی بے بہرہ ہوگیا تھا اور ہندوانہ مذہب کو اپناتا جارہا تھا۔ میں نے تو صیف کو اپنے آباؤ اجداد کا دین بدلنے سے روکا تھا لیکن وہ نہ مانا۔

میں مکمل ہندوانہ ماحول میں رہ رہی تھی۔ اب میرا آخری مسلمان سہارا بھائی بھی ہندو بن چکا تھا۔ میں نے بھائی سے ناراض ہوکر اپنی کٹیا الگ کرلی تھی۔ مجھے اس سے نفرت اور خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ تو صیف اب سارا دن مندر میں رہتا تھا۔

ایک دن حویلی میں پوجا کی کوئی تقریب تھی۔ مندر کا پنڈت حویلی کے باسیوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ نہ جانے کس قسم کی عبادت تھی؟ حویلی کے تمام باسی بار بار بھگوان کی مورتی کے سامنے جاکر جھکتے' پرنام کرتے اور کچھ منتر وغیرہ پڑھتے تھے۔ تو صیف بھی ان کے رنگ میں رنگا بالکل ان جیسا لگ رہا تھا۔ مجھے وہ اس حلیے میں بہت برا لگ رہا تھا۔ اس دن حویلی میں اس بھگوان پوجا کے دن مجھے بھی خصوصی طور پر نئے کپڑے پہنچائے گئے تھے۔ پہلے تو میں سمجھی کہ یہ حویلی والوں نے معمول کے مطابق میرے کپڑے بنوائے ہیں لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب حویلی کے اندر باقاعدہ بھگوان پوجا شروع ہوئی تو سب سے پہلے پنڈت نے تو صیف کو اپنے پاس بلایا اور اسے اپنے پاس بڑی محبت اور عزت سے بٹھایا۔

کچھ توقف کے بعد اس نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔ "تو صیف نے اب اپنا دھرم چھوڑ کر ہمارا دھرم دل سے قبول کرلیا ہے' لہٰذا آج سے اس کا ہندو نام موہن ہوگا۔" میں نے یہ منظر دیکھا تو مجھے لگا جیسے میرا دل اچھل کر منہ کو آرہا ہو۔ میں دل ہی دل میں اس دن کو یاد کرکے رونے لگی جس منحوس گھڑی ہمارے بے بس مجبور خاندان نے اس حویلی میں قدم رکھا تھا۔

پرکاش سندر نے مجھے بڑے پیار سے اپنے پاس بلایا اور مجھے کہا کہ سب کے ساتھ تم بھی ہندو ہو جاؤ میں بٹیو۔ انہوں نے اتنی بڑی بات اتنے آرام سے کہہ دی کہ مجھے اپنے قدموں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں گھبرا گئی۔

"آؤ بیٹی....." سریشہ دیوی نے مجھے کہا۔

"ارے' آنا پو چاپر بیٹھ....." مرلی پرکاش نے اپنے ہندوانہ انداز میں کہا۔

"نہیں..... نہیں..... تو صیف....." میں گھبراہٹ میں الناسید ھا بولنے لگی۔

"آ..... آ....." سریشہ دیوی مجھے اس پوجا میں بٹھانے پر بضد ہوگئیں۔

"نہیں..... میں مسلمان ہوں۔ میں بھگوان کی مورتی کی پوجا نہیں کرسکتی....."

میرے بھائی تو صیف نے جو کہ اب ہندو ہو چکا تھا' اس نے بھی مجھے پوجا کی طرف لانے کی کوشش کی تو میں نے خدا تعالیٰ سے یہی دعا کی کہ "خدا! مجھے میرے ایمان پر ثابت قدم رہنے کی طاقت عطا فرما۔"

"آجا..... شائستہ۔" پنڈت نے کہا۔

"نہیں..... میں نے پوجا میں نہیں آنا۔" میں

www.pdfbooksfree.pk

نے اس بار سختی سے کہا۔

تو صیف نے غصے سے مجھے کہا۔ ”میں تجھے کہہ رہا ہوں‘ میرے واسطے بیٹھ میں تیرا بھائی ہوں۔“ میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔

”تو میرا بھائی نہیں ہے اور نہ ہی اب تو تو صیف ہے بلکہ موہن ہے۔“

”خونی رشتہ سے میں تیرا بھائی ہوں۔“

”تو اب ہندو ہو گیا ہے۔ تیرا میرا کوئی رشتہ ناتہ نہیں ہے۔“

پھر ٹھاکر پرکاش سندر میرے پاس آیا اور کہا۔ ”بھگوان پوجا کی اس محفل کو بدمزہ نہ کرو۔ آجاؤ بیٹی۔“ میں نے مسلسل انکار کیا تو مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”جا..... بھاگ یہاں سے.....“

میرے بھائی نے بھی میری تذلیل پر کوئی ردعمل نہیں کیا تھا۔ میں اپنی کوٹھری میں آ کر اپنی قسمت کو رونے لگی۔

رات کو تو صیف (موہن) کوٹھری میں آیا اور کہا۔ ”میں اپنی مرضی سے ہندو مذہب میں داخل ہوا ہوں۔ اب یہ تیری مرضی ہے کہ مجھے بھائی کی حیثیت سے قبول کرے یا نہیں کرے۔“

میں اگلی صبح جب حویلی میں نورتی ٹھاکرانی کی خدمت کے لیے گئی تو انہوں نے مجھے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ خاموشی سے مجھ سے اپنا جسم دبواتی رہیں۔ ان کا منہ دیوار کی جانب رہا۔ انہوں نے مجھ سے کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ حویلی کے دیگر مکینوں کا رویہ بھی میرے ساتھ عجیب سا ہو گیا۔ تو صیف سے میری بول چال بند تھی۔ وہ سارا دن مندر میں رہتا تھا اور اپنی زندگی کی میں مست تھا۔ اسے مجھ سے کوئی سروکار نہ تھا۔

چند دنوں بعد ٹھاکروں کے رشتہ دار کی شادی جونا گڑھ میں ہو رہی تھی۔

حویلی والوں نے ایک ہفتہ کے لیے وہاں جانا تھا۔ اب حویلی میں مودا جھلا‘ بیمار ٹھاکرانی نورتی دیوی کی خدمت کے لیے ایک بڑی عمر کی نوکرانی موجود تھی۔

حویلی کے مکینوں کو جونا گڑھ گئے ہوئے ابھی تین دن ہوئے تھے کہ ایک رات میں کوٹھری میں گہری نیند سو رہی تھی۔ تو صیف (موہن) رات کو ہی مندر چلا گیا تھا۔ میں نے نیند میں محسوس کیا کہ میرے جسم کو دو تین مردوں نے بری طرح دبوچا ہوا ہے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے میرے منہ پر ایک دوپٹہ کو گولہ بنا کر ٹھونسا‘ اس کے بعد انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں کسی رسی سے باندھے۔ میں نے زور سے ہو ہو کرنا شروع کر دیا۔ خوش قسمتی سے میرے پاؤں باندھنے والے نے مضبوطی سے نہیں باندھے تھے۔ میرے زور لگانے کی وجہ سے پاؤں کھل گئے۔ میں نے مزاحمت کرتے ہوئے ایک بندے کو اتنی زوردار لات ماری کہ وہ زمین پر گر گیا۔ اس کے بعد میں نے جدوجہد کر کے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ اللہ کے فضل و کرم سے میرے منہ میں پھنسا ہوا دوپٹہ کا گولہ بھی نکل چکا تھا۔ میں نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔

”بچاؤ..... بچاؤ.....“

اتنے میں مودا جھلا نیند میں بڑبڑاتا ہوا اپنے مخصوص انداز میں چلاتا ہوا آیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ‘ ایک اینٹ اٹھا کر ایک غنڈے کے سر پر دے ماری جبکہ میں ان غنڈوں کی گرفت سے چھوٹ کر زمین پر آ گری تھی۔ نہ جانے میرے ہاتھ کیسے کھل گئے تھے‘ میں نے اپنی آنکھوں پر بندھی پٹی ہٹا کر دیکھا کہ مودہ جھلا ان غنڈوں سے مقدور بھر گتھا ہو کر لڑ رہا ہے۔ وہ دو تھے‘ ایک غالباً بھاگ گیا تھا۔ مودے نے

ایک غنڈے کی گردن کو زور سے پکڑ کر اسے نیچے گرایا ہوا تھا اور ساتھ ساتھ چلائے جا رہا تھا۔

”شانتہ..... !اینٹ اٹھا کر انہیں مار.....“

میں غنڈوں کو دیکھ کر بوکھلائی ہوئی تھی۔ بہرحال میں نے ایک اینٹ اٹھا کر مودے سے الجھتے غنڈے کی کمر پر زور سے دے ماری۔ وہ اینٹ کھا کر میری جانب لپکا تو میں نے حویلی کے دروازے کی جانب بھاگنے کی کوشش کی جو کہ بند تھا۔ میں نے زور زور سے حویلی کے بند دروازہ پر اپنی ہتھیلیاں مارنا شروع کر دیں۔ شکر ہے تھوڑی دیر میں حویلی کی خادمہ نے دروازہ کھول دیا۔ وہ بھی مودے اور غنڈوں کی لڑائی کو دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ اس نے بھی زور زور سے اسے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اس شور میں ساتھ والے دو تین پڑوسی بھی آ گئے تھے لیکن اس دوران ایک دل خراش واقعہ یہ ہوا کہ اس کشمکش کے دوران ایک غنڈے نے مودے کے پیٹ میں رام پوری چاقو گھونپ دیا تھا۔ پڑوسیوں نے انہیں پکڑنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ دونوں بڑی پھرتی سے بھاگ گئے۔

میں بڑی بیمار ٹھاکرانی کے پاس جا کر ان سے چمٹ کر رونے لگی۔ وہ صحیح طریقہ سے چل نہیں سکتی تھیں۔ بہرحال وہ میرے سہارے چل کر آئیں تو باہر کا منظر دیکھا۔ انہوں نے زمین پر پڑے شدید زخمی مودے کو فوری طور پر ہسپتال لے جانے کو کہا اور مجھے کہا کہ تم فوری طور پر حویلی کے اندر آ جاؤ۔ اتنے میں زخمی مودے کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

میں جب حویلی کے اندر ڈری سہمی روتی ہوئی گئی تو بڑی ٹھاکرانی نے مجھے کہا۔ ”تو آج اور ابھی اس حویلی سے بھاگ جا۔ تیرا یہاں اب کچھ نہیں بچا ہے‘ تیرے ماں باپ دونوں کو یہ حویلی نگل گئی ہے۔ دوسری طرف تیرا آخری سہارا بھائی کو ٹھاکروں نے ایک سازش کے تحت ہندو بنا لیا ہے۔ میری زندگی کا اب کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ آج تجھے نامعلوم بدمعاشوں نے اٹھانے کی کوشش کی ہے‘ کل نہ جانے تیرے ساتھ کیا انہونی بیت جائے‘ تو یہاں سے ابھی بھاگ جا۔“

”لیکن کہاں جاؤں؟ ہم لوگوں کا یہاں کوئی جاننے والا نہیں ہے۔“

”بیٹی..... جن کا کوئی نہیں ہوتا‘ ان کا اوپر خدا..... بھگوان نگہبان ہوتا ہے۔“ ٹھاکرانی نے کہا۔

انہوں نے اپنی خادمہ کے ذریعے پڑوس کے ایک دلیز جوان سنگھ کو بلوایا۔ وہ آیا تو ٹھاکرانی نے اس کے ہاتھ پر 20 تولہ سونے کے لاکٹ‘ کڑے رکھے اور کہا۔ ”اس لڑکی کو ابھی مسلمان انادسینٹر مدراس پہنچا دو۔“

”میں اپنے محسن مودے سائیں اور بھائی تو صیف (موہن) کو لے بغیر نہ جاؤں گی۔“ میں نے کہا۔

”بس تم فوراً چلی جاؤ اور پلٹ کر نہ دیکھنا کیونکہ یہاں پیچھے اب تیرا کچھ نہیں بچا ہے۔“ پھر انہوں نے منگے کو کہا۔

”یاد رکھو بیٹا..... !اگر تجھ میں ذرا بھی انسانیت ہے تو بھگوان کے واسطے‘ اسے منزل پر پہنچا دے۔“

منگا خود بدمعاش قسم کا تھا۔ مجھے اس سے بھی ڈر لگ رہا تھا لیکن میں اس کے ساتھ ہو لی۔ میں منگا بدمعاش کے ساتھ ہسپتال گئی‘ وہاں مودا شدید زخمی حالت میں تھا۔ موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے کے انتظار میں تھا۔ میں نے اس کے پاؤں چھو کر روتے ہوئے اپنی جان بچانے کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے انتہائی کرب کے عالم میں میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مرتے مرتے مجھے کہا۔ ”شانتہ‘ خدا تیری حفاظت کرے۔ تو بس یہاں سے بھاگ جا۔“

www.pdfbooksfree.pk

یہ کہتے ہی وہ مر گیا۔ مجھے اس وقت لگا جیسے میرا سگا بھائی مجھ سے جدا ہو گیا ہو۔

پھر میں مندر گئی تو وہاں توصیف (موہن) اپنی عبادت میں مصروف تھا۔ اسے میری آمد کا علم ہوا تو وہ میرے پاس آ گیا۔

''یہاں کیوں آئی ہو؟''

منگے نے کہا۔ ''تو یہاں بھگوان کی پوجا کر رہا تھا۔ وہاں آج تیری بہن کی عزت لٹ جاتی.....''

''کیا کہا؟'' اس نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا جس نے میری بہن کی عزت پر ہاتھ رکھا ہے۔''

''تو کس سے لڑے گا؟ تیری بہن پر جن بدمعاشوں نے ہاتھ ڈالا تھا' وہ نامعلوم تھے.....'' منگے نے کہا۔

میں نے توصیف کے آگے ہاتھ جوڑے کہ خدا کے واسطے' تو واپس اپنے مذہب میں آ اور میرے ساتھ مدراس چل لیکن توصیف نہ مانا۔ میری تمام التجائیں بے کار ثابت ہوئیں۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ ٹھاکروں اور مندر کے پنڈتوں نے اسلام کی جانب سے اس کا دماغ اتنا متنفر کر دیا تھا کہ اس نے اپنا مذہب تبدیل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

منگے نے مجھے کہا۔ ''یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے تو چل۔''

توصیف نے کہا۔ ''میں دوبارہ اسلام قبول نہیں کروں گا لیکن ایک منٹ.....تو مندر کی سیڑھیوں پر ٹھہر' میں ابھی آتا ہوں۔''

میں اور منگا جس سے اس کا انتظار کرنے لگے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ مندر میں موجود ہندو غنڈے نہ لے آئے لیکن وہ اپنی گود میں میری ماں کا ناجائز بچہ لے آیا جو کہ گہری نیند میں تھا۔ اسے میری گود میں دیتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے پنڈت کہتے ہیں کہ یہ ناجائز ہے' گندگی کا ڈھیر ہے' اسے ہم اس مقدس مندر میں نہیں رکھ سکتے۔'' میں نے بچے کو بغیر سوچے سمجھے فوراً اپنی گود میں لے لیا۔ سچ پوچھو تو اس وقت مجھے ایسا لگا کہ جیسے کسی ماں کی گود میں اس کا بچھڑا ہوا بچہ آ گیا ہو۔ میں نے توصیف (موہن) کو ایک دفعہ پھر اپنے ساتھ مدراس لے جانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ واپس مندر چلا گیا پھر منگے نے مجھے بحفاظت بچے سمیت مدراس پہنچایا۔ اس نے اپنا فرض بخوبی نبھایا تھا۔

مدراس میں اللہ کے فضل و کرم سے ہمیں ایک ایسے نیک دل عالم دین شخص ملے۔ انہوں نے اس بچے کا نام صابر رکھا۔ ہم کچھ ماہ مدراس کے اس سینٹر میں رہے اور جب پاکستان بنا تو اُن عالم دین نے مجھے اور بچے کو ایک نیک دل فیملی کے حوالے کیا اور یوں ہم ملتان آ گئے۔ میں نے صابر کی تعلیم و تربیت دینی تعلیمات کے مطابق کی۔ میں نے اسے معاشرے میں اسے عزت دار مقام دلوانے کے لیے دن رات محنت کی۔ اسے پڑھا لکھا کر پروفیسر بنایا اور اس کی خاطر میں نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔

میں آج بھی اپنے محسن مودے جھلے کو اور محسنہ بڑی ٹھاکرانی کے احسانات کو یاد کرتی ہوں۔ خدا ان دونوں کی روحوں کو ہمیشہ شانت رکھے لیکن میں یہ راز نہ جان سکی کہ میری ماں کے بطن سے پیدا ہونے والا یہ بچہ کس عیاش شخص کی نشانی تھا؟''

شائستہ بیگم اپنی سرگزشت سنا کر خاموش ہو گئی تھیں مگر ان کے چہرے کی جھریوں کی ایک ایک لکیر چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ جن انگاروں پر چل کر انہوں نے زیست کا سفر برہنہ پا طے کیا تھا' وہ کوئی ہنسی کھیل نہیں بلکہ بڑے حوصلے کا کام تھا۔

جمیل میتلو

آگ کا دریا

نمرین محبت سبزواری کا خیال

ہم نے جینے کی سزا کاٹی ہے
کیسے گزرا یہ سفر، جانے دو

ایک ایسی ماں کی کہانی جس نے بیس برسوں کا کرب جھیلا تھا

نچلی منزل پہ خوشی کی ڈھولک بج رہی تھی۔ میرے بیٹے کی شادی تھی لیکن میرے دل میں سالوں کا غبار بھرا ہوا تھا جو باہر نکلنے کو بے قرار تھا۔ بیس برس جو درد میں نے سہا ہے' وہ ایک دم کس طرح بھولا جائے؟ ان بیس برسوں میں پل پل میں روئی ہوں' جانے کتنی راتیں میں نے تڑپ تڑپ کر گزاری ہیں' کرب کا ایک طوفان میں نے جھیلا ہے اور کتنی ہی بار گھبرا کر موت کو گلے لگانے کی کوشش کی ہے لیکن ہر



www.pdfbooksfree.pk

بار ماں کا دکھی چہرہ نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا۔ ماں بیٹیوں کے دکھ مشترکہ ہوتے ہیں اور بیٹیوں کے دکھ تو ویسے بھی ماؤں کو رلاتے ہیں۔ اب ماں نہیں ہے اور نا ہی جذبات کا طوفان' شاید اسی لیے زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا مگر بیس سال بعد آج پھر جذبات ابل رہے ہیں۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ میری پیاسی ممتا سیراب ہونے جا رہی تھی کہ میرے گھر میں میری اپنی سگی بیٹی بہو کی صورت آنے والی تھی اور میری آنکھوں کے سوتے جو رو رو کر خشک ہو چکے تھے' وہ پھر سے ہرے ہو رہے تھے۔

نچلی منزل پہ میرے محلے والیوں کا ایک شور تھا' قہقہوں اور تالیوں کا شور' ڈھولک پر شادی کے گانے گائے جا رہے تھے اور میرے ذہن میں پچھلے بیس برس کے واقعات کسی فلم کی طرح چل رہے تھے۔

•.....•.....•.....•

میری پھوپھو اور امی ایک دوسرے کی نندیں بھی تھیں اور بھابھیاں بھی۔ وٹے سٹے کی یہ رسم برسوں سے ہمارے خاندان میں چلی آ رہی تھی۔ یہ وٹہ سٹہ میری دادی کی مرضی سے ہوا تھا۔ پھوپھو کی بالکل بھی مرضی نہ تھی کہ ان کی شادی ماموں سے ہو۔ اسی وجہ سے وہ ہمیشہ ناخوش رہیں۔ اس کے برعکس میرے امی' بابا اپنی زندگی میں بہت خوش تھے۔

ہم دو بہنیں تھیں اور پھوپھو کے ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ پھوپھو چونکہ اپنی شادی سے مطمئن نہیں تھیں' اس لیے زیادہ تر میکے میں ہی رہتی تھیں۔ ہمارا کوئی بھائی نہیں تھا اور ہماری شدید خواہش تھی کہ ہمارا بھائی بھی ہو پھر تقریباً سات سال بعد ہمارا بھائی پیدا ہوا جس کا نام تنویر رکھا گیا۔ بھائی کو پا کر ہم بہت خوش تھے۔ اسی دوران امی کو شہر میں ٹیچری مل گئی اور ہم شہر آ گئے۔ بابا نے بھی اپنی کچھ زمین بیچ کر ایک چھوٹا سا گھر اور گھر کے قریب ہی دکان بھی لے لی اور اس طرح ہم شہر میں ہی رہنے لگے۔

زندگی معمول کے مطابق گزر رہی تھی کہ ایک بھونچال آیا۔ بابا کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوا تو غموں کا ایک پہاڑ ہم پر ٹوٹ پڑا' دکھ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو' وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے اور اسی مرہم سے ہم یہ غم جھیل گئے۔ ہم تو بچے تھے مگر امی کے ساتھ تو یہ غم آسیب کی طرح چمٹ گیا تھا اور وہ آسیب تھا ہماری دادی جو اٹھتے بیٹھتے امی پر طنز کے تیر برساتی رہتی تھیں کہ پہلے نوکری کا بہانہ کیا اور میرے بیٹے کو بہلا پھسلا کر شہر لے آئی' مجھ سے دور کیا اور اب اسے کھا گئی..... اب تو کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا؟ میں تو کہتی تھی' یہ لوگ منحوس ہیں پھر بھی میری سنتا کون ہے؟ اب یہ ماں بیٹیاں (یعنی ہماری امی اور نانی) اور کتنی نحوست پھیلائیں گی؟ ایسی باتوں سے امی کا چہرہ کرب کی تصویر بن جاتا تھا۔ امی کے ساتھ ہم جب بھی گاؤں جاتے تو ایسی باتیں سننے کو ملتیں۔ آخر ہم بچوں نے ماں کو گاؤں جانے سے روک دیا۔ جب ماں کہتیں' گاؤں چلیں پھوپھو سے ملنے تو ہم منع کر دیتے کہ اگر دادی کو ہماری یاد آئے گی تو وہ خود آ جائیں گی۔ دادی شہر آتیں تو امی کا جینا دوبھر ہو جاتا۔ دادی طعنے تشنے دیتیں۔ امی بڑی صابر عورت تھیں' انہوں نے کبھی پلٹ کر دادی کو جواب نہیں دیا۔ جب دادی چلی جاتیں تو گھر میں سکون ہو جاتا۔

امی اب ہماری ماں بھی تھیں اور باپ بھی۔ ہماری بہتر تعلیم اور پرورش امی کا اہم مقصد تھا۔ ہم تینوں بھائی بہن ہر سال اپنی جماعتوں میں امتیازی نمبر لے کر کامیاب ہوتے رہے۔ زندگی اسی طرح اپنی ڈگر پر چل رہی تھی کہ میری زندگی کے سمندر میں پہلا پتھر پڑا اور ہلچل ہونے لگی۔

ایک روز ہم لوگ کالج سے واپس آئے تو دیکھا'

www.pdfbooksfree.pk

تضاد

ی گھر میں ایک چھوٹی سی دعوت کیے بیٹھی تھیں۔ وہ کول سے ہاف ٹائم میں ہی آ گئی تھیں۔ دعوت کا یہ انتظام انہوں نے اس لیے کیا تھا کہ بہت دنوں کے بعد ماموں آئے تھے' ویسے تو وہ کبھی نہ کبھی آ جاتے تھے لیکن نانی اماں کے انتقال کے بعد تو ان کا آنا جانا ہی ختم ہو گیا تھا۔ اب اتنے سالوں کے بعد ان کے اچانک آنے سے میری ماں بہت خوش تھیں۔

ویسے تو ہم بھی بہت تھے اپنے کزن حماد اور ماموں کے آنے سے چاہے اپنوں سے لاکھ شکوے ہوں لیکن اپنوں کے ساتھ مل کر بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ اس دن ہم تینوں یعنی مجھے' تنویر اور نجمہ کو بہت اچھا لگا اور ہمیں وقت کا بالکل پتہ نہیں چلا کہ باتوں باتوں میں کب شام ہو گئی۔ ماموں جب جانے کے لیے اٹھے تو امی اداس ہونے لگیں۔

ماموں نے ان کی اداسی دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب تو آنا جانا لگا رہے گا۔ تم لوگوں نے تو اب ضرور گاؤں آنا ہے اس اتوار کو۔"

"انشاء اللہ' ہم ضرور آئیں گے۔" امی نے کہا اور پھر اکثر ہم گاؤں جانے لگے۔ ہم بھی اپنوں کی محبت کے بھوکے تھے' پھوپھو' دادی اور دوسرے رشتے داروں سے مل کر خوشی ہوتی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ حماد کی نظریں میرا پیچھا کرتی رہتی تھیں اور میں اُن نظروں کا مطلب خوب سمجھتی تھی اس لیے میرے لبوں پر بھی ایک خاص مسکراہٹ رہنے لگی تھی۔

اُس دن اتوار تھا۔ امی کو ہلکا بخار تھا۔ وہ ٹیبلیٹ لے کر سو رہی تھیں۔ ہم لوگ اپنے معمول کے کاموں میں مصروف تھے۔ میں کپڑے پریس کر رہی تھی۔ نجمہ رضائی میں لگی ہوئی تھی اور تنویر' امی کا سر دبا رہا تھا کہ بیل بجی۔ تنویر نے دروازہ کھولا اور نعرہ لگاتا ہوا آیا۔

قائد کا فرمانا تھا یہ
کام سے ہرگز جی نہ چرانا
ترقی کی راہوں پہ جانا
لیکن ہم نے شروع کیا ہے
چھٹی کلچر..... ہڑتال کلچر

شگفتہ شفیق

"ماموں جان آئے ہیں اور ساتھ میں حماد بھائی بھی ہیں۔" وہ ہنستا ہوا آ رہا تھا۔ سب مسکرانے لگے۔ امی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ماموں مٹھائی لائے تھے کیونکہ حماد نے انجینئرنگ کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ وہ لوگ شام تک رہے۔ گھر میں رونق لگی رہی۔ حماد سنجیدہ لڑکا تھا مگر آج اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

رات کو جب سب سونے کے لیے چلے گئے اور میں کچن سمیٹ رہی تھی' تب امی نے میرے پاس آ کر کہا تھا۔ "بیٹا عائشہ! آج بھائی جان نے تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔ تمہیں تو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟" امی میری طرف دیکھنے لگیں۔

"امی! جو آپ مناسب سمجھیں۔" میں نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ امی نے میری پیشانی چومی اور چلی گئیں اور میں حماد کے بارے میں سوچنے لگی۔

پھر ایک بہار بھری شام میں ماموں اور ممانی آئے اور مجھے حماد کے نام کی انگوٹھی پہنا گئے اور بدلے میں ماموں کی بیٹی جو کہ بارہ برس کی تھی اور میرا بھائی تنویر جو ابھی نیا نیا فرسٹ ایئر میں آیا تھا' اُن کی بھی بات پکی ہو گئی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی' ہمارے خاندان میں دے دلے کا یہ رواج برسوں سے تھا۔ حماد جوں ہی برسرِ روزگار ہوا' ہماری

www.pdfbooksfree.pk

شادی ہوگئی۔ حماد کی محبت اور ماموں کی شفقت میں زندگی بہت حسین ہوگئی تھی البتہ میری ممانی جو کہ میری سگی پھوپھی تھیں' اُن کا رویہ میرے ساتھ سرد سا تھا لیکن میرے دل میں ان کے لیے کوئی بری بات نہ تھی اسی لیے میں ان سے محبت اور ان کی عزت کرتی تھی اور دل و جان سے سب کی خدمت بھی کرتی تھی لیکن پھر بھی میں ان کے دل میں جگہ نہ بنا سکی تھی۔

دو سال اسی طرح گزر گئے' اس دوران میرے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ پہلے تو پھوپھو بے لفظوں میں طعنے دیتی تھیں مگر اب تو انہوں نے صاف صاف کہنا شروع کر دیا تھا کہ مجھ سے لکھ کر لے لو' یہ ماں نہیں بنے گی۔ تیسرا سال بھی اسی طرح سرک گیا اور کوئی امید نہ بنی۔ اس اثنا میں تنویر اور ثوبیہ کی شادی کی تاریخ بھی طے ہوگئی اور گھر میں شادی کے ہنگامے شروع ہوگئے اور میں کبھی اپنے گھر اور کبھی امی کے گھر رہنے لگی۔ بھائیوں کی شادی کا بہنوں کو بہت ارمان ہوتا ہے' ہماری خوشی کا بھی ٹھکانہ نہ تھا۔ ہم اپنے اکلوتے بھائی کی شادی کے ارمان نکالنے کی تیاریاں کر رہے تھے اور پھر وہ مبارک دن بھی آیا جب ثوبیہ ہمارے بھائی تنویر کی دلہن بن کر ہمارے آنگن میں آئی اور وہ دونوں خوش و خرم زندگی گزارنے لگے۔ امی بھی بہت خوش تھیں۔ دن گزرتے پتہ ہی نہیں چلتا۔ جب امی کی دادی بننے کی خبر ہمارے گھر پہنچی تو پھوپھو نے طنز کرتے ہوئے کہا کہ میں تو یہ حسرت قبر میں لے کر جاؤں گی کہ اپنے پوتے پوتیاں دیکھوں اور میں آنسو بہا کر رہ گئی۔ بھلا میرے بس میں کیا تھا؟ سب میرے مالک کا اختیار تھا۔

ایک دن دادی نے مجھے بلایا اور کہا۔ ”دیکھو بیٹا! اگر تم اولاد نہیں چاہتی تو مجھ سے کہہ دو' میں رابعہ کو سمجھاؤں گی۔“ دادی کے اس طرح پوچھنے پر تو میں حیران ہی رہ گئی۔

”دادی! آپ ایسا سوچ رہی ہیں؟“ میں نے بے یقینی سے دادی کو دیکھا۔

”ہاں کیونکہ تمہاری اماں بہت چالاک ہے.....“ میں اپنے کمرے میں بھاگ آئی اور رونے لگی اور خدا کے حضور گڑگڑانے لگی۔

کچھ دنوں بعد ثوبیہ نے ایک خوبصورت سے بیٹے کو جنم دیا۔ ہماری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بچے کا نام شہاب رکھا گیا۔ خوب مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ امی میرے گھر بھی مٹھائی لے کر آئیں۔ شام کو جب وہ جانے لگیں تو پھوپھو نے کہا۔ ”اب میرے حماد کی بھی اولاد ہو جانی چاہیے۔ سمجھا دو اپنی بیٹی کو بھی اور خود بھی سمجھ لو۔“

”یہ میرے بس میں تو نہیں ہے اور کیا میں نہیں چاہتی کہ زبیدہ ماں بنے؟“ امی نے جواب دیا۔

دادی نے کہا۔ ”تیری چالاکیاں تو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ پہلے تو نے میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا پھر مجھے پوتے پوتیوں کی شکل دیکھنے سے ترسایا اور اب میری بیٹی کو بھی بیٹے کی اولاد دیکھنے سے ترسا رہی ہے۔“

”یہ خدا کی طرف سے کوئی آزمائش ہے۔ میری بیٹی کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔“ امی نے دکھ سے کہا اور غم زدہ سی لوٹ گئیں۔

اب پھوپھو اٹھتے بیٹھتے مجھے طعنے تشنے دیتیں کہ تو بانجھ ہو اور میں اللہ کے حضور گڑگڑانے کے سوا کیا کر سکتی تھی؟ ماموں اور حماد ہی میرا سہارا تھے۔ پھوپھو اور دادی دونوں ہی جیسے سوتیلوں جیسا سلوک کرتی تھیں۔

ایک رات ماموں ایسا سوئے کہ پھر کبھی نہ اٹھے۔ ان کے جانے سے میرے دکھوں میں اضافہ ہو گیا کیونکہ ماموں میری ڈھال تھے' اب وہ بھی نہ رہے تو پھوپھو کو روکنے ٹوکنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ دادی اور پھوپھو دونوں سر جوڑے بیٹھی رہتیں۔ میں باوجود خدمت کرنے کے اُن کو اپنا نہ بھا سکی تھی۔ حماد بھی اپنے کام کی وجہ سے دو دو دن سائٹ پر ہوتے بلکہ گھر کی کشیدگی کی وجہ سے اب تو وہ ہفتہ ہفتہ نہیں آتے تھے۔ ایسے ہی دن گزر رہے تھے کہ دادی بھی گزر گئیں۔ گھر میں خاموشی رہتی۔ پھوپھو نے مجھ سے بات کرنی بھی چھوڑ دی۔ میں پھر بھی ان کی جی جان سے خدمت کرتی تھی۔

اُس دن میں کچن میں کام کر رہی تھی۔ حماد آئے ہوئے تھے اور دسمبر کی دھوپ تاپتے ہوئے صحن میں بیٹھے تھے۔ پھوپھو بھی بیٹھی تھیں کہ انہوں نے حماد سے کہا۔ ”ثوبیہ کے ہاں اب دوسری بار اولاد ہونے والی ہے۔ میں تو یہ آرزو لے کر تمہارے ابا کی طرح قبر میں چلی جاؤں گی۔“ اور رونے لگیں۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی؟ خدا نہ کرے۔“ حماد نے پریشانی سے کہا۔

”اور کیا تم میرے بیٹے تھوڑی ہو جو تمہیں میرا ملال ہو۔“ پھوپھو نے روتے ہوئے کہا۔

”امی.....! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ حماد نے پھوپھو کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

”اگر ایسا ہے تو تم دوسری شادی کر لو۔“ پھوپھو نے صاف صاف کہہ دیا۔

”نگرامی.....!“ حماد حیرت سے ماں کو دیکھنے لگے۔ ”امی.....! زبیدہ..... میری بیوی ہی نہیں..... آپ کی بھتیجی بھی تو ہے؟“

”میں بانجھ بھتیجی کا کیا کروں؟ اور پھر تم میرے اکلوتے بیٹے ہو؟“ یہ باتیں سن کر میں تو جیسے بالکل ٹھنڈی پڑ گئی۔

دوسرے دن حماد ڈیوٹی پر چلے گئے۔ اب میں خدا سے خوب بلک بلک کر دُعائیں مانگتی۔ میری اور حماد کی بلڈ رپورٹس بھی بالکل درست تھیں۔ امی نے بھی منتیں وغیرہ خوب مانگی تھیں۔

ایک رات میں اپنے رب کے حضور بہت گڑگڑائی تھی۔ ”اے اللہ! تو میری آزمائش ختم کر دے اور میری گود اپنے پیارے محبوب کے صدقے' بھر دے میرے مولا!“ میں روتے روتے جاء نماز پر ہی سو گئی۔ خواب میں دیکھا کہ سفید فراک میں ملبوس ایک بہت ہی پیاری بچی میری گود میں ہمک رہی ہے۔ جب آنکھ کھلی تو دل پر عجیب سی سرشاری تھی۔ روم روم میں ایک طمانیت کا احساس تھا۔ حماد آئے تو میں نے انہیں بھی اپنا خواب بتایا۔

انہوں نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ”خدا ہمیں ضرور اولاد کی خوشی دے گا اور ہمیں کوئی جدائی کر سکے گا۔“ میں نے دل ہی دل میں اُن کی بات پر آمین کہی اور پھر اسی ماہ ڈاکٹر نے مجھے ماں بننے کی نوید سنا دی۔ اب جب ثوبیہ دوسرے بچے کی ماں بنی تو میری گود بھی بھر نے کو تھی۔ پھوپھو سمیت سب کو دہری خوشی ملی تھی۔ ٹھیک نو ماہ بعد میری گود میں ایک پیاری سی بچی تھی۔ اُس کا نام عائشہ ناز رکھا گیا۔ پھوپھو بھی پوتی کے ساتھ بہل گئیں اور ہمارے گھر میں خوشیاں ڈیرے ڈالنے لگیں۔ جب تنویر کے بچے آتے اور ہماری عائشہ بھی توتلی زبان میں باتیں کرتی تو گھر کا آنگن جیسے مسکرانے لگتا۔ میں سوچتی۔ ”بچوں کے بغیر تو زندگی بالکل بے مزہ تھی۔“

اب حماد مذاق میں کہتے۔ ”اب دوسرا بچہ بھی ہو جانا چاہیے ورنہ میں خود اماں سے کہہ دوں گا' میری دوسری شادی کرا دیں۔“ میں انہیں آنکھیں دکھاتی اور وہ شرارت سے مسکرا دیتے۔

www.pdfbooksfree.pk

زندگی اسی طرح خوشیوں کے ہنڈولے میں گزر رہی تھی مگر میری قسمت میں ہر خوشی کا ایک خراج لکھا تھا۔ اب جو تقدیر نے مجھ سے مذاق کیا اس نے تو مجھے توڑ کر رکھ دیا۔

اس دن حماد نے فون کر کے بتایا کہ آج میں آرہا ہوں۔ میں نے ان کی پسند کا کھانا بنایا' خود تیار ہوئی' عائشہ کو تیار کیا اور ہم ان کا انتظار کرنے لگے۔ دوپہر تک وہ آجاتے تھے مگر دو پہر سے شام ہوگئی تھی' فون بھی نہیں لگ رہا تھا۔ پھوپھو بار بار مجھ سے پوچھتیں۔ میں ان سے پوچھتی کہ فون ملایا؟ پتہ نہیں کیوں میرا دل گھبرانے لگا تھا۔ سہ پہر کے وقت تنویر گاڑی لے کر آیا اور کہنے لگا کہ حماد بھائی کا فون آیا تھا کہ انہیں اور پھوپھو کو لے آؤں۔ میں حیران ہوئی کہ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا۔

"سچ سچ بتاؤ' کیا بات ہے؟ حماد تو خیریت سے ہیں نا؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔

"کوئی بات نہیں ہے' راستے میں حماد بھائی کا معمولی سا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے....." تنویر نے کہا۔

"کیا!!!؟" پھوپھو اور میں ایک ساتھ چیخے۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں..... خدا خیر کرے گا۔" ہم جلدی جلدی تنویر کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اسپتال پہنچے تو حماد کو شدید چوٹیں لگی تھیں۔ انہوں نے پھوپھو سے بس دو تین ٹوٹی پھوٹی باتیں کیں اور دم خدا کے حوالے کر دیا۔ ہم پر تو قیامتیں ٹوٹ پڑیں۔ اس دکھ کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال حماد کا چالیسواں ہوگیا۔ رو رو کر ہماری آنکھوں سے آنسو خشک ہوگئے تھے۔ لگتا تھا کہ زندگی ختم ہوگئی ہے مگر زندگی کا پہیہ چلتا رہتا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ زندہ لوگ کھانا بھی کھاتے ہیں' کپڑے بھی پہنتے ہیں اور دنیا داری بھی نبھاتے ہیں' بس دل کی کلی مرجھا جاتی ہے۔ تقدیر نے میری زندگی میں تو اب شاید غم ہی غم لکھ دیا تھا۔ چالیسویں کے بعد پھوپھو نے تنویر سے کہا کہ میری بیٹی نہیں جائے گی تمہارے ساتھ۔ اپنی بہن کو لے جاؤ اور جا کر اپنی اماں کے پاس رکھو۔ تنویر نے بھی بحث نہیں کی کہ پھوپھو کا دکھ بڑا تھا اس لیے میں اپنی عائشہ کے ساتھ امی کے گھر آ گئی تھی۔ تنویر اپنی سسرال میں رہنے لگا اور ہر ہفتے آتا تھا مگر پراس کی آمد کا وقفہ بڑھ گیا اور وہ مہینے بعد آنے لگا۔ امی نے کبھی شکایت نہیں کی اور ہمیں بھی صبر کرنے کی تلقین کرتیں۔ گھر میں عائشہ کی وجہ سے رونق تھی' وہی تو میرے جینے کی امنگ اور زندگی کی خوشی تھی لیکن تقدیر کے ترکش میں ایک تیر باقی تھا جو کہ میری زندگی کو ناسور بنا گیا۔

پھوپھو اب کبھی کبھی ہمارے گھر آنے لگی تھیں اور چند دن رہتی بھی تھیں۔ ہم خوش تھے کہ شاید پھوپھو کو بھی قرار آ گیا ہے۔ وہ عائشہ کے ساتھ کھیلتی رہتیں۔ عائشہ توتلی زبان میں دادی سے باتیں کرتی تو میری روح تک سرشار ہو جاتی۔

ایک دن پھوپھو نے کہا۔ "مجھے بازار سے کچھ چیزیں لینی ہیں' گھنٹے دو گھنٹے میں واپس آجاؤں گی۔ تمہارے لیے کیا لاؤں چندا؟" انہوں نے گڑیا سے کھیلتی عائشہ سے پوچھا۔

"میلے لیے اتھی سی ڈولا لانا۔" عائشہ نے توتلی زبان سے کہا۔

"اس جیسی؟" انہوں نے عائشہ کی گڑیا کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں نہیں..... اتے بھی اتھی۔" عائشہ بولی۔

"ایسا کرو' تم بھی ساتھ چلو میں تمہیں ایک خوبصورت فراک بھی دلا دوں گی اور گڑیا بھی۔ تم خود پسند کر کے لے لینا۔" پھوپھو نے کہا۔

"نہیں پھوپھو..... یہ آپ تو تنگ کرے گی۔" میں نے کہا۔

"ارے نہیں' اولاد کا تنگ کرنا بھی اچھا لگتا ہے۔" انہوں نے دلار سے کہا۔ "چلو جلدی سے اسے تیار کرو' قریب ہی تو جانا ہے۔"

پھوپھو کوئی غیر تو تھیں نہیں جو مجھے اعتراض ہوتا۔ وہ عائشہ کی دادی تھیں۔ میں نے عائشہ کو نیا فراک پہنا کر تیار کیا۔ وہ گڑیا سی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ میں نے نظروں نظروں میں اس کی بلائیں لیں۔ وہ ہنستی ہوئی اپنی دادی کے ساتھ چلی گئی۔ میں جلدی جلدی گھر کا کام نپٹانے لگی۔ امی اور بہن اسکول گئی ہوئی تھیں۔ کھانا بنانے کے بعد میں آرام کرنے لگی۔ امی وغیرہ بھی اسکول سے واپس آ گئیں۔ آتے ہی عائشہ کا پوچھا۔

"وہ ذرا پھوپھو کے ساتھ شاپنگ کے لیے بازار تک گئی ہے۔ کھانا نکال دوں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں' تمہاری بیٹی آجائے تو مل کر کھاتے ہیں۔" ایک گھنٹہ گزر گیا۔

تب نجمہ نے فکر سے کہا۔ "کتنے بجے گئی ہیں محترمہ؟" اسے پھوپھو ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ امی نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

"وہ..... دس بجے ہوں گے۔" میں نے بھی فکرمندی سے جواب دیا۔

"اب چار بج رہے ہیں' کیا سارا کراچی خریدیں گی؟ قریب ہی تو بازار ہے؟" نجمہ بڑبڑانے لگی۔ واقعی شام ہونے کو تھی مگر پھوپھو کا کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔ اب تو ہم سب کو فکر ہونے لگی۔ کراچی کے حالات کا پتہ نہ تھا تو کب کیا ہو جائے۔ جب اندھیرا چھانے لگا تو میں نے رونا شروع کر دیا۔ امی نے فون کر کے سب جگہ معلوم کیا' وہ کسی عزیز کے گھر نہیں تھیں' ویسے بھی ہمارے کون سے زیادہ عزیز تھے..... ثوبیہ اور پھوپھو دونوں کے فون آف جا رہے تھے۔

"مجھے تو شروع سے پھوپھو اچھی نہیں لگتی تھیں۔" نجمہ بڑبڑانے سے باز نہیں آ رہی تھی۔ امی گھبراہٹ میں اسے ڈانٹے جا رہی تھیں اور میں نے تو اب باقاعدہ بین شروع کر دیا تھا۔

"دیکھو' چپ ہو جاؤ' اس طرح رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ خدا کو یاد کرو اور دُعا کرو کہ وہ خیریت سے ہوں۔" امی مجھے سمجھانے لگیں۔

"خیریت سے ہی ہوں گی وہ بڑی بی' بس ہمیں پریشان کر کے تڑپا کر ہی انہیں چین ملتا ہے۔ ساری زندگی انہوں نے ہمیں تنگ ہی تو کیا ہے' یہ پھوپھو ہیں ہماری۔" نجمہ باقاعدہ شروع ہوگئی۔

"اپنا منہ بند کرو....." امی نے اسے گھرکا تو وہ پیر پٹختی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔ اب مغرب کا وقت بھی گزر گیا تھا اور عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ ہم نے نماز پڑھی۔ روتے' گڑگڑاتے' سوتے' جاگتے رات کٹی۔

صبح صبح پہلی بس سے گاؤں بھاگے۔ دوپہر کے قریب وہاں پہنچے تو گھر کو تالا دیکھ کر میں تو وہیں گر پڑی۔ سب رشتے دار پڑوسی جمع ہوگئے۔ امی اور نجمہ نے مجھے سنبھالا۔ ہوش آنے کے بعد روتے روتے میری تو آواز بیٹھ گئی۔ گاؤں میں سب پھوپھو کی اس حرکت پر حیران تھے اور خیر کی دُعائیں مانگ رہے تھے۔ عزیز احباب سب ہمیں تسلیاں دے رہے تھے۔ گاؤں میں سب ساتھ ہی رہتے ہیں' پیڑھیوں سے نسل در نسل..... مر دار گر کانے کے سلسلے میں باہر ہوتے ہیں شہروں میں مگر یہی بچے اپنے بڑوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں مگر اب یہ سسٹم ختم ہوتا جا رہا ہے'

www.pdfbooksfree.pk

شاید اسی لیے محبت اور برکت بھی کم ہو گئی ہے۔ وہیں ہمیں یہ پتہ چلا کہ تنویر کا تبادلہ دوسرے شہر میں ہو گیا ہے اور وہ کچھ سامان اور چار سالہ مہتاب کو ساتھ لے گیا ہے۔ خدا خدا کر کے تنویر کا نمبر ملا تو یہ جان کر حیرت کا جھٹکا لگا کہ اس کا تو تبادلہ ہوا ہی نہیں ہے وہ کراچی میں ہی ہے مہتاب کے ساتھ۔ اس نے سب احوال سننے کے بعد کہا کہ میں فوراً نکلتا ہوں۔ مجھ پر تو بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ امی مجھے کرائے کی گاڑی میں گاؤں سے واپس گھر لے آئیں۔ مجھے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ مجھے جب بھی ہوش آتا' عائشہ.....! عائشہ.....! پکارتی۔ دس پندرہ دنوں میں طبیعت کچھ سنبھلی اور ڈسچارج ہو کر گھر آ گئی۔ تنویر اور امی دونوں نے چھٹی لی ہوئی تھی۔ اخبار' ٹی وی' ریڈیو ہر جگہ اشتہارات دیئے لیکن پھوپھو اور تو بہ نے کوئی پتہ نہ تھا۔ تنویر کو تو اس بات کی حیرت تھی کہ تو بہ نے بھی اسے کچھ نہیں بتایا تھا اور خود بھی تو چار سال کا مہتاب چھوڑ گئی تھی۔ کیا اسے اپنے بیٹے کی یاد نہیں ستاتی؟ ہمارے پاس ان سب سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا سوائے آہیں بھرنے اور رونے کے.....!

وقت کسی کے لیے نہیں ٹھہرتا' سو میرے دن بھی گزرنے لگے۔ تنویر نے مہتاب مجھے سونپتے ہوئے کہا کہ اسے عائشہ کی جگہ لے لو۔ تمہاری ممتا کو کچھ نہ کچھ تسلی ہو جائے گی اور میں بس چپ چاپ خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

زندگی اپنی ڈگر پر چلنے لگی۔ امی اور نجمہ پڑھانے کو جانے لگیں۔ تنویر اپنی ڈیوٹی پر لوٹ گیا۔ میں اور مہتاب گھر میں ہوتے۔ وہ بہت سعادت مند بچہ تھا' کبھی تنگ نہیں کرتا تھا بلکہ اگر میں چپ چاپ لیٹی ہوتی تو میرا سر دبایا کرتا' میرے آس پاس ہی رہتا' میرے ساتھ ہی سوتا' اسی وجہ سے میرا دھیان اس کی طرف ہونے لگا۔ میری ممتا اس کی طرف متوجہ ہونے لگی۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا' میرے چھوٹے موٹے کام کرتا' تب مجھے اس پر بہت پیار آتا کہ یہ بھی تو اپنی ماں سے دور ہے' یہ بھی تو میرے جیسا ہی ہے بلکہ یہ تو ابھی چھوٹا ہے۔ وہ میرے سامنے کبھی ماں کو یاد نہیں کرتا تھا۔ بہت حساس بچہ تھا اور پھر ہم دونوں واقعی ماں بیٹے بن گئے۔ عائشہ کی یاد ایک پھانس کی صورت دل میں پیوست تھی۔ جب اُس کی یاد آتی' دل سے دُعا نکلتی۔ ''خدا اُسے خوش و سلامت رکھے۔'' اس دوران میں نے بھی ٹیچنگ کر لی تھی۔ مہتاب اسکول جانے لگا تھا۔ تنویر کو تو اس بات کی حیرت تھی کہ تو بہ نے بھی اسے کچھ نہیں بتایا تھا اور خود بھی تو چار سال کا مہتاب چھوڑ گئی تھی۔ کیا اسے اپنے بیٹے کی یاد نہیں ستاتی؟ ہمارے پاس ان سب سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا سوائے آہیں بھرنے اور رونے کے.....!

عید پر تنویر آیا تو بہت خوش تھا۔ اس کی دوسری بیوی ثریا اچھی لڑکی تھی۔ وہ پندرہ دن رہ کر چلا گیا۔

اکثر امی کہتیں کہ اگر میں بھائی کی محبت میں اندھی نہ ہوتی تو آج میری بیٹیاں بھی اپنے گھروں میں آباد ہوتیں کیونکہ نجمہ تو جب بھی رشتے کا سنتی کہ اس کا رشتہ آیا ہے تو سارا گھر سر پر اٹھا لیتی۔

''باجی نے بہت سمجھ دیکھ لیے' آپ نے ساری عمر بیوگی میں گزار دی۔ اب آپ مجھے بھی برباد کرنا چاہتی ہیں؟ سبق سیکھیں اپنی اور باجی کی زندگی سے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں' ہماری قسمت میں شوہروں کے سکھ نہیں ہیں۔'' وہ غصے سے پیر پٹختی اندر کمرے میں چلی جاتی اور امی سر پکڑ کر بیٹھ جاتیں جبکہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟

ہماری روکھی پھیکی زندگی گزر رہی تھی۔ تنویر سال دو سال میں آتا۔ اس کے دو بچے اور ہو گئے تھے۔ وہ مہتاب کے لیے کھلونے وغیرہ اور خرچ کے پیسے بھیج دیا کرتا تھا جو کہ میں بینک میں اس کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتی تھی۔ اسکول میں میری ترقی ہوتی رہی۔ مہتاب بھی سال بہ سال قد اور پڑھائی میں بڑھتا رہا۔ کبھی اس نے باپ کے ساتھ جانے کی بات نہیں کی بلکہ میں نے کبھی کہا بھی تو کہتا کہ میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا امی جان۔ اور میں سرشار ہو جاتیں کہ میری یہی خوشی تھی۔

ایک دن امی بھی میرا ساتھ چھوڑ گئیں۔ تنویر آیا' چالیسواں کر کے چلا گیا۔ میں نے بھی وہ گھر' وہ شہر چھوڑ دیا۔ نجمہ اور مہتاب کو لے کر دوسرے شہر آ گئی۔ ایک سال بعد نجمہ بھی اچانک ہی ساتھ چھوڑ گئی اور میں تنہا رہ گئی تھی۔ مہتاب جو کہ اب انجینئرنگ کے پہلے سال میں تھا' میرا بہت خیال رکھنے لگا تھا۔ وہ ہاسٹل میں رہتا تھا' تاہم نجمہ کے بعد میرے ساتھ رہنے لگا۔ وہ بہت فرماں بردار بیٹا تھا۔ وہی تو میری زندگی کا حاصل تھا۔ عائشہ تو اب کسک بن کر رہ گئی تھی۔

کئی دنوں سے میں نوٹ کر رہی تھی کہ مہتاب کے چہرے پر ہر وقت جگمگاتی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ میں چائے بناتے ہوئے اسی حوالے سے سوچ رہی تھی کہ مہتاب باتیک کی چابی گھماتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔

''مام.....! میں ذرا ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں' آپ دروازہ لاک کر لیجیے گا۔''

''بہت خوش لگ رہے ہو اور بڑے اہتمام سے تیار ہوئے ہو۔ کیا کوئی خاص دوست ہے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ہاں مام' بس آپ کو بھی ملواؤں گا۔''

''ضرور' ضرور۔'' میں نے ہنستے ہوئے گیٹ لاک کیا۔ اب وہ اکثر اپنی دوست کی باتیں بڑے شوق سے کرتا تھا۔ اس کا نام ستارہ تھا' وہ اسے اپنے دوست کی شادی میں ملی تھی اور مہتاب اسے دیکھتے ہی دل ہار بیٹھا تھا۔

''ستارہ کا ایک چھوٹا بھائی اور ایک بڑی بہن ہے جو کہ کسی اسکول میں پڑھاتی ہے۔'' مہتاب نے اس کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا۔

''باپ.....'' میں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''پتہ نہیں' نہ کبھی ستارہ نے بتایا نہ میں نے کبھی پوچھا۔'' مہتاب نے کہا۔

پھر امتحانات کی وجہ سے کئی مہینے چپکے سے بیت گئے۔ پہلے میرے اسکول میں سالانہ امتحانات پھر اس کا رزلٹ' شیٹ کی تیاری پھر نئی کلاسز' اوپر سے گرمیاں' حبس روم روم میں اتر جاتی تھی۔ کسی طرف دھیان نہیں جاتا تھا۔

اُس دن اتوار تھا' میں فارغ تھی۔ اسکول کے کاموں سے نجات ملی تھی' بس چھٹیوں کا کچھ کام رہ گیا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ میں ابھی نہا کر فریش ہو کر نکلی تھی۔

''یہ لیجیے گرم گرم چائے۔'' مہتاب نے دو کپ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی مام کے لیے اپنے ہاتھ سے بنا کر لایا ہوں۔''

''شکریہ۔ ماسی کہاں ہے؟'' میں نے پیار سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ دوپہر کا کھانا بنا رہی ہے۔'' مہتاب نے جواب دیا۔ ''مام' اگر آپ کہیں تو میں آج ستارہ کو انوائیٹ کر لوں شام کی چائے پر؟''

''ہاں' ہاں' کیوں نہیں۔'' میں خوش ہو گئی۔ ہر ماں کو بیٹے کی شادی کا ارمان ہوتا ہے' مجھے بھی تھا۔

پھر کب شام ہوئی' پتہ بھی نہ چلا۔ ستارہ سے ملنے کا مجھے بہت اشتیاق تھا اس لیے میں لان میں بیٹھی سراپا انتظار تھی۔ بار بار نظریں گیٹ کی طرف

www.pdfbooksfree.pk

اٹھ جاتی تھیں۔ مہتاب انہیں لینے گیا تھا اور میں نین بچھائے بیٹھی تھی۔

انتظار کی گھڑیاں کٹیں اور کار آ کر گیٹ پر رکی۔ میں گیٹ کی طرف بڑھی۔ کار میں سے مہتاب اور ایک اٹھارہ بیس سال کی لڑکی اتری۔ وہی ستارہ تھی۔

"ستارہ.....! یہ میری مام ہیں۔" مہتاب نے تعارف کرایا۔ وہ گرم جوشی سے ملی پھر ہم نے مل کر چائے پی لیکن میری نظریں تو اس کے چہرے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ مجھے ایک عجیب سی کشش اُس میں محسوس ہو رہی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد بھی میں بے چین رہی تھی۔

"مام.....! ستارہ کیسی لگی آپ کو؟" مہتاب نے مجھ سے پوچھا۔

"بہت ہی پیاری ہے۔"

"اوہ! شکریہ مام.....!" مہتاب مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے بھی اُسے چوما۔

ایک شام گرمی اور حبس بھی بہت تھا۔ میں کھڑکی سے لان کو دیکھ رہی تھی کہ مہتاب آ گیا۔

"مام.....! چلیے' باہر چلتے ہیں۔ آئس کریم کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"نہیں' تم جاؤ۔" میں نے کسلمندی سے کہا۔

ہم نے آئس کریم کھائی' لانگ ڈرائیو کی تو موڈ اور موسم دونوں تبدیل ہو گئے۔ خوشگواری ہوا چلنے لگی تھی۔ رات ہونے کو تھی۔ مہتاب نے پھل اور مٹھائی لے کر گاڑی میں رکھی۔

"اتنا کچھ تو کھا لیا ہے' یہ سب.....؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مام.....ہم ستارہ کے گھر جا رہے ہیں۔" اس نے کہا۔ چہرے پر خوشی کا رنگ نمایاں تھا۔

"لیکن اس طرح' اچانک.....؟" میں ہچکچائی۔

"اچھا' آپ کا موڈ نہیں تو کینسل....." اس کا چہرہ بجھنے لگا۔

"نہیں' یہ بات نہیں ہے۔"

"تو پھر چلیے نا....." وہ اصرار کرنے لگا۔

"ٹھیک ہے بیٹا.....چلو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جیو مام.....!" اس نے نعرہ لگایا۔ اگنیشن میں چابی گھمائی۔ راستے بھر وہ ستارہ کے بارے میں بتاتا رہا اور میں سنتی رہی۔

"ستارہ کے ابو فوت ہو چکے ہیں۔ وہ چار بہن بھائی ہیں' بڑی بہن ٹیچر ہے۔ ایک چھوٹی بہن اور بھائی ہے۔ ماں گھر پر کپڑے وغیرہ سیتی ہیں۔" ابھی اس کی باتیں جاری تھیں کہ گاڑی ایک چھوٹے سے گیٹ پر رکی' تب میں نے ارد گرد دیکھا کہ کوئی نئی آبادی تھی' کچھ مکان بن رہے تھے' کچھ بنے ہوئے تھے' آبادی بھی کم کم تھی۔ میں گاڑی میں بیٹھی رہی۔ مہتاب نے بیل دی تو ایک نوعمر لڑکے نے گیٹ کھولا اور مہتاب کو دیکھ کر گیٹ سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میں بھی گاڑی سے اتری اور مہتاب نے پھل وغیرہ اٹھا لیے' تب تک ستارہ بھی گیٹ پر آ گئی تھی اور ہمیں اندر لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ باتوں کے دوران پتہ چلا کہ ستارہ کی امی اور بڑی بہن کہیں شادی کی تقریب میں گئی ہوئی ہیں۔

"اگر پتہ ہوتا آپ لوگ آ رہے ہیں تو میں انہیں روک لیتی۔" ستارہ نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ مہتاب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں' بس اچانک ہی موڈ بن گیا۔ خیر' تمہاری امی سے پھر کبھی مل لیں گے۔" میں نے کہا۔ اسی وقت ایک لڑکی چائے کی ٹرے تھامے داخل ہوئی۔

"السلام علیکم!" اُس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" میں نے جواب دیا۔

"یہ میری چھوٹی بہن رخشندہ ہے۔ میٹرک میں ہے۔" ستارہ نے تعارف کروایا۔ پتہ نہیں کیوں رخشندہ کو دیکھ کر میرے دل پر عجیب سا بھاری پن چھانے لگا کیونکہ اس کی ہنسی' لہجہ سب مجھے پھوپھی یاد دلا رہا تھا۔ میں زیادہ دیر بیٹھ سکی نہ چائے پی سکی۔ میرا بی پی ہائی ہونے لگا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئیں اور ہم گھر چلے آئے۔

"مام' آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو بتانا تھا نا؟" مہتاب پریشان ہو رہا تھا۔

"بس تھوڑا آرام کروں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

"مام' آپ کو عائشہ یاد آ رہی ہے نا؟" اُس نے اچانک پوچھ لیا۔ میں اُسے دیکھتی رہی اور اثبات میں سر ہلایا۔ "اگر وہ ہوتی تو....."

"تو.....تو....." میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میں اُسے تمہاری دلہن بناتی۔" میرے لہجے میں دکھ اتر آیا تھا۔

"یہ بات ہے تو انشاء اللہ وہ ضرور ملے گی۔"

"اور ستارہ.....!" میں بولی۔

"آپ سے زیادہ مجھے کوئی بھی عزیز نہیں۔" اُس نے میری گود میں سر رکھ دیا۔

"میری جان.....! میرے بچے.....!" میں ہلکی ہونے لگی تھی۔

اگلی صبح بھی میں اسکول نہیں جا سکی اور مہتاب بھی گھر پہ تھا۔ ایسا اکثر ہوتا جب میری طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی تو وہ بھی چھٹی کر لیتا اور سارا دن میری خدمت کرنے اور میرا دل بہلانے میں لگا رہتا' لطیفے سنا سنا کر مجھے ہنساتا رہتا۔ شام تک میری طبیعت کافی بہتر ہو چکی تھی۔ مہتاب باہر گیا ہوا تھا۔ بیل بجنے پر

غزل

آؤ سفر کی شام' کوئی فیصلہ کریں
لے کر خدا کا نام' کوئی فیصلہ کریں

آؤ کہ ہم تعینِ منزل کریں ابھی
یہ کیا کہ گام گام کوئی فیصلہ کریں

آؤ کہ توڑ ڈالیں انا کا بھرم ابھی
لمبی ہے غم کی شام' کوئی فیصلہ کریں

ہم آج ہی سے چھوڑ دیں صحبتیں بری
سب کو کریں سلام' کوئی فیصلہ کریں

محسن فنا کے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا
کس کو یہاں دوام' کوئی فیصلہ کریں

محسن سلیم

www.pdfbooksfree.pk

ماسی نے آ کر بتایا کہ ستارہ اور اس کی امی آئی ہیں۔ وہ چار لوگ ہیں۔

"ہم نہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ' میں آتی ہوں۔" ماسی چلی گئی۔ میں نے اٹھ کر واش روم کا رخ کیا۔

ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی میں ساکت سی رہ گئی۔ سامنے صوفے پر بیٹھی عورت کو بھلا میں کیسے بھول سکتی تھی؟ بیس سال کی دھول پڑنے کے باوجود میں نے ثوبیہ کو پہچان لیا تھا اور وہ بھی مجھے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی تھی پھر اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی تھی اور رونے لگی تھی۔ وہ مجھے چوم رہی تھی۔ بچے حیران پریشان سے کھڑے تھے۔ اس دوران مہتاب بھی آ چکا تھا۔ میں نے جھٹکے سے خود کو ثوبیہ سے چھڑایا۔ میں اُس وقت غصہ اور الم دونوں کیفیتوں سے دوچار تھی' شاید میں گر نے لگی تھی۔ مہتاب نے مجھے تھام کر صوفے پر بٹھایا۔ میری سرد مہری کو ثوبیہ نے بھی جیسے محسوس کر لیا تھا اور وہ اب خاموشی سے مجھے دیکھ رہی تھی لیکن میرا دل تو سائیں سائیں کر رہا تھا' کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا' کیا کہوں' کیا نہ کہوں۔

ثوبیہ پھر اٹھی اور ستارہ کو میرے سامنے لاتے ہوئے بولی۔ "یہ..... یہ..... دیکھو..... یہ تمہاری بیٹی عائشہ ہے جسے میں نے اپنے بچوں سے بھی زیادہ پیار دیا ہے۔ میں تمہاری مجرم ہوں مجھ سے بے شک نہ بولو لیکن اپنی بیٹی کو تو سینے سے لگا لو۔" میں نے ستارہ کی طرف دیکھا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرے اندر جیسے یکدم ممتا کا جوالا مکھی بھڑک اٹھا اور میں نے اٹھ کر اُسے سینے سے لگا لیا اور دیوانوں کی طرح اُسے پیار کرنے لگی۔ اب آنسو بہانے کی باری میری تھی۔

"میری بچی..... !میری عائشہ..... !میری جان..... !" میں پیار کر رہی تھی جب جذبات کا طوفان تھما تو گلے شکوے ہوئے اور ثوبیہ میرے قدموں میں بیٹھی معافیاں مانگ رہی تھی۔

اس نے بتایا۔ "پھوپھو نے نہ جانے کب یہ پلان بنایا تھا..... وہ سمجھتی تھیں کہ تم' تمہاری ماں بہت چالاک ہو اور وہ اپنے بیٹے کی جدائی میں تڑپتی ہیں' اسی طرح وہ تمہیں بھی اولاد کے دکھ میں تڑپانا چاہتی تھیں اور یہ سب کچھ مجھے بھی نہ بتایا گیا۔ اگر بتاتیں تو میں مہتاب کو تنہا نہ کے ساتھ بھی نہ بھیجتی۔ ہم اتنی دور چلے گئے تھے کہ وہاں سے آنا مجھ اکیلی عورت کے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے بھی تو اپنے بیٹے کی جدائی سہی ہے' میں بھی پل پل روتی ہوں' جانے میرا بیٹا کیسا ہوگا؟ لیکن تمہارا دکھ میرے دکھ سے بڑا ہے۔ میرے پاس میری بیٹی سارا اور یہ عاصم جو کہ میری کوکھ میں تھا' بعد میں پیدا ہوا۔ تمہاری پھوپھو فالج کا عذاب سہہ کر چل بسیں۔ آخری وقت میں وہ تمہیں یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافیاں مانگتی رہی تھیں۔" ثوبیہ رو رہی تھی۔

"یہ رہا تمہارا بیٹا مہتاب.....!" میں نے مہتاب کو اُس کے سامنے کر دیا۔ "تنہیہ نے یہ مجھے دے دیا تھا۔ اس نے دوسری شادی کر لی ہے۔ وہ یو کے میں ہے۔"

سالوں کی جدائی' ممتا کا درد' گلے شکوے' سب آنسوؤں کی صورت میں بہہ رہے تھے' ہم سب رو رہے تھے کہ آنسوؤں میں دلوں کو دھونے کی طاقت ہے۔ یہ من کو ہلکا کر دیتے ہیں اور آنکھیں صاف و شفاف ہو کر مسکرانے لگتی ہیں۔ میں نے سب کو دل سے معاف کر دیا تھا کیونکہ معافی میرے رب کی صفت ہے۔ آگ کا دریا پار کر کے مجھے آج اتنی خوشیاں ملی ہیں۔ آپ لوگ دعا کریں کہ خدا ان خوشیوں کو قائم و دائم رکھے۔ (آمین!)

شہید کی کہانی | ہمارے وطن کا دفاع کرنیوالے شہیدوں کے حوالے سے ایک دلگداز سوچ

منزہ سہام مرزا





علامہ اقبال کی پرواز خیال
شہادت ہے مطلوب و مقصود مؤمن
نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی

قوم کو حیات بخشنے والے شہیدوں کی سوچ پر مبنی ایک دل گداز سلسلہ

بہت سارے دن گزر گئے امید آس کے درمیان..... اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ کیسا ہوتا ہے' کبھی نظر نہ آنے کا خوف کیسا ہوتا ہے' مجھ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ ہاں' یہ بھی سچ ہے کہ میں بہت اچھی جگہ پر ہوں مگر یہ بھی تو سچ ہے کہ جن سے دور ہوا' جن سے بچھڑا' وہ بھی بہت پیارے تھے۔ میں نیلے آسمانوں سے جب انہیں اپنی یاد میں چپکے چپکے آنسو بہاتا دیکھتا تھا تو دل بہت دُکھتا تھا۔ میری بیوی نے میرے جانے کے بعد پھر کبھی رنگین کپڑے نہیں پہنے' کانچ کی چوڑیاں' کبھی نہیں پہنیں' مہندی سے ہاتھوں پر گل بوٹے نہیں بنائے۔ سارا دن کپڑے سفید دوپٹا اوڑھے گھر کے کاموں میں الجھی رہتی اور رات میں تسبیح فاطمہ کو سینے سے لگا کر ہولے ہولے سسکتی۔ کتنی عیدیں آئیں اور چلی گئیں' پر اُس کے سر سے وہ سفید اوڑھنی نہ ہٹی۔ میں تو بہت خوش ہوں' بہت اچھی جگہ ہوں' پر میری بیوی نے بہت سخت وقت گزارا۔ رنگ' خوشیاں' ہنسی جیسے تینوں سے اس کی لڑائی ہو گئی تھی۔ وہ بھی غلط نہیں تھی' میں اس کے سر کا سائیں تھا' اس کی ڈھال' اس کی چادر اور چار دیواری سب کچھ تو میں تھا' میں ہی نہیں رہا تو وہ بے چاری کیا کرتی؟ شیر علی جب ماں سے ننھے بستے اور جوتوں کے لیے کہتا' تب اس ایک بخت کی آنکھیں جھلملانے لگتیں۔ وہ بے بس تھی۔

ہم لوگوں کی زندگی بھی بڑی عجیب ہوتی ہے' زندہ ہوتے ہیں' تب بھی گھر والوں سے دور اور جب واقعی میں دور ہو جاتے ہیں' تب بھی گھر والے بھیگی بھیگی آنکھوں سے یاد کرتے ہیں' بس ہم اپنے پیاروں کو انتظار ہی انتظار دیتے ہیں لیکن سب سے بڑھ کر تو میرا وطن تھا' وطن کی خاطر جیا اور وطن کی خاطر ہی جان دی۔ میں خوش ہوں' مطمئن ہوں' فاطمہ بیٹی اپنے گھر میں خوش' شیر علی اپنی ماں کا بہت خیال کرتا ہے۔

مشکل وقت گزر گیا لیکن مشکل وقت کہاں گزرا؟ 07 اپریل 2012ء کو ایک بار پھر کئی خاندانوں پر

www.pdfbooksfree.pk

قیامت گزر گئی۔ 139 سپاہی منوں برف کے نیچے زندہ دب گئے۔ اُن کے گھر والے امید و آس کے درمیان معلق..... زندہ لوٹے تو غازی اور نہ لوٹے تو شہید مگر دل چپکے سے کہتا ہے کہ "آ جاؤ ابھی مت جاؤ چھوڑ کر زندگی کا سفر بہت طویل اور بہت کٹھن ہے۔ دھوپ بہت شدید سر کے سائیں میرے بابا دیر لاڈلے بیٹے! ہمیں پتہ ہے تمہیں پاکستان سے بہت پیار ہے مگر ہمیں بھی تو تم سے پیار ہے آنکھیں تمہیں دیکھنے کو ترستی ہیں پھر پتہ نہیں جاتے وقت کیا کیا سوچا ہوگا ماں کی آغوش چاہی ہوگی۔ باپ کے جھکے جھکے کاندھے دروازے کی آڑ میں منی کی انگلی تھامے کھڑا وہ ہولے ہولے کانپتا وجود زندگی سے بھرپور ہنسی سب بہت یاد آئے ہوں گے۔ بچپن سے جوانی تک کا سفر لمحوں میں نگاہوں کے سامنے سے گزرا ہوگا۔ اپنے بہت یاد آئے ہوں گے۔ لمحوں میں حضور نے اپنی آغوش میں لے لیا ہوگا۔ چمکتی آنکھوں اور دمکتی پیشانیوں نے استقبال کیا ہوگا۔ رضوان نے دروازہ کھولا ہوگا۔ برف سے نکل کر مخملی فرش پر قدم رکھے ہوں گے۔ ہر جانب پھول ہوں گے خوشبو ہوگی رنگ برنگی تتلیاں ہوں گی۔ وہاں سے زمین والوں پر تلاش کرنے والوں پر پیار بھری نظر ڈالی ہوگی۔ اُن کی محبت اور جذبے کو سراہا ہوگا۔ آسمانوں سے آواز بھی دی ہوگی۔ "مت کرو اتنی محبت مت ڈھونڈو ہمیں۔ اس خون جماتی برف میں ہم تو وہاں ہیں جہاں جانے کی آرزو ہر مومن کرتا ہے۔ ہم تو زندہ ہیں بس تمہیں اب کبھی نظر نہ آئیں گے کیونکہ ہم شہید ہیں اور شہید کبھی مرا نہیں کرتے۔

اپنی تلاش میں مصروف اپنے ساتھیوں پر پیار بھری نظر اُن کے اونچے درجوں کے لیے دُعا بھی کی ہوگی کیونکہ وہ شہید ہیں اُن کا رتبہ بہت بلند ہے وہ ہمیشہ اپنوں کے آس پاس ہی ہوں گے کیونکہ شہید مرا نہیں کرتے۔



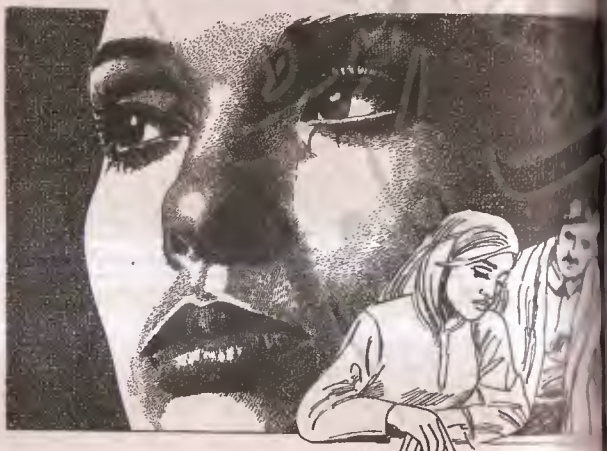
نفیسہ فضل

کیا وہ ماں تھی؟

مہناز بٹ ناز کا خیال

نہ خنجر ہو دل یہ ہرا ہی رہے
یوں ہی آنسوؤں کو پیا کرتے ہیں

اس عجیب عورت کا قصہ جو ماں جیسے مقدس رشتے کی توہین تھی



www.pdfbooksfree.pk

میرے ابو اسلام آباد کے ایک بینک میں آفیسر تھے۔ ہم دو بہن بھائی تھے ایک چھوٹا بھائی سفیان دس سال کی عمر میں فوت ہو گیا تھا اس کا ٹائیفائیڈ بگڑ گیا تھا۔ اب سب کی توجہ کا مرکز میں اور میرا بھائی ایان تھے۔ امی اکثر سفیان کو یاد کر کے روتی تھیں۔ سفیان بہت ذہین اور خوبصورت تھا۔ خوبصورت تو ہم دونوں بہن بھائی بھی تھے اور خوبصورتی کے معاملے میں اپنی امی اور ابو پر گئے تھے۔ جب امی سفیان کی یاد میں بہت اداس ہوتی تھیں تو ابو کہتے۔

"راشدہ.....! تم کوئی کورس کرلو اس طرح تمہارا دل بہل جائے گا۔"

ابو کے بار بار اصرار پر امی نے ہیومینٹیز کا کورس کرلیا۔ اسی طرح کئی برس گزر گئے۔

میں تھرڈ ایئر میں تھی اور ایان فرسٹ ایئر میں جب ابو کو اچانک بینک میں ہی ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ بینک والے انہیں اسپتال لے کر گئے۔ امی کو فون پر اطلاع ملی مگر ہمارے اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ابو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے۔ ابو کی اچانک موت سے ہم پر تو گویا قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی؛ ہمیں کچھ ہوش نہیں تھا کہ ہم کس طرح گھر واپس آئے؟ تھوڑی دیر میں تایا ابو، امی اور دیگر عزیز و اقارب سے گھر بھر چکا تھا۔ امی کو غش پر غش آرہے تھے اور ایان کا بھی رو رو کر برا حال تھا۔ ایک طرف اچانک ہی اپنے اتنے چاہنے والے ابو کے بچھڑنے کا صدمہ، دوسری طرف ماں کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ عصر کے وقت ابو کی میت سفرِ آخرت کے لیے لے جائی جانے لگی تو میں تایا ابو کے گلے لگ کر تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ ایک کاندھے سے ایان لگا کھڑا تھا۔ بمشکل مجھے اور ایان کو تایا ابو سے الگ کیا گیا۔

"ایان بیٹا.....! اپنے ابو کو اُن کی آخری آرام گاہ لے کر جانا ہے چلو۔"

یہ کہہ کر تایا ابو ایان کو سنبھالے باہر چلے گئے۔

اس کے بعد ہم پر کیا گزری، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ تایا ابو کا ٹرانسفر لاہور ہو گیا۔ ابو کے فنڈز وغیرہ کے سلسلہ میں ان کے ایک کولیگ شاہ زیب انکل نے کافی جدوجہد کی، ہمارا بہت ساتھ دیا۔

وہ امی سے کہتے۔ "بھابی! میرے ہوتے ہوئے آپ کو اور بچوں کو کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

انہوں نے ہماری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ سبزی، گوشت، پھل وغیرہ تک لا کر دیتے تھے۔ چھٹی کے دن وہ سامان سے لدے پھندے صبح ہی آجاتے۔ سارا دن ہمارے ساتھ گزارتے۔ اُس دن تو نئی ڈشز بنتی تھیں۔ اکثر وہ ہمیں گاڑی میں گھمانے بھی لے جاتے، کبھی میں یا ایان زیادہ اداس ہوتے تو پکچر بھی دکھا لاتے۔ اس دوران میرا گریجویشن کمپلیٹ ہو چکا تھا۔ میں فارغ تھی اور گھر پر ہی رہتی تھی۔

ایک دن دوپہر کو میں اپنے کمرے سے باہر آئی تو امی کے بیڈروم سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ ایان تو لاہور گیا ہوا ہے پھر امی کس سے باتیں کر رہی ہیں؟ یہ سوچ کر میں نے امی کے کمرے کا دروازہ آہستگی سے ذرا سا کھولا تو چکرا کر رہ گئی، میری پیاری امی جو ابو سے بے پناہ محبت کرتی تھیں، اُن کی یاد میں راتوں کو اٹھ کر روتی تھیں، شاہ زیب انکل کے سینے سے لگی بیٹھی تھیں۔ میں نے دروازے کو اسی طرح غیر محسوس طور پر بند کیا اور اپنے کمرے میں آکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شام تک جب میں کمرے سے باہر نہیں نکلی تو امی خود ہی کمرے میں چلی آئیں۔

"عزہ بیٹی! کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟"

میں نے امی کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر معصومیت اور محبت جچی ہوئی تھی۔ امی نے مسکراتے ہوئے میرے چہرے پر آئی لٹ کو ہٹا کر پیشانی پر بوسہ لیا اور ہاتھ پکڑ کر باہر لان میں لے آئیں۔ میز پر چائے اور دیگر لوازمات رکھے تھے، چائے کی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے امی بولیں۔

"عزہ.....! یہ شامی کباب لو گرم گرم ہیں، یہ بریانز میں نے تمہارے لیے بنائی ہیں۔"

"نہیں..... میرا دل کسی چیز کو نہیں کر رہا۔" یہ کہہ کر میں نے خاموشی سے چائے پی اور سر درد کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں واپس آ کر لیٹ گئی۔ دماغ الجھا ہوا تھا۔ میری حسین و جمیل ماں جو اپنے شوہر کی محبت کا دم بھرتی تھیں، اتنی جلد انہیں بھول گئی تھیں۔

اس دن کے بعد بھی کئی مرتبہ میں نے شاہ زیب انکل اور اپنی ماں کو اسی طرح تنہائی میں دیکھا مگر میں کچھ نہ کہہ پائی۔

ایک دن امی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بڑے پیار سے میرا ہاتھ تھام کر اپنے قریب بٹھا کر بولیں۔ "عزہ.....! میری جان.....! میں نے تمہاری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور چاہتی ہوں کہ اس فرض سے جلد سبکدوش ہو جاؤں۔ شاہ زیب ایک اچھا اور نیک لڑکا ہے، یہاں اس کا کوئی نہیں ہے، ایک بھائی لاہور میں ہے، والدین حیات نہیں ہیں، ایک بہن اور بھائی امریکہ میں سیٹل ہیں۔"

شاہ زیب کا نام سن کر ہی میرے دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ یہ امی کیا کہہ رہی تھیں؟ کتنی مرتبہ میں امی کو شاہ زیب کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ چکی تھی۔

"امی.....! میں شادی کرنا نہیں چاہتی، میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔" میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"بیٹا! میں چاہتی ہوں تم جلد اپنے گھر کی ہو جاؤ۔" امی نے اصرار کرتے ہوئے کہا پھر میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود امی نے میری شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اُن دنوں گھر میں شاہ زیب کی آمد و رفت بھی کم ہو گئی تھی۔ میں اپنی ماں کی چال اچھی طرح سمجھ رہی تھی، وہ جوان بچوں کی ماں تھیں اس لیے شاہ زیب سے دوسری شادی کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھیں، چنانچہ میری شادی شاہ زیب سے کر کے ان کا ناجائز تعلق برقرار رہ سکتا تھا۔ میرے ہزار منع کرنے کے باوجود امی نے میری شادی کی تاریخ طے کر دی، شاید میں بزدل تھی کہ اپنی ماں سے یہ نہ کہہ سکی کہ مجھے آپ کے اور شاہ زیب کے تعلقات کا علم ہے۔ میں کتنی ہی بار آپ کو شاہ زیب کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے دیکھ چکی ہوں۔

وہ دن بھی آ گیا جب مجھے میری مرضی کے خلاف شاہ زیب کے نکاح میں دے دیا گیا۔ اپنی شادی پر لڑکیاں کتنی خوش ہوتی ہیں، پہلی رات کا تصور ہی انہیں گدگدا تا ہے مگر میں..... میں تو انگاروں پہ لوٹ رہی تھی۔ دولہا میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا جب شاہ زیب خوبصورت شیروانی میں ملبوس کسی شہزادے کی طرح چلتا ہوا جلسۂ عروسی میں داخل ہوا اور بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اگر شاہ زیب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں بھی سمٹ سمٹا کر دلہنوں کی طرح شرما لجا کر بیٹھی ہوتی مگر میرے دل میں امنگوں کی بجائے نفرت بھری ہوئی تھی جو میرے سینے کو دہکا رہی تھی اور جب شاہ زیب نے میری طرف بڑی محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا کہ عزہ.....! تم تو خوش ہونا اس شادی سے؟ تب میں پھٹ پڑی تھی۔

"خوش.....؟ یہ شادی میری ماں نے میری مرضی کے خلاف کی ہے۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں، شدید نفرت..... میں جانتی ہوں میری ماں اور تم کیا کھیل کھیل رہے ہو اور میں اس شرمناک کھیل کا حصہ بننا نہیں چاہتی۔ میری ماں نے تم سے تعلق قائم رکھنے کے لیے مجھے سولی پر چڑھایا ہے مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔" شاہ زیب حیران حیران سا مجھے دیکھے جا رہا تھا اس کے پاس کہنے کو گویا الفاظ ہی نہیں تھے۔ میں

www.pdfbooksfree.pk

نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ابھی اسی وقت طلاق چاہیے‘ طلاق.....“ اور میں جواپنے پاس کاغذ قلم لے کر بیٹھی تھی‘ اس سے طلاق لکھوا کر ہی دم لیا۔ شاہ زیب کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بیڈروم سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دروازہ لاک کیا اور اطمینان سے سوگئی۔

صبح جب امی وغیرہ آئیں تو میں اُن کے سامنے بھی پھٹ پڑی۔ ”آپ نے اپنی من مانی کرلی ناں‘ میں نے بھی اپنی مرضی کرلی‘ یہ دیکھیں طلاق نامہ.....“

امی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایان کو جب تمام صورتِ حال معلوم ہوئی تو وہ مجھے گلے لگا کر بہت رویا تھا پھر اس نے فیصلہ کیا کہ ہم کچھ سچ کرلاہور چلے جاتے ہیں۔ امی تو گھر بیچنے پر راضی ہی نہیں تھیں مگر ایان نے ان سے منوا کر ہی دم لیا۔ پندرہ دن کے اندر اندر ہم وہ گھر سچ کرلاہور آگئے۔ یہاں ہم نے گلشنِ راوی میں گھر خریدا تھا۔

ایان نے امی کو دو لاکھ روپے دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”امی! ہم آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتے‘ آپ تو بڑی وفاشعار بیوی تھیں‘ آپ نے ابو کے ساتھ تو بے وفائی کی ہی تھی اپنی سگی بیٹی کو بھی نہ چھوڑا؟ شاہ زیب تو غیر مرد تھا۔ آپ تو ماں تھیں‘ آپ کو ذرا لاج نہ آئی؟“

امی اس کی باتوں کے جواب میں کچھ نہ بول سکیں۔

کچھ عرصے بعد امی نے ہمارے گھر سے ذرا دور مکان کرائے پر لے لیا۔ تھوڑے ہی دن بعد شاہ زیب بھی اسلام آباد سے لاہور شفٹ ہوگیا اور امی کے ساتھ اسی گھر میں رہنے لگا۔ امی نے ان دو لاکھ روپوں سے شاہ زیب کو ایک چھوٹی سی دکان کرادی۔ ایک ہی محلے میں رہنے کی وجہ سے امی کی ہر بات کی خبر ہمیں ہوتی تھی۔ نجانے کس طرح لوگوں کو علم ہوگیا کہ امی اور شاہ زیب‘ میاں بیوی نہیں ہیں‘ بس کسی نے تھانے میں اطلاع کردی کہ فلاں گھر میں جو لوگ رہتے ہیں‘ وہ میاں بیوی نہیں ہیں۔ پولیس آئی اور ان دونوں کو تھانے لے گئی۔ ان پر حدود آرڈیننس کا کیس تھا۔ کسی طرح شاہ زیب کے بڑے بھائی کو اس بارے میں پتہ چل گیا۔ انہوں نے منت کرائی‘ بڑی رسوائی ہوئی‘ پھر انہوں نے کافی برا بھلا کہہ کر انہیں نکاح کرنے کے لیے کہا مگر نجانے ان دونوں نے کیا سوچ رکھا تھا کہ نکاح نہیں کیا۔ اسی طرح بے غیرتی کی زندگی گزارتے رہے۔

مدرز ڈے آتا ہے تو میں میڈیا پر ماں کے حوالے سے لوگوں کے تاثرات سنتی اور پڑھتی ہوں تو دل کٹ کر رہ جاتا ہے کہ دنیا میں کیسی کیسی مائیں ہیں اور ایک میری ماں ہے جس نے اپنی عیاشیوں کے لیے اپنی بیٹی کی زندگی داؤ پر لگادی۔ اس نے میری زندگی میں زہر بھر کے رکھ دیا ہے۔ اسے ماں کہتے ہوئے ہمیں شرم آتی ہے۔

کاش‘ ہمارے ابو کی بجائے امی کو موت آجاتی۔

آج لوگوں کی باتیں تو نہ سننا پڑتیں۔ قارئین‘ یقین کریں‘ میں نے تو گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اب کون شریف انسان مجھ سے شادی کرے گا؟ ابھی کچھ دنوں پہلے ایان نے بھی انتقاماً شاہ زیب کے خاندان کی لڑکی بھگا کر کورٹ میرج کرلی۔ شاید اس نے ایسا کرکے اپنے اندر کی آگ بجھالی مگر میں ایک کمزور لڑکی رونے اور کڑھنے کے سوا کیا کرسکتی ہوں؟ آپ سب سے التماس ہے‘ میرے لیے دُعا کریں۔ اللہ پاک مجھے بھی خوشیاں عطا فرمائے۔ (آمین!)

یہ کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی‘ امی کا کرشن نگر میں روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا تو شاہ زیب نے بھی شادی کرلی۔ شادی کے تین سال تو بہت اچھے گزرے پھر اچانک ہی اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ اس کے چھ ماہ بعد ہی شاہ زیب ایک رات جو سویا تو صبح دیکھنا اسے نصیب ہی نہیں ہوئی۔ جب اسے موت آئی تو کوئی اس کے منہ میں پانی ڈالنے والا بھی نہیں تھا‘ وہ سسک سسک کر عبرت ناک موت مرا تھا۔

ایک بیٹی ایسی بھی ہے

حنا بشریٰ

عاشر وکیل راؤ کا خیال

یہاں آتے ہیں سب موسم مگر لوٹ جاتے ہیں
تمہاری یاد کا موسم پلٹنا بھول جاتا ہے

ایسے معاشرے کی کہانی جہاں آج بھی عورت رسموں‘ روایتوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے

میرا نام اسفر علی خان ہے۔ میں عرصۂ دراز سے لندن میں مقیم ہوں۔ خوبصورت بیوی اور ایک بیٹا ہے۔ گھر‘ گاڑی‘ بینک بیلنس‘ کیا نہیں ہے جو میرے پاس نہ ہو مگر ایک کمی ہے جو میری روح سے لپٹی ہے‘ ایک درد دل میں بسا ہے‘ ضمیر کی خلش مجھے کسی پل چین لینے نہیں دیتی۔

اُس روز میں پورے پانچ سال بعد وطن واپس لوٹ رہا تھا۔ ایئرپورٹ سے گھر تک کے سفر کے دوران میں گھر اور گھر والوں کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا جس سے ایک سرشاری سی دل میں سرایت کرتی جارہی تھی۔

گھر والوں کو سرپرائز دینے کے لیے میں نے



www.pdfbooksfree.pk

اپنے آنے کی اطلاع بھی انہیں نہیں دی تھی۔ خوشی کے مارے میرا دل چاہ رہا تھا کہ پرلگیں اور میں اڑتا ہوا اس وسیع و عریض رقبے پر پھیلی شاندار حویلی پہنچ جاؤں جہاں میرے پیارے رہتے ہیں۔ آغا جانی' زرینہ پھوپھو' فیروز بھیا' اُن کی بیوی بھابھی شہ پارہ اور اُن کا کیوٹ سا بیٹا سعد! گل بینا چچی اور اُن کی دونوں بیٹیاں مہرالنساء اور نورالنساء!

چھوٹے چچا خان اصغر علی خان نے آغا جانی کی مخالفت کے باوجود گل بینا چچی سے شادی کی تھی جو خاندان سے باہر کی تھیں۔ بیٹے کے اس قصور پر آغا جانی نے انہیں کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ دو سال قبل چچا اپنے انتقال سے پہلے اپنی بیوی گل بینا چچی اور اپنی دونوں بیٹیوں کو حویلی لے آئے تھے۔

چچا نے فرسودہ خاندانی رسموں اور قوانین سے بغاوت کر کے گل بینا سے شادی کی تھی اور میرے خیال میں اس میں کوئی بری بات نہیں تھی مگر آغا جانی انتہائی سخت طبیعت کے مالک تھے' وہ اپنی خاندانی رسموں کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے۔ میرے اور آغا جانی کے درمیان یہی اختلاف تھا جس کی وجہ سے باپ بیٹا ہونے کے باوجود ہم ذہنی طور پر ہمیشہ دور رہے۔

گل بینا چچی کو اصغر چچا کی وفات کے بعد حویلی میں جگہ تو مل گئی تھی مگر دلوں میں نہ مل سکی۔ ان کی اپنائیت' سگھڑپن اور ملنساری کے باوجود وہ حویلی میں کوئی مقام حاصل نہ کر سکیں۔ یہ ملال ان کے چہرے پر ہمہ وقت رہتا تھا مگر انہوں نے مہرالنساء اور نورالنساء کی پرورش کی خاطر یہ سب قبول کر لیا تھا کہ جو کچھ بھی ہو' آخر وہ دونوں تھیں تو آغا جانی کا خون۔

بی بی جان کی وفات کے بعد مجھے اور فیروز بھیا کو گل بینا چچی نے ہی سنبھالا تھا اور انہوں نے ہمیں کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ ہم دونوں بھائیوں کو اُن سے خاص قسم کی انسیت تھی۔ ان کی بڑی بیٹی مہرالنساء اور ہم دونوں بھائیوں کا بچپن ساتھ گزرا تھا۔ نورالنساء اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ مہرو خاصی شوخ اور ہنس مکھ تھی۔ میں اور فیروز بھیا جب بھی شہر سے آتے تو اُن دونوں کے لیے ڈھیروں چیزیں لاتے تھے جنہیں پا کر مہرو کی آنکھیں چمک اٹھتی تھیں۔ مجھے اس کی آنکھوں کے یہ جگنو بہت عزیز تھے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مجھے مہرو سے خاص الفت ہو گئی تھی اور میری محبت کا علم وقت کے ساتھ ساتھ فیروز بھیا کے علاوہ زرینہ پھوپھو کو بھی ہو گیا تھا۔

زرینہ پھوپھو ہماری حویلی کا سنجیدہ بلکہ المیہ کردار تھیں۔ انہیں ہم نے کبھی ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سفید لباس میں یوں لگتیں جیسے حویلی میں کوئی روح بھٹک رہی ہو۔ ان کے ساتھ ہونے والے ظلم نے انہیں بہت خاموش سا کر دیا تھا۔ آغا جانی نے جہاں حویلی کی اور فرسودہ رسموں کو پروان چڑھایا تھا' وہیں قرآن پاک سے نکاح جیسی قبیح رسم بھی ان میں سے ایک تھی۔

ان کے مطابق' خاندان کی لڑکیاں باہر نہیں بیاہی جاتی تھیں اور اگر خاندان میں کسی لڑکی کا کوئی جوڑ نہیں ہوتا تو اس کا نکاح قرآن پاک سے کر دیا جاتا تھا۔ زرینہ پھوپھو اس رسم کی بھینٹ چڑھ گئی تھیں۔ وہ دل جس میں جینے کی امنگ تھی جو ہواؤں اور گھٹاؤں کے سنگ گاتا تھا' اسے قید تنہائی میں ڈال دیا گیا۔

میری اور مہرالنساء کی محبت دیکھ کر وہ ذرا مسکراتیں اور پھر ان کے چہرے پر دکھ و ملال کے رنگ بکھر جاتے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہمیں دکھ ہوتا تھا۔ مہرالنساء تو اکثر ان کے کمرے میں دکھائی دیتی تھی۔

وہ ان سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ آغا جانی کے ناروا سلوک کے باعث مہرالنساء نے آغا جانی سے دور رہنے میں عافیت جانی تھی۔ نور بہت چھوٹی تھی اسی لیے اسے ابھی ان باتوں کا شعور نہیں تھا۔

میں ماضی کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا کہ ٹیکسی ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔ میں نے چونک کر نظر اٹھائی تو حویلی کو سامنے پایا تھا۔ میں فوراً حویلی میں داخل ہو گیا۔ سامنے ہی ہمارے برسوں پرانے ملازم کریم بابا نظر آ گئے۔ ان کی نظر مجھ پر پڑی تو مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھے۔ اس طویل عرصے کے دوران کریم بابا مزید بوڑھے ہو گئے تھے۔ مجھے اچانک پا کر وہ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی پھر وہ میرا سامان لانے کے لیے باہر کی جانب بڑھ گئے۔ سب سے ملاقات کے دوران میری نظریں مہرالنساء کو ڈھونڈتی رہی تھیں۔ نور بھی اب بڑی ہو گئی تھی۔ 15 سالہ نور نے بھی ماں کے نمین نقش چرائے تھے' کو کہ مہرو کی نسبت نور بہت خوبصورت تھی مگر میرے دل کو مہرو ہی بھائی تھی۔

میں نے فیروز بھیا سے مہرو کے متعلق پوچھا تو وہ ٹال گئے اور انہوں نے بڑی خوبصورتی سے موضوع بدل دیا۔ نور بھی خاموش خاموش سی لگ رہی تھی۔ حویلی کی فضا میں ایک خاص قسم کی سوگواریت تھی یا شاید مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ گل بینا چچی جہاں میرے آنے پر خوش نظر آ رہی تھیں' وہیں ان کے چہرے پر دکھ کے سائے واضح لرز رہے تھے۔ زرینہ پھوپھو کی بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آج ہمارے درمیان موجود نہیں تھیں' قید تنہائی کے عفریت نے انہیں اور ان کے خوابوں کو نگل لیا تھا۔ دو سال قبل زرینہ پھوپھو نے اس ظالم سماج سے نجات حاصل کر لی تھی۔ ان کی وفات کی خبر بھی مجھے مہرو کے خطوط کے ذریعے ملی تھی مگر پچھلے چند ماہ سے مہرو کے خطوط بھی آنا بند ہو گئے تھے۔ نجانے کیا وجہ تھی؟ مہرو بدل گئی تھی' یہ ممکن نہیں تھا پر ایسا کیا ہوا تھا جس کا مجھے علم نہیں ہو سکا۔ سب سے مل کر میں اپنے کمرے میں آیا اور فریش ہو کر بستر پر دراز ہو گیا اور مہرو کے بارے میں سوچتے ہوئے نیند کی وادی میں اتر گیا۔

شام میں آنکھ کھلی تو خود کو خاصا بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اب سفر کی تھکان پر مہرو کی تلاش غالب آ گئی تھی۔

میں باہر آیا' مہرو کے کمرے میں نورالنساء کو اکیلے پایا۔ نور مجھے دیکھ کر خوش ہو گئی۔ میں اندر داخل ہوا تو مہرو کہیں نظر نہ آئی۔ نور سے بہت پوچھا تو اس نے خاموشی سے نظریں جھکا لیں۔

میری ناراضگی پر اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

"چند ماہ پہلے مہرو کا نکاح قرآن پاک سے کر دیا گیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اپنی بہن کے دکھ نے نور کو بھی نڈھال کر دیا تھا۔ میں بے یقینی کے انداز میں نور کو دیکھتا رہا۔

"یہ..... یہ نہیں ہو سکتا۔" میں بڑبڑایا۔

"یہ حقیقت ہے۔" نور نے جواب دیا۔

"آغا جان ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟" میں نے

سوال

فاصلے گھٹانے کو
راستے دکھانے کو
تیرگی مٹانے کو
اپنے اپنے حصے کے
کب دیے جلاؤ گے؟

ظریف احسن

www.pdfbooksfree.pk

سوچا پھر میں نے زرینہ پھوپھو کے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ دستک دیئے بغیر میں اندر داخل ہوگیا۔ کمرے میں سفید لباس میں ملبوس مہرو نظر آئی۔

مگر..... یہ..... یہ وہ مہرو نہیں تھی جسے میں چھوڑ گیا تھا۔ یہ تو کوئی بھٹکی ہوئی روح تھی یا پھر زرینہ پھوپھو کی روح تھی جو مہرو کے اندر داخل ہوگئی تھی۔ میں نے تابی سے مہرو کی طرف بڑھا۔ مہرو نے مجھے بڑھتے دیکھ کر رخ موڑ لیا تھا۔

"مہرو! یہ سب کیا ہوگیا؟" میں نے تڑپ کر پوچھا۔

"یہی میری تقدیر تھی....." اس کا لہجہ سپاٹ تھا مگر میں اس کے کرب کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

"نہیں، تقدیر نہیں یہ ظلم ہے....." میں چلایا۔

"کچھ بھی کہہ لیں اب یہی میرا نصیب ہے۔" وہ پھر اسی انداز میں بولی۔

"میں تمہیں زندہ درگور نہیں ہونے دوں گا۔"

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے اسفر! میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے کوئی فساد ہو۔"

"یہ ظلم ہے مہرو.....!" میں نے بے بسی سے کہا۔

"اسفر! تم واپس لوٹ جاؤ۔"

"میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔" میں نے اٹل لہجے میں کہا۔ مہرو نے میری طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں دکھ کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے وہ جگنو جو مجھے بہت عزیز تھے اب بجھ چکے تھے۔ اس کی حالت پر میرا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ وہ شوخ سی مہرو جانے کہاں گم ہوگئی تھی۔ سماج کے ظالم اصولوں نے زرینہ پھوپھو کے بعد اب مہرو کو بھی نگل لیا تھا۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" مہرو نے حتمی لہجے میں کہا۔ میں جانتا تھا' مہرو اپنے فیصلے سے ٹس سے مس نہیں ہوگی۔

"میں آغا جان کے اصولوں سے ٹکرانے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔" مہرو نے سسکتے ہوئے کہا۔

"ان سے میں بات کروں گا۔" میں نے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

"کوئی فائدہ نہیں اسفر! تم چلے جاؤ یہاں سے۔" وہ دکھ سے چلائی۔ میں نے کرب کی شدت سے آنکھیں بند کرلیں اور واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

"ٹھہرو....." اس کی آواز پر میں مڑا۔ "مجھ پر ایک احسان کرتے جاؤ۔" اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"نور کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس سے شادی کرلو۔" اس نے اٹکتی ٹھٹکتی بات یوں آسانی سے کہہ دی تھی۔ "میں نہیں چاہتی میرے بعد میری بہن اس کمرے کو آباد کرے۔ میرے لیے اب کچھ نہیں بچا۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی مگر نور ابھی قید تنہائی کی اسیر نہیں ہوئی' جانے کب وقت کے ظالم ہاتھ اسے بھی میری طرح محروم کردیں پلیز اسفر! میری خاطر اس محبت کی خاطر جو تمہیں مجھ سے تھی' نور کو قبول کرلو۔" مہرو نے امید بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں کوئی جواب دیئے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

آغا جان شہر سے واپس آچکے تھے مگر میں اندر سے دکھی تھا اور اس کے ذمہ دار بھی آغا جان تھے مگر ان سے ملنا ضروری تھا۔ میں ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ آغا جان نے مجھے دیکھا اور محبت سے گلے لگا لیا پھر میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔

"آغا جان! آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے؟" میں نے تمام حوصلہ جمع کرکے کہا۔

"بولو۔" انہوں نے بارعب آواز میں کہا۔

"آپ نے مہرو کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" میں نے مؤدب طریقے سے شکوہ کیا۔

"اب تم مجھے سمجھاؤ گے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا؟" وہ غضب ناک لہجے میں بولے۔

"آغا جان! یہ ظلم ہے....."

"یہ حویلی کے اصول ہیں اور تم ان سے نہ ٹکراؤ تو بہتر ہے۔" انہوں نے اکھڑ انداز میں کہا۔

کچھ دیر یونہی خاموشی رہی پھر میں نے ہمت کی۔ "آغا جان! میں نور کو اپنے ساتھ لے کر جارہا ہوں۔" آغا جان نے حیرت سے میری طرف دیکھا تھا۔ "میرا مطلب ہے' میں اس سے شادی کرکے اسے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"یہ نہیں ہوسکتا۔" آغا جان برہم ہوگئے۔ "تم حد سے بڑھ رہے ہو اسفر!"

"پلیز آغا جان! مہرو کے بعد نور کے ساتھ یہ ظلم مت کریں' آپ آخر کب تک گل بینا چچی کے خاندان سے باہر ہونے کے قصور کو معاف نہیں کریں گے؟ اس میں مہرو اور نور کا کیا قصور ہے کہ آپ اپنے بیٹے کے لیے ان کا انتخاب نہیں کرسکتے؟ اگر خاندان کی لڑکیاں خاندان سے باہر نہیں دی جاتیں تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اُن کے ساتھ یہ ظلم کیا جائے؟ قرآن پاک سے نکاح کرنا' کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے؟" میں نے انہیں اپنی دلیلوں سے قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

"تم ہمارے خاندانی اصولوں سے بغاوت کر رہے ہو؟" آغا جان دھاڑے تھے۔

"گستاخی معاف آغا جان' مگر میں نے نور کو اس قید سے آزاد کروانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" میں نے اٹل انداز میں کہا۔ "میں جانتا ہوں' اس صورت میں میرا آپ سے' اس حویلی سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہے گا۔" میری بات پر آغا جان خاموش رہے تھے اور میں بھی ان کا جواب سنے بغیر کمرے سے نکل گیا تھا۔

حویلی سے رخصت ہوتے ہوئے فیروز بھیا نے گلے لگ کر میرا حوصلہ بڑھایا تھا۔ گل بینا چچی کے چہرے پر اظہار تشکر صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ میرے لیے یہی کافی تھا اور پھر صرف محبت کو پالینے ہی سے تو محبت کی جیت نہیں ہوتی۔

مہرالنساء کو دیکھنے یا اُس سے ملنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں جانتا تھا' وہ میری احسان مند ہوگی کہ یہ احسان نہیں تھا بلکہ تلافی تھی جو آغا جان کے ظلم کے جواب میں مجھے نور کو اپنا کرنی پڑی تھی پھر میں نور کو لے کر لندن آگیا تھا۔

•.....•.....•.....•

اب اس بات کو بھی دس برس ہوگئے ہیں۔ ہمارے آنے کے کچھ عرصے بعد گل بینا چچی نے بھی اس جہاں سے ناطہ توڑ لیا تھا۔ دو سال قبل مہرالنساء بھی یہ جہاں چھوڑ گئی تھی۔ مہرالنساء نہیں ہے مگر میرے دل میں وہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ میرے دل میں بسا رہے مجھے مہرالنساء کو بھلانے نہیں دیتا۔

نور بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے اور میری احسان مند ہوتی ہے۔ عمروں کے فرق کے باوجود ہم نے کامیاب زندگی گزاری ہے۔ مجھے نور سے کوئی شکایت نہیں سوائے اس کے کہ وہ نور النساء ہے' مہرالنساء نہیں۔

آپ کو شاید میرے درد کی بخوبی سمجھ آگئی ہوگی کہ میں مہرو کے لیے کچھ نہ کرسکا۔ اسے ظلم سے نجات نہ دلا سکا۔ شاید میں بزدل تھا۔ یہ سوچ میرے من میں ایک ٹیس کی صورت ہمیشہ رہتی ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

سمیں غزالہ نہاں

صراطِ مستقیم

حمیرا راحت کا خیال

کتنے فریب اور کتنے دھوکے، کتنی باتیں، کتنے دعوے
سب کو بھلا کھو دیتے ہیں وقت اگر سچ بولتا ہے

ایک بدگمان عورت کا قصہ، اسے بروقت راہِ مستقیم مل گئی تھی

"آپ کے اوپر کالا جادو کروایا گیا ہے' اس کا اتار کروانا پڑے گا۔"

"جادو.....؟ مگر عالم صاحب' میری تو کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے' مجھ پر کون جادو کروا سکتا ہے؟ وہ بھی کالا جادو.....؟" مسز تو قیر نے پریشان ہوتے ہوئے عالم شاہ مراد بابا سے پوچھا۔

"میرا علم تو یہ ہی بتا رہا ہے کہ آپ کے اوپر بہت ہی خطرناک قسم کا جادو کیا گیا ہے' اسی کی وجہ سے آپ کے کاموں میں بلاجواز رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے' آپ کے کام بنتے بنتے بگڑ جاتے ہیں' گھر میں بے برکتی ہے' اولاد نافرمان ہو رہی ہے' شوہر سے اَن بن رہنے لگی ہے' خرچ میں تنگی ہو رہی ہے حالانکہ پیسہ بہت ہے....." عالم صاحب کی زبان ایسے چل رہی تھی جیسے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن آن کر دیا گیا ہو۔ مسز تو قیر یہ سب سن کر بہت گھبرا گئی تھیں۔ واقعی اُن کے ساتھ یہ ہی کچھ ہو رہا تھا۔

"مگر جادو..... کروایا کس نے ہے؟ آپ یہ بتا سکتے ہیں؟" مسز تو قیر نے پوچھا تھا۔

"نہیں..... ہی..... ہی..... ہمیں یہ بتانے کی اجازت نہیں ہے' ہم آپ کو نام نہیں بتا سکتے' اس میں بہتری ہے۔" عالم صاحب نے دوٹوک جواب دیا تھا۔

"مگر عالم صاحب' مجھے یہ معلوم تو ہونا چاہیے کہ میرا دشمن کون ہے؟ ہو سکتا ہے' وہ بظاہر میرا دوست بن کر مجھے نقصان پہنچا رہا ہو؟"

"میں نے آپ سے کہا نا کہ ہمیں اس کی اجازت نہیں' ہم صرف دشمن کی نشاندہی کر سکتے ہیں' دشمن کا نام نہیں بتا سکتے۔ اس طرح دشمنی بلاوجہ اور بڑھے گی۔"

"جو کوئی بھی میرا دشمن بن گیا ہے' بلاوجہ کی دشمنی کر رہا ہے کیونکہ میرے تو کسی سے بھی تعلقات



اب نہیں ہیں۔ پلیز' آپ مجھے نام بتا دیں' میں اس سے کچھ بھی نہیں کہوں گی بلکہ کسی کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گی نہ لڑائی جھگڑا کروں گی' بس میں اس سے محتاط ہو جاؤں گی۔" مسز تو قیر نے بڑی لجاجت سے درخواست کی تھی۔

عالم صاحب کچھ دیر تک سوچنے کے بعد پھر بولے تھے۔ "دیکھیں بی بی' ہمیں اس بات کی اجازت اپنے استاد سے لینی پڑے گی' اس کے لیے ایک خاص عمل کے ذریعے اپنے استاد سے رُوحانی طور پر ملاقات کرنی پڑے گی۔ یہ بڑا مشکل کام ہے' اس کام میں خرچہ بھی بہت ہوتا ہے' بہت سارے بخورات جلانے پڑتے ہیں' مشک و عنبر کا استعمال ہوتا ہے' مؤکل کے ذریعے اس بات کا پتہ چلانا پڑتا ہے اور مؤکل کو بلانے کے لیے ان چیزوں کا استعمال بہت ضروری ہے ورنہ سب کو معلوم ہے' میں کام کرنے کی فیس نہیں لیتا۔ کوئی اپنی خوشی سے دے دے' وہ اور بات ہے۔" عالم صاحب نے بڑی خوبصورتی سے بڑے خطیر معاوضے کا مطالبہ کر دیا تھا۔

مسز تو قیر کو یہ تو معلوم تھا کہ عملیات میں مختلف بخورات کا استعمال ضروری ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ مشک و عنبر کی قیمت آسمان پر تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ مؤکلات کو بلانے کے لیے اُن کا استعمال ضروری ہوتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ مؤکلات کو بس میں کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہاں تو ہر دوسرا آدمی عامل بن کر مؤکلات کو قبضہ کرنے کا دعویٰ کرتا نظر آتا ہے۔ تقریباً روزانہ ہی اخبارات میں ایسے اشتہارات پر نظر ان کی بھی پڑتی تھی جس میں اس طرح کے دعوے ہوتے تھے۔

'ہر کام مؤکلات کے ذریعے منٹوں میں.....'

'جو چاہیں' سو پائیں.....'

'ایک رات کے خاص عمل سے مؤکلات کے ذریعے ہر کام کروائیں.....'

www.pdfbooksfree.pk

'اپنی آنکھوں کے سامنے مؤکلات سے کام کروائیں.....'

مسز تو قیر کبھی ایسے اشتہارات پڑھ کر ہنستی تھیں کہ ہر کام منٹوں میں کرنے کا دعویٰ کرنے والے خود کیوں ایک معمولی سی جگہ پر بیٹھے ہوئے ہیں؟ اپنے آموہ حال ہونے کا کام کیوں نہیں کروا لیتے؟ مگر آج وہ خود ایک عامل کے پاس اپنا مسئلہ حل کروانے بیٹھی تھیں۔

''آپ خرچہ تو بتائیں' کتنا ہوگا؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔

''بی بی.....! ہم کسی کو خوامخواہ خرچے میں نہیں ڈالتے۔ آپ کے اصرار پر صرف اتنا بتا سکتے ہیں کہ آپ کے دشمنوں کا نام س۔م اور ن سے شروع ہوتا ہے' آپ کو نام کا پہلا حرف بتانے پر بھی ہمیں مؤکلات کی دعوت کرنی پڑے گی۔ گوشت کا صدقہ اور مٹھائی کی نیاز کرنی پڑے گی۔ تقریباً دو ڈھائی ہزار روپیہ تو اسی میں خرچ ہوگا اور اچھا چلیں' ٹھیک ہے' میں مؤکل کو بلانے کے لیے بخور وغیرہ کا اپنے پاس سے انتظام کرلوں گا۔ میں دیکھتا ہوں' شاید میرے پاس کچھ پڑا ہوا ہو۔''

عامل صاحب نجانے کیا کیا بول رہے تھے جبکہ مسز تو قیر تو اپنے خیالوں میں گم تھیں' وہ تو س۔م اور ن کے چکر میں پھنسی یہ سوچ رہی تھیں۔

'س' سے تو سحر نام شروع ہوتا ہے اور سحر میری دیورانی ہے۔ بظاہر تو بھابھی' بھابھی کہتے زبان سوکھتی ہے اور اندر سے دشمنی کر رہی ہے' بڑی گھنی ہے اور 'ن' سے نجمہ میری نند ہے' ویسے اوپر سے یہ بھی بڑی اچھی طرح ملتی ہے' بہت پرخلوص نظر آتی ہے اور ہاں' 'میم' سے یاد آیا' میری بھابھی' یہ تو شروع ہی سے مجھ سے جلتی ہیں۔ جب بھی میرے گھر آتی ہیں' میرے گھر اور سامان کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ حسد ان کے لہجے اور نظروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے' کئی بار کہہ چکی ہیں۔ ''جمی' تمہارا کیا ہے' تم تو خود بھی کماتی ہو' تمہارے میاں بھی اتنی اچھی پوسٹ پر فائز ہیں' تمہارا تو گھر بھی کرائے پر اٹھا ہوا ہے' تمہیں کس چیز کی کمی ہے؟'' وہ نہیں دیکھتیں کہ میں نے محنت کتنی کی ہے۔ میں نے تو شادی کے بعد بھی اپنی پڑھائی جاری رکھی' تعلیم مکمل کی' نوکری کی اور پھر قرضہ لے کر اپنے گھر کی اوپری منزل بنوائی۔ اب کرائے پر اٹھایا ہے تو اس سے قرضہ اتار رہی ہوں۔ خود تو میرے بھیا کی کمائی پر عیش کر رہی ہیں۔ میری طرح محنت تو کر کے دکھائیں؟ اُن کا ذہن بڑی تیزی سے چل رہا تھا' شک کا بیج جو عامل صاحب نے ان کے دماغ میں بویا تھا' وہ لمحوں میں تناور درخت بن چکا تھا۔

•.....•.....•

مسز تو قیر ایسی تھی نہیں' وہ سیدھی سادی مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ' قدرے مذہبی خاتون تھیں۔ وہ ایک سیکنڈری اسکول میں معلمہ کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ وہ بڑی مطمئن زندگی گزار رہی تھیں۔ شوہر ایک تجارتی فرم میں مارکیٹنگ منیجر تھے۔ اُن کے چار بچے تھے' دو بیٹے اور دو بیٹیاں مگر اِدھر کچھ عرصے سے اُن کے مالی حالات خراب ہو رہے تھے جس کی وجہ سے وہ سخت پریشان تھیں۔ اُن کے شوہر کی فرم کچھ دنوں سے خسارہ میں جا رہی تھی جس کی وجہ سے تقریباً آٹھ مہینے سے ان کی تنخواہ اسٹاپ تھی' سو مسز تو قیر کو اپنی تنخواہ سے گھر کا خرچ چلانا پڑ رہا تھا اس لیے ان کو کافی مشکل پیش آ رہی تھی۔

اسکول میں ٹیچرز آپس میں بے تکلف ہوتی ہیں' سب ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہوتی ہیں' وہ آپس میں اتنی بے تکلف ہوتی ہیں کہ جو گھریلو باتیں سگی بہن کے سامنے نہیں کر سکتیں' وہ اسٹاف سے کر لیتی ہیں' چاہے وہ سسرال کی شکایتیں ہوں یا میاں کی بے وفائی یا الپر وائیوں کا راز' سب ایک دوسرے پر عیاں ہوتا ہے۔ اس طرح سب آپس میں ایک دوسرے سے اپنے دل کی باتیں کر کے اپنی ٹینشن ریلیز کر لیتی ہیں اور اس سلسلے میں سب ایک دوسرے کو مشورے بھی خوب دیتی ہیں۔

مسز تو قیر کیونکہ اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے خاصی پریشان تھیں' اس وجہ سے وہ چڑچڑی ہو رہی تھیں' وہ بچوں اور میاں سے بلاوجہ ہی الجھ پڑتی تھیں' شوہر پہلے ہی پریشان تھے' اوپر سے بیوی کی بدمزاجی نے ان کو چڑچڑا بنا دیا تھا۔ دونوں اکثر بلاوجہ تکرار شروع کر دیتے۔ اس ٹینشن نے گھریلو حالات پر اثر تو ڈالا ہی تھا' اسکول میں بھی اُن کی تدریسی ذمہ داریوں پر بھی فرق پڑنے لگا تھا۔

ایک روز مسز تو قیر کی زبانی تمام حالات سن کر اُن کی ایک ساتھی ٹیچر نے ایک عامل صاحب کا پتہ بتایا تھا اور ان کے عملیات کے ذریعے سے لوگوں کو ملنے والی کامیابیوں کے ایسے قصے سنائے تھے کہ وہ بھی اس بات پر تیار ہوئی تھیں کہ ایک بار ان عامل صاحب سے ملاقات کر لی جائے اور یوں مسز تو قیر اپنے میاں سے چھپ کر ان عامل صاحب کے پاس گئی تھیں جنہوں نے اُن کو ایک نئی ٹینشن میں مبتلا کر دیا تھا۔ قصہ مختصر' بہت سوچ بچار کر کے انہوں نے اپنے پرس سے دو ہزار روپے نکال کر عامل صاحب کی طرف بڑھائے تھے۔

عامل صاحب نے ہزار ہزار کے دو نئے نوٹوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بظاہر بے اعتنائی سے کہا تھا۔ ''بی بی.....! اس پورے کام میں پانچ ہزار سے کم خرچ نہیں ہوتا اور اس میں میری کوئی فیس یا ہدیہ نہیں' یہ صرف آپ کے کام کے لیے مؤکل کو بلانے کا خرچہ ہے۔''

''لیکن میں تو اتنے پیسے نہیں لائی' ویسے بھی آج کل میرے حالات ایسے نہیں کہ میں اتنی بڑی رقم خرچ کر سکوں۔''

''لیکن آپ کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔''

''مگر میں بہت مجبور ہوں' آپ کام شروع تو کریں' میرے میاں کی جو تنخواہ رکی ہوئی ہے' وہ آپ اپنے عمل سے نکلوا دیں تو پھر میں آپ کو مزید رقم دے دوں گی۔''

''بی بی.....! آپ اپنے شوہر سے کہیں کہ وہ باقی رقم کا انتظام کر دیں۔'' عامل صاحب نے مشورہ دیا تھا۔

''عامل صاحب' میرے شوہر نہ تو عملیات وغیرہ کے قائل ہیں نہ اس قسم کے کام وہ پسند کرتے ہیں' میں ان کے علم میں لائے بغیر یہاں آئی ہوں۔''

''لیکن بی بی.....! پہلے یہ کام ہوگا تو آپ کے میاں کو رکی ہوئی تنخواہ ملے گی' اس کے لیے پہلے خرچ تو کرنا ہوگا۔'' عامل صاحب نے مسز تو قیر کو اپنے مطلب کی بات سمجھانے کی کوشش کی تھی پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے۔ ''آپ ایسا کریں کہ یہ رقم ایڈوانس میں جمع کروا دیں' میں کام شروع کرتا ہوں' آپ دو چار دن میں انتظام کر کے باقی رقم دے دیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' مسز تو قیر نے بے چارگی سے کہا تھا پھر اپنے خون پسینے کی کمائی دو ہزار روپے عامل صاحب کے حوالے کر کے چلی آئی تھیں اور دل میں یہ سوچ رہی تھیں کہ عامل صاحب کو باقی پیسے اسٹاف سے قرض لے کر دے دوں گی۔

عامل صاحب کے آستانے سے گھر واپسی کے بعد بھی مسز تو قیر کے ذہن میں اپنی نند' دیورانی اور بھابھی کا نام گردش کرتا رہا اور وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے انہیں خوب برا بھلا کہتی رہی تھیں مگر ان کو بھول کر بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ 'س' سے

www.pdfbooksfree.pk

ان کی بہن سائرہ کا نام بھی آتا ہے اور 'میم' سے اُن کی والدہ معینہ کا نام بھی ہے اور نعیمہ اُن کی نانی ہیں جن کا نام 'ن' سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کی بہت سی سہیلیاں اور جاننے والیاں بھی ہیں جن کا نام س۔ م اور ن سے شروع ہوتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ خود ان کا نام بھی منیرہ ہے جو میم سے شروع ہوتا ہے مگر وہ روایتی حسد اور جلن جو سسرال والوں اور بھابھی سے ہوتی ہے' اب اس کی بنیاد پڑ چکی تھی ورنہ اس سے پہلے نند' بھاوج اور دیورانی سب سے خلوص کا رشتہ قائم تھا۔ یہ سب عالم صاحب کی باتوں کا کمال تھا جو پل بھر میں خلوص اور محبت ختم کر گیا تھا۔

•.....•.....•

عالم صاحب نے ٹوٹل پانچ ہزار کا خرچہ بتایا تھا مگر دو تین ہفتوں کے اندر مسز تو قیر کے تقریباً بیس ہزار روپے خرچ ہو گئے تھے جو انہوں نے منجانے کس کس سے ادھار لیے تھے مگر اس کے باوجود ان کے مسائل جوں کے توں تھے بلکہ ایک اور مسئلہ قرض کا بھی ہو گیا تھا۔

دو تین مہینے یونہی گزر گئے نہ تو قیر صاحب کے آفس کے مسئلے کا کوئی حل نکلا نہ اُن کو پیسوں کی ادائیگی ہوئی بلکہ مسز تو قیر مزید قرض میں پھنس گئیں۔ 'نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن' کے مصداق وہ عالم اور معمول کے چکر میں الجھتی چلی گئیں۔ ایک عالم سے کوئی فائدہ نہ ہونے پر ان کو کسی اور نے دوسرے عالم صاحب کا پتہ اس یقین دہانی کے ساتھ بتایا تھا کہ ان کے عملیات سے ان کا ذاتی طور پر اپنا فائدہ ہوا ہے۔

نئے عالم صاحب نے مسز تو قیر کو صرف چار ہزار کا خرچہ بتایا تھا' وہ بھی قسطوں میں' انہوں نے تو مسز تو قیر کو اپنے آستانے پر بھی نہیں بلایا بلکہ فون کے ذریعے تمام معاملات طے کر کے اپنے بندے کو ان کی طرف بھیج دیا جس کو مسز تو قیر نے اپنے گھر کے بجائے اپنے اسکول میں بلوایا۔ ان عالم صاحب نے ان کو صرف دو ہفتوں کا ٹارگٹ دیا تھا جس میں ان کے سارے کام سنور جانے تھے' ان کو یہ یقین دہانی کروا دی تھی کہ میرے عمل کے بعد آپ کے میاں کی رکی ہوئی تنخواہ مع اُن کی ترقی کے آرڈر کے ساتھ مل جائے گی' یوں مسز تو قیر نے عالم صاحب سے ایک نئی امید باندھ لی تھی لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ مسز تو قیر کے شوہر جن کے لیے عملیات کروائے جا رہے تھے' ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ اُن کی بیگم صاحبہ کیا کمالات کر رہی ہیں؟ ویسے خبر بھی اسی میں تھی کہ ان کو کچھ خبر نہ تھی ورنہ مسز تو قیر کا بسا ہوا گھر ڈگمگانے لگتا اور کچھ خبر نہیں کہ ٹوٹ بھی جاتا کیونکہ اُن کے میاں تو ایسے معاملات کے شدید ترین مخالف تھے' ان کے لیے یہ ناقابلِ معافی غلطی ہوتی' وہ بیوی کو بھی معاف نہیں کرتے۔

•.....•.....•

تو قیر احمد کے آفس کے حالات تو خراب تھے ہی' اُن کے گھر کی حالت بھی خراب ہو رہی تھی۔ مسز تو قیر کا زیادہ وقت اور پیسہ اب ایک اور نئے عالم صاحب کے چکر میں خرچ ہو رہا تھا۔ اب تو جب دیکھو' موبائل پر ہدایات' مطالبے اور مشورے ہوتے۔ ان معاملات کے باعث وہ گھر سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔ جب گھر کی مالکن گھر سے بے گانہ ہو جائے گی تو گھر کی حالت بگڑے ہی گی۔ ان حالات نے تو قیر صاحب کو اور بھی زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ ٹینشن اور ڈپریشن نے اُن کو بہت زیادہ چڑچڑا بنا دیا تھا۔ ان حالات میں بجائے اس کے کہ وہ شوہر کی پریشانیوں کو شیئر کرتیں' بس میاں سے شکایتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ گھر میں عجب نحوست

اور سوگواری کی فضا چھا گئی تھی۔ ان حالات کی وجہ سے بچے بھی پریشان تھے' سو ان کی تعلیمی مصروفیت پر بھی بہت برا اثر پڑا۔ اسکول سے شکایتیں آنے لگیں اور دونوں میاں بیوی کو لڑائی کا ایک اور ایشو مل گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرانے لگے تھے۔

مسز تو قیر کو اب عالم حضرات کو پیسے دینے کے لیے ساتھی ٹیچروں سے قرضہ ملنا بھی بند ہو گیا تھا۔ ٹیچریں اب کھلے عام کہتیں۔ ''مسز تو قیر کو تو مانگنے کی عادت ہو گئی ہے۔'' ایک دن وہ ہر طرف سے پریشان اپنے حالات پر غور کر رہی تھیں کہ عالم صاحب کا ایک نئے مطالبے کے ساتھ فون آ گیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''آپ کے لیے سیون شریف جا کر پڑھائی کرنی ہے۔ گیارہ دن کا چلہ ہے' روزانہ گیارہ کبوتر خرید کر آزاد کرنے ہیں' اس کے علاوہ پڑھائی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے' اس کا بھی خرچہ ہے پھر آنے جانے کا کرایہ اور کھانے پینے کا خرچ ہے' وہ آپ کو دینا ہوگا اور ہاں' روزانہ گیارہ مسکینوں کو تین وقت کا کھانا بھی کھلانا ہے۔''

مسز تو قیر نے حساب لگایا تو خرچہ ہزاروں میں ہو رہا تھا' وہ بھلا کہاں سے اتنا خرچ کرتیں؟ اصل مسئلہ تو پیسوں کی کمی کا ہی تو تھا جس کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے مختلف حالموں کا سہارا لیا تھا۔

انہوں نے اپنی اُسی ساتھی سے اس بات کا تذکرہ کیا تھا جس نے انہیں اس نئے عالم کا پتہ بتایا تھا۔ اُس ٹیچر نے ساری بات سن کر بے ساختگی سے کہا تھا۔ ''بھئی..... یہ خرچ تو کرنا پڑے گا۔ آخر تمہارا کام بھی تو ہو رہا ہے۔''

''مگر ابھی تک تو کوئی کامیابی نہیں ہوئی؟ کوئی آس بھی نہیں بندھی کہ میرا کام ہو جائے گا؟''

''بھئی..... عمل تو پورا ہونے دو۔'' ٹیچر نے پھر لاپروائی سے کہا تھا۔

''عمل پورا ہونے کا خرچہ میں کہاں سے کروں؟'' مسز تو قیر نے زچ ہو کر کہا تھا۔

''بھئی' یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے۔'' وہ یہ کہہ کر اٹھ کے چل دی تھی۔

مسز تو قیر نے بہت سوچ سمجھ کر عالم صاحب کو فون پر بتایا تھا کہ میں اتنا خرچہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔

''آپ کو کوئی نہ کوئی انتظام تو کرنا ہی پڑے گا۔ اب تو میں اس عمل کی تیاری کر چکا ہوں۔'' عالم کے لہجے میں دھمکی تھی۔ اس بات کے جواب میں وہ خاموش رہی تھیں تو پھر عالم نے نرمی سے کہا تھا۔

''دیکھیے بی بی..... اپر عورت کے پاس زیورات کی شکل میں کچھ نہ کچھ سونا ضرور ہوتا ہے' وہ فروخت کر دیں۔ عمل کو بیچ میں ادھورا نہ چھوڑیں.....''

اب انہیں صورتِ حال کی سنگینی کا کچھ اندازہ ہوا تھا' وہ سمجھ گئی تھیں کہ وہ بری دلدل میں پھنس رہی ہیں۔ انہوں نے مزید کچھ کہے بغیر فون رکھ دیا تھا مگر دو تین دن کی خاموشی کے بعد ایک دن پھر عالم صاحب کا فون آ گیا تھا۔

''بی بی..... آپ نے تو مجھے فون ہی نہیں کیا؟ خیر' یہ بتائیں کہ پیسوں کا انتظام ہو گیا؟''

''میں نے تو آپ کو اسی دن جواب دے دیا تھا کہ میں اب کچھ نہیں کر سکتی۔'' مسز تو قیر نے صاف جواب دیا تھا۔

''مگر بی بی.....! میں تو آپ کے کام میں پھنس گیا ہوں۔ جب تک مؤکل کا کام مکمل نہیں کرے گا' مجھے پریشان کرتا رہے گا۔ آپ عمل کو بیچ میں ادھورا نہ چھوڑیں ورنہ.....''

www.pdfbooksfree.pk

"مگر میرے لیے اتنا خرچہ کرنا ناممکن ہے' نہ میرے پاس زیورات ہیں جو فروخت کردوں اور اگر ہوتے' تب بھی میں نہیں کرسکتی تھی۔"

"بی بی.....! آپ مجھے کیوں پھنسا رہی ہیں؟ دیکھیں' آپ کے پاس گاڑی بھی تو ہے' وہ فروخت کردیں۔" یہ بات سن کر تو مسز تو قیر اچھل پڑی تھیں۔ 'ان کو کیسے معلوم ہوا کہ شوہر کی گاڑی میرے نام ہے؟' وہ دل میں سوچتے ہوئے بولی تھیں۔

"یہ بھی ناممکن ہے۔"

"تو پھر بی بی.....! آپ ایسا کریں' مکان بھی تو آپ کا اپنا ہے' اس کے کاغذات پر قرضہ لے لیں۔ آج کل بینک سے بڑی آسانی سے قرضہ مل جاتا ہے۔"

اب تو مسز تو قیر کا صبر جواب دے گیا تھا۔ انہوں نے بڑی سختی سے کہا تھا۔ "آپ عامل ہیں یا..... ٹھگ؟ کیسی باتیں کررہے ہیں؟ مجھے آپ سے کام نہیں کروانا' بس اب یہ معاملہ ختم کردیں....."

"میں کام شروع کرکے بیچ میں نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ کو یہ خرچ اٹھانا ہی پڑے گا....." عامل نے پھر دھمکی دی تھی۔

"میں آپ کا یہ نمبر اپنے شوہر کو دے رہی ہوں' وہی اب آپ سے بات کریں گے۔" مسز تو قیر نے یہ کہہ کر فون بند کردیا تھا اور پھر اس سم کو ہی نکال کر پھینک دیا تھا جس سے وہ عامل حضرات سے رابطہ کرتی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے وضو کرکے دو رکعت نفل پڑھنے کے بعد اللہ سے معافی مانگی تھی اور اس کا شکر ادا کیا تھا کہ اس نے انہیں ان جھوٹے عاملوں کے چکر سے نکالا اور عزت رہ گئی ورنہ اگر تو قیر صاحب کو اس بات کا پتہ چل جاتا تو پتہ نہیں کیا ہوتا۔ اس سے آگے اُن میں کچھ سوچنے کی ہمت نہیں تھی۔ یہ ہی کافی تھا' اللہ نے اُن کو سیدھی راہ دکھا دی۔

اس کے بعد مسز تو قیر نے ایک اللہ والے کے کہنے پر پانچ وقت کی نماز' استغفار' درود اور کل کی تسبیح پڑھنا اپنی عادت بنالی تھی۔ وہ روزانہ عشاء کے بعد دو رکعت نفل حاجت کی پڑھتیں اور اپنے حالات سدھرنے اور اپنی زندگی میں آسانی کی دُعا کرتیں۔

مسز تو قیر کے گھر کی اوپری منزل پر دو کمرے بنے تھے۔ انہوں نے تو قیر صاحب کی اجازت سے اپنی ایک ساتھی ٹیچر کو اوپر والا پورشن کرائے پر دے دیا تھا تو کچھ اضافی آمدنی ہونے لگی تھی پھر گورنمنٹ نے نئی ٹیچرز کا اسکیل ریوائز کیا تو اُن کی تنخواہ بھی بڑھ گئی اور پھر اللہ کے کرم سے رفتہ رفتہ اُن کا قرض بھی ادا ہوگیا تھا۔

اور پھر ایک روز تو قیر صاحب خوشی خوشی گھر میں داخل ہوئے تھے اور بیوی بچوں کو یہ خوشخبری سنائی تھی کہ اُن کی کوششوں سے کمپنی کو ایک ملٹی نیشنل کلائنٹ مل گیا ہے۔ اب ہماری کمپنی یوں سمجھو کہ پھر اپنے عروج اور کامیابی کے دور کی جانب سفر کرے گی۔ جب ہماری کمپنی کے حالات خراب تھے تو بہت سے لوگ اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے مگر میں نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا' میرے اس کام اور عمل سے خوش ہوکر مالکان نے مجھے اور ترقی دے دی تھی اور آئندہ ایک دو روز میں مجھے نئے عہدے کی تنخواہ معہ سابقہ بقایا جات ادا کردیئے جائیں گے۔"

مسز تو قیر یہ خوش خبری سنتے ہی خود شکرانے کے دو نفل پڑھنے چلی گئی تھیں۔ سچ ہے اللہ بڑا بے نیاز ہے۔ وہ اپنے بندوں کو جب چاہے جیسے چاہے نواز دے۔ وہ اپنے بندوں کو طرح طرح سے آزماتا ہے۔ جب بندہ آزمائش پر پورا اترتا ہے تو پھر اس کو نوازتا بھی خوب ہے۔

صدف آصف

نسخہ کیمیا

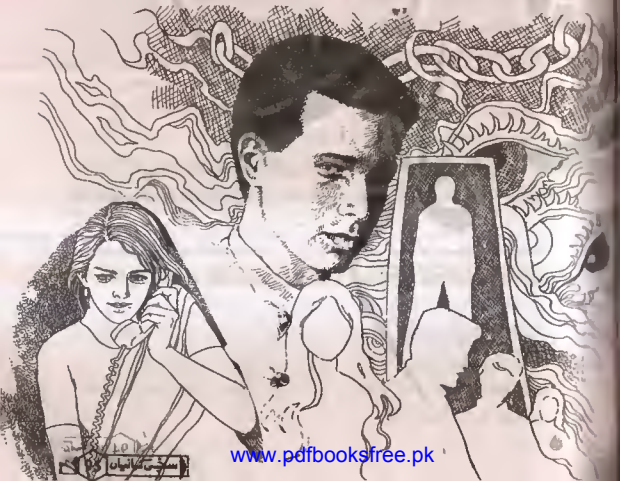
یاسمین سہاکا خیال
اور جو چیز بھی ہے وہم و گماں ٹھہری
یہ نظر تیرے سوا اور کہاں ٹھہری ہے

اُن بیویوں کے لیے بطورِ خاص جو اپنے شوہروں کی عدم توجہ کا شکار ہیں

"ہیلو..... پروفیسر صاحب' پلیز' میری مدد کریں' میں جینا چاہتی ہوں' خوش رہنا چاہتی ہوں مگر وہ مجھے خوش رہنے نہیں دیتے۔" دوسری طرف پی ٹی سی ایل کال ریسیو ہوتے ہی میں نے پروفیسر ارشد سے مدد کی درخواست کی تھی اور اس کے ساتھ ہی مجھے بے ساختہ رونا بھی آ گیا تھا۔

"دیکھیے پلیز' آپ حوصلہ کریں اور یہ بتائیں' آپ کون ہیں؟ کیا چاہتی ہیں؟" دوسری طرف سے پروفیسر صاحب نے مجھے دلاسہ دینے کی کوشش کی تھی۔

"میرا نام عاصمہ ہے۔ مجھے آپ کا فون نمبر



www.pdfbooksfree.pk

میرے چچازاد بھائی اظہر بیگ نے دیا ہے جو آپ کے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ انہوں نے میرے سامنے اکثر آپ کی صلاحیتوں کی بہت تعریف کی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ آپ سے بڑا ستاروں کا علم رکھنے والا اس پورے ملک میں نہیں ہے' اس لیے میں آپ سے اپنے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھی' شاید آپ کے پاس میرے مسئلے کا کوئی حل ہو یا کم از کم مجھے یہ ہی پتا چل جائے کہ میں تقدیر کی گردش سے کب نکلوں گی؟'' میں نے پروفیسر صاحب کو اپنا مسئلہ بتایا تھا۔

''دیکھیے محترمہ بات یہ ہے کہ.....'' ابھی پروفیسر صاحب اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ میں نے ان کی بات کاٹ کر اپنی بات کہنا شروع کر دی تھی۔

''ہاں ہاں اظہر بھائی بتا رہے تھے کہ آپ نے آج کل اپنی علم نجوم پر کتاب لکھنے کی وجہ سے گوشہ نشینی اختیار کر رکھی ہے جس میں آپ اپنے تجربات کے نچوڑ کا حوالہ دیں گے' کچھ خاص باتوں پر روشنی ڈالیں گے جو آپ کے شاگردوں کے کام آئیں گی' اس لیے آپ آج کل کسی کا مسئلہ نہیں سن رہے ہیں نہ ہی آپ کسی سے بات کرنا پسند کر رہے ہیں لیکن یہ یاد رکھیے گا کہ آپ نے اگر میری بات نہیں سنی اور میرے مستقبل کے حوالے سے مجھے کچھ نہیں بتایا تو میں آپ کے فون کاٹنے ہی اپنے ساتھ کچھ برا کر بیٹھوں گی۔'' میری آواز میں ایک ایسا عزم تھا کہ میں جو کہہ رہی ہوں' کر کے دکھاؤں گی۔

پروفیسر ارشد ڈر گئے تھے' انہوں نے میرا مسئلہ سننے کی ٹھانی تھی اور اپنے نرم لہجے میں مجھے پانی پی کر آنے کو کہا تھا۔

''کیا آپ کے پاس ٹائم ہے؟ اس کے لیے مجھے آپ کو اپنی زندگی کی کہانی سنانی پڑے گی؟'' میں نے سوال کیا تھا۔

''ہونہہ..... آپ بتائیے میں سن رہا ہوں۔'' پروفیسر ارشد کی اس بات کے جواب میں' میں نے اپنی کہانی شروع کی تھی۔

''میرا نام عاصمہ خان ہے۔ میں اپنے شوہر اسد خان کو ٹوٹ کر چاہتی ہوں۔ پہلے وہ بھی مجھ پر جان دیتے تھے مگر اب وہ مجھ سے پہلے کی طرح محبت نہیں کرتے' ہمارے دو بچے ہیں' لڑکی روشنی جو مونٹیسوری میں پڑھ رہی ہے جبکہ لڑکا معاذ کلاس نائن کا طالب علم ہے۔ میں ایک جوائنٹ فیملی سسرال میں رہتی ہوں جہاں بہو کی کوئی پرسنل لائف نہیں ہوتی اگر آپ جینا چاہیں تو آپ کو جینے نہیں دیتے اور مرنا چاہیں تو مرنے بھی نہیں دیتے۔ ہماری شادی نو فٹر ارینج میرج تھی مگر شادی کی پہلی رات جب میں نے اپنے شوہر کو دیکھا تو میں اُن کو دیکھتی رہ گئی۔ اس سے قبل میں نے اُن کی تصویر دیکھی تھی مگر وہ اپنی تصویر سے بڑھ کر خوبرو نکلے اور مجھے ایسا لگا کہ پہلے دن ہی میں اُن کی شدید قسم کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہوں' ویسے اگر آپ اس کو مبالغہ آرائی نہ سمجھیں تو میں کچھ خوبصورتی میں کسی سے کم نہیں ہوں' کروڑوں میں سہی مگر لاکھوں میں ایک ہوں۔ ہماری شادی والے دن سب نے ہماری جوڑی کو چاند سورج کی جوڑی قرار دیا تھا۔ مجھے اسد کے دل کی خبر تو نہیں کیونکہ وہ خاصے کم گو واقع ہوئے ہیں مگر میری پہلی رات کی محبت جلد ہی عشق میں تبدیل ہو گئی تھی اور پھر وقت کے ساتھ وہ میرے لیے ایسے دیوتا کا روپ اختیار کر گئے جن کے قدموں میں' میں اپنی زندگی وار دینے کے لیے ہر گھڑی تیار رہتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ میرے عشق نے دیوانگی کی شکل اختیار کر لی۔ میں ان سے کبھی نہیں لڑتی' ان باتوں پر بھی غصہ نہیں دکھاتی جن پر عموماً بیویاں غصہ دکھاتی ہیں۔ اگر انہیں دفتر سے گھر آنے میں دیر ہو جائے تب دس بار فون کر کے ان کی خیریت پتا کرتی' موبائل اٹینڈ نہیں کرتے تو ڈرتی کہ انہیں کچھ ہو نہ گیا ہو' بار بار نمبر ملاتی' وہ چڑ بھی جاتے اور ڈانٹنے لگتے کہ میٹنگ میں بزی تھے اور میری کالز انہیں پورے وقت ڈسٹرب کرتی رہیں۔ میں ہنستی رہتی یہ اُن کے من پسند کھانے پکاتی غرض ان کی خوشی کے لیے ایک الگ پرہ جی رہتی جبکہ وہ بعض اوقات ایسی حرکتیں کرتے کہ میرا دل جل کر خاک ہو جاتا..... میں مشرقی فطرت کے تحت اُن سے لڑنے کے لیے منہ کھولتی مگر جیسے ہی میری نظر ان کے چہرے پر پڑتی' معصومیت کا جھماکا سی طرح بیٹھ جاتا۔''

''کس قسم کی حرکتیں' کوئی مثال دے کر سمجھائیں؟'' پروفیسر ارشد نے سوال کیا تھا۔

''جیسے اکثر میں صبح رات کے کھانے کا پوچھتی کہ کیا پکاؤں؟ میرے بہت زور دے کر پوچھنے پر وہ کہتے کہ ''آج کڑاہی گوشت پکا لینا مگر جب میں بات کو کھانا لگاتی تو میز سے یہ کہہ کر اٹھ جاتے کہ آج میرا پلاؤ کھانے کا دل چاہ رہا تھا۔ میں اُن کے ہاتھ تھام لیتی' درخواست کرتی کہ ابھی کھالیں' کل پلاؤ بنا لیں مگر وہ چپ چاپ کھانے کے کمرے سے باہر نکل جاتے۔ ان کا یہ بھوکا رہنا میری برداشت سے باہر ہوتا ہے' میں جلدی سے کمرے میں بچی چڑ حاتی' چاول بھونتی اور جب پلاؤ بنا کر انہیں پیش کرتی تو وہ تھوڑا سا کھا کے چھوڑ دیتے کہ ''بھوک کا ٹائم تو نکل گیا ہے۔''

''کیا ان کی یہ کیفیت شروع سے ہے؟'' پروفیسر ارشد کا سوال سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

''نہیں' شادی کے شروع میں تو اُن کا رویہ خاصا نارمل تھا' بس پچھلے دو سال سے وہ یہ حرکتیں کرنے لگے ہیں' مجھ سے لاپروا ہوتے جا رہے ہیں' اکثر دیر سے گھر آنے لگے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اب اُن کو مجھ سے محبت بھی نہیں رہی ہے۔''

دکھ بولتا ہے

ہوا کی سرسراہٹ میں
بارش کی رم جھم میں
جھلمل کرتے آنچل میں
دکھ بولتا ہے

نگہت اکرم' لاہور

''اس ضمن میں آپ کے سسرال والوں کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا ہے؟''

''وہ لوگ تو شروع سے ہی مجھ سے خار کھاتے تھے مگر اسد ہمیشہ میرا ساتھ دیتے تھے' ویسے بھی ان کی سنجیدہ طبیعت کی وجہ سے ان کا اپنے گھر والوں پر بہت رعب ہے پھر گھر کا تقریباً سارا خرچہ بھی اسد ہی اٹھاتے ہیں کیونکہ وہ اپنے سب بھائیوں میں سب سے زیادہ خوش حال ہیں اس لیے سب ہم سے دبے رہتے تھے پھر میری سلیقہ مندی اور خوبصورتی کی وجہ سے مجھ خاندان کے ہر گھر میں خاصی پذیرائی ملتی تھی جس پر میری جیٹھانیاں مجھ سے دل ہی دل میں جلتی تھیں مگر اسد کے ڈر سے منہ سے کچھ بول نہیں پاتی تھیں لیکن اسد کی نظریں بدلتے ہی سب کے رویوں میں فرق آنے لگا' ان کو جیسے ہی احساس ہوا' میں اپنے شوہر کے دل سے اتر گئی ہوں' انہوں نے بھی مجھے آسمان سے زمین پر گرا دیا۔ میرے ساس سسر کے لیے پرہیزی کھانا پکانے کی ذمہ داری میری جیٹھانی کے سر تھی کیونکہ میرے سسر اپنی پنشن کا سارا روپیہ ان ہی کے ہاتھ میں تھما دیتے تھے' وہ بھی زبردستی میرے سر منڈھ دی گئی کہ ''ہم نے بہت سالوں والدین کی خدمت کی ہے' اب نئی آنے والی

www.pdfbooksfree.pk

بھی تو کچھ کرے۔'' اُن کا کھانا پکانا مشکل نہیں تھا مگر کھانے کی میز پر بیٹھ کر وہ ہر ڈش پر جتنی تنقید کرتے تھے' اسے سہنا بہت مشکل تھا۔ وہ ایسے ساس سسر ہیں جنہیں دنیا میں کچھ نہیں بھاتا' سب ان کے دکھن' بہوویں ان کی پھوہڑ اور بیٹے نالائق..... بس بیٹیاں ہی ان کے لیے سب کچھ تھیں پھر چاہے میری نندیں ایک فون گھما کر اپنے والدین کی خیریت ہی پوچھ لیں' بس پورے دن گھر والوں کو سنایا جاتا کہ ہماری بیٹیوں جیسا کوئی سعادت مند نہیں۔ یہاں ان کی خدمت میں بہو کی بھلے جان ہی نکل جائے' اُن کی نظر میں بہو بہو ہی ہے' پرائی عورت ہے' چاہے اسی عورت کے دم پر اُن کا گھر بار چل رہا ہو اور اماں ابا کو بیٹھے بٹھائے کھانے کو مل رہا ہو۔ ایسے لوگوں کے ساتھ گزارہ کرنے کے لیے پتھر کا جگر چاہیے۔

حالات میرے خلاف ہو گئے تھے۔ اب چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر گھر میں محاذ آرائی شروع ہو جاتی' میرے جیٹھ تو کھل کر اپنی بیویوں کا ساتھ دیتے مگر میرے میاں سارا تماشہ شروع ہوتے ہی بے زاری سے گھر سے باہر نکل جاتے جس پر ان لوگوں کو اور کھل کر کھیلنے کا موقع مل جاتا۔ دو دن پہلے کی بات ہے' مجھے اپنی بچی کو سونے سے قبل دودھ پلانا تھا مگر اتفاق سے دن کے وقت میں نے مشین لگائی اور دودھ جو لیے پر رکھ کر بھول گئی۔ آدھے سے زیادہ دودھ جل گیا جو بچا' وہ چائے کے لیے استعمال ہو گیا۔ میں بازار سے منگوانا بھول گئی تھی۔ ہم جو بھی دودھ منگواتے ہیں' اسے پورا گھر چائے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ہمارا کھانا پکانا تو الگ تھا مگر مہینے کی ساری گروسری اسد ہی خرید کر لاتے تھے۔ سب اپنی اپنی لسٹ لا کر انہیں تھما دیتے تھے جس پر اکثر میری جان بھی جل جاتی تھی۔ میری جیٹھانیاں اپنے بچوں کو دودھ پلانے کے لیے الگ سے ٹیٹرا پیک منگواتی ہیں۔ اس دن بٹی کی دودھ کی فرمائش پر میں نے اپنی بڑی جیٹھانی کے پیک میں سے ایک گلاس دودھ نکال لیا تو انہوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ ان کے بچوں کا دودھ کیوں استعمال کر رہی ہو؟ مزے کی بات یہ ہے کہ ان کی ہر غلط بات پر میرے ساس سسر ان ہی کا ساتھ دیتے ہیں کیونکہ وہ ان کی برداری سے شادی ہو کر آئی ہیں جبکہ میں غیروں سے بیاہ کر آئی ہوں۔ میرے سسرال والوں کی (مثال یوں ہے کہ اگر میں ان لوگوں کی خوشنودی کے لیے اپنی گردن بھی کاٹ ڈالوں تو وہ یہ ہی کہیں گے مزہ نہیں آیا' بہو' تھوڑا اوپر سے کاٹتی۔ بہرحال میں اس دن بہت روئی کہ ہم تو سارے گھر کا خرچہ اٹھائیں مگر وہ لوگ میری بچی کو ایک گلاس دودھ نہیں دے سکتے۔ اُس روز اسد کے گھر میں داخل ہوتے ہی ان کے بڑے بھائی انہیں اپنے کمرے میں لے گئے' آدھے گھنٹے میں میری خوب شکایتیں لگائی گئیں ساس سسر پہلے ہی حامی بھرنے کو وہاں تیار بیٹھے تھے۔ جب اسد وہاں سے واپس آئے تو میری ایک بات سننے کو تیار نہیں تھے' عالم غیظ میں یہ ہی بول رہے تھے کہ میری ہمت کیسے ہوئی کہ ان کے گھر والوں سے گھر میں پیسے خرچ کرنے کی بابت کی؟ انہیں اصل بات نہیں بتائی گئی تھی نہ ہی انہوں نے میری کوئی بات سنی۔ اب حالت یہ ہے کہ انہوں نے مجھ سے اپنا بستر الگ کر لیا ہے اور رات کو خاموشی سے بچوں کے کمرے میں چلے جاتے ہیں اور منہ اندھیرے واپس آ جاتے ہیں۔ میری کسی معافی تلافی کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اب میرے آنسو بھی ان کے لیے بے مول پانی بن گئے ہیں۔ میں نے ان کے پاؤں تک پکڑے مگر وہ میرا ہاتھ جھٹک کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ اب میری حالت ایسی ہی ہے جیسے بغیر جل کے مچھلی ہوتی ہے۔ میرا

دل میں ان کی محبت اتنی گہری ہے کہ ان کے بغیر جینے کا سوچ کر ہی میرا دل بند ہونے لگا ہے۔ اب بتایئے' میں کیا کروں؟'' اس کے ساتھ ہی میں ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

پروفیسر ارشد نے پہلے تو مجھے خوب دلاسے اور تسلیاں دے کر خاموش کرایا تھا پھر میرا ازاچ بنانے کے لیے نام' تاریخ پیدائش اور دوسری باتیں پوچھی تھیں اور دو روز بعد فون کرنے کو کہا تھا اور جب میں نے دو روز بعد انہیں فون کیا تھا تو انہوں نے مجھے کچھ مشورے اور ہدایات دی تھیں۔

پروفیسر ارشد نے میرا ازاچ بنا کر مجھے جو ہدایات کی تھیں' اس پر عمل کرتے ہوئے میں پہلے روز اسد کے بچوں کے کمرے میں سونے کے لیے جانے سے قبل ہی اپنے بیڈ روم سے نکل گئی اور بچوں کے کمرے میں جا کر ان کے ساتھ سو گئی۔ صبح اٹھ کر بچوں کو اسکول بھیجا اور پھر اُن کے لیے ناشتہ بنانے کے بجائے دوبارہ سو گئی۔ وہ ناشتے کے لیے میرے بیڈ کے پاس منڈلاتے رہے مگر میں آنکھ بند کیے پڑی رہی تھی اور پھر جب ایک بھرپور نیند لے کر اٹھی تو اپنے آپ کو خاصا فریش محسوس کیا۔ بہت دنوں بعد میں نے پارلر کا چکر لگایا' اپنا ہیئر اسٹائل چینج کرایا' ایک اچھا سا فیشل لیا پھر شاپنگ مال میں جا کر اپنے لیے جدید اسٹائل میں سلے ہوئے چند سوٹ خریدے۔ شام کو میں نے اسد کے آنے سے قبل بلیک فان کنسٹراسٹ کا ٹراؤزر والا سوٹ زیب تن کیا' لائٹ پنک لپ اسٹک لگائی' پرفیوم اسپرے کیا اور پھر میں نے جب آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو خود ہی شرما گئی' یہ تو کوئی اور ہی شخصیت تھی' میرا موڈ خوشگوار ہو گیا' گنگناتے ہوئے اچھی سی چائے بنا کر لاؤن میں نکل آئی اور کین کی کرسی پر بیٹھ کر مزے سے پینے لگی۔ بچے بھی وہیں کھیل رہے تھے۔ یہ میری شادی شدہ زندگی کا پہلا موقع تھا کہ میں اسد کے بغیر شام کی چائے پی رہی تھی ورنہ اس وقت تو میں ان کے کپڑے نکال کر کھانے کی چیزیں بناتے ہوئے چائے دم دے کر اُن کا انتظار کر رہی ہوتی تھی' یوں مجھے شام کی چائے کے لوازمات بنانے میں ہی اتنا وقت لگ جاتا تھا کہ کپڑے بدلنے کا ہوش ہی نہیں رہتا تھا کیونکہ میں اُن کے لیے دو تین چیزیں بناتی تھی کہ ایک پسند نہ آئے تو انہیں شاید دوسری ہی بھا جائے پھر بھی اُن کا منہ سیدھا نہیں ہوتا تھا۔ اس دن ان کے لیے میں نے چائے کے ساتھ بازاری سموسے رکھے تھے۔

وہ جب گھر میں داخل ہوئے تو عجب بات ہوئی' اسد مجھے پشت سے پہچانے نہیں اور بچوں کو آواز دے کر میرا پوچھنے لگے اور پھر جب میں نے مڑ کر دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے' میں نے دل ہی دل میں پروفیسر ارشد کے علم کو شاباش دی تھی۔ یوں میں نے اُن کے کہنے کے مطابق اسد کو نظر انداز کرنے کی پالیسی اپنائی اور خود بہت تک سک سے درست رہنے لگی۔ اب میں رات کے کھانے میں بھی ایک ہی ڈش بناتی اور اُن کے سامنے سرو کر دیتی' اب اُن کی مرضی ہوتی' کھائیں نہ کھائیں' میں اصرار نہ کرتی کہ کر ان باتوں پر عمل کرنے کے لیے مجھے اپنے دل پر پتھر رکھنا پڑ رہا تھا مگر ان کے نتائج اچھے نظر آ رہے تھے۔ اب رات کو جب میں بچوں کے کمرے میں جانے کے لیے بیڈ روم سے اپنا تکیہ اٹھاتی تو وہ مجھے پیار بھری نظروں سے گھورتے مگر میں اپنے اٹھل پتھل دل کو سنبھالتی ہوئی کمرے سے چلی جاتی اور پھر ایک دن میں نے آخری وار کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اسد نے اپنے آفس سے ہفتے بھر کی چھٹی لی ہوئی تھی' پہلے جب وہ چھٹی لیا کرتے تھے تو میں صبح سے کچن میں گھس جاتی تھی۔ ان کے لیے نت نئے

www.pdfbooksfree.pk

کھانے پکاتی اور باتی کا وقت ان کے گرد پروانوں کی طرح نثار ہونے میں صرف کرتی تھی لیکن اس بار میں نے اپنی روایت توڑ ڈالی' پہلے دن بچوں کے ذریعے ان پر زور ڈالا اور پھر ہم سب باہر کھانا کھانے گئے' یہاں بھی میں نے اپنی توجہ اسد کے علاوہ ہر دوسری چیز پر رکھی تھی۔ میں نے فیروزی کلیوں والا گرتہ اور پیلا چوڑی دار پاجامہ پہنا ہوا تھا' کانوں میں سونے کے وہ جھمکے تھے جو اسد نے مجھے منہ دکھائی میں دیئے تھے' بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا' شوخ رنگ کی لپ اسٹک بھی لگائی تھی۔ اسد کی نظریں بھر پور ہٹ بیں رہی تھیں' ان سے کوئی پیار بھری بات کیے ہوئے مجھے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ آج اسد میرے آگے مزاحمت نہیں کر پائیں گے مگر میں بھی اُن کے دل سے اپنی محبت کا دریا بہانا چاہتی تھی اسی لیے واپسی پر بچوں کے ساتھ اپنے میکے اتر گئی۔ بچوں کا اور میرا سامان ایک بیگ میں رکھ کر میں نے پہلے ہی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھ دیا تھا۔ اسد مجھے اور بچوں کو چھوڑ کر اکیلے واپس جاتے ہوئے' بہت اداس دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے بچوں کو واپس گھر چلنے کے لیے چپکے چپکے لالچ بھی دیا تھا مگر میں جانے کتنے مہینوں بعد بچوں کے ساتھ میکے رہنے آئی تھی۔ اُن کا تو خوشی سے برا حال تھا اس لیے انہوں نے اپنے پاپا کی ہر پرکشش آفر ٹھکرا دی تھی۔

امی کے گھر پر دل تو میرا بھی نہیں لگ رہا تھا مگر میں چاہتی تھی کہ اسد اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھے لینے آئیں۔ میرا انداز تھا کہ میرے امی کے گھر رکنے سے وہ ہماری کمی ضرور محسوس کریں گے۔ دو دن انتظار میں گزر گئے مگر نہ وہ آئے نہ ہی ان کا کوئی فون آیا۔ مجبور ہو کر میں نے اپنے بھائی سے کہا کہ وہ مجھے گھر چھوڑ آئے۔ اس نے کہا کہ میں اپنی گاڑی میں پیٹرول بھرا کے آتا ہوں پھر آپ کو گھر چھوڑ دوں گا۔ میں تیار ہو کر بھائی کا انتظار کرنے لگی' تک سک سے درست رہنے کی عادت جو پڑ گئی تھی۔ بچے لان میں گھر واپسی کے لیے تیار اپنی ناٹو کے کان کھا رہے تھے۔ میں یہ سوچ کر اداس بیٹھی تھی کہ اسد کبھی بھی نہیں بدلیں گے' میرا دل رو رہا تھا کہ میں نے کس سنگدل سے دل لگایا ہے۔ اتنے میں بچوں نے آواز دینا شروع کر دی تھیں۔ ''مما..... چلیں نا' دیر ہو رہی ہے۔'' میں نے کاندھے پر بیگ ڈالا تھا اور آنسو پونچھتی ہوئی بھائی کی گاڑی میں بیٹھنے کے لیے باہر نکل آئی تھی۔

مگر یہ کیا؟ یہاں تو ہماری گاڑی کھڑی تھی۔ او مائی گاڈ! میں نے خوش ہو کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف دیکھا تو اسد اپنی وجاہتوں کے ساتھ بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ میری تو عید ہو گئی۔ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ بچے بھی خوش تھے۔ راستے میں اسد نے بتایا کہ وہ مجھے سرپرائز دینا چاہ رہے تھے اسی لیے فون کر کے نہیں آئے مگر ہمارے بچے اور میرے گھر والے اس پیاری سی سازش میں شامل تھے۔ اُس دن مجھے ایسا لگا کہ میں اپنے میکے سے پہلی بار رخصت ہو کر اسد کی زندگی میں آئی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگ لی تھی اور مجھے گھمانے پاکستان ٹور پر لے گئے تھے۔

پاکستان ٹور سے واپسی کے فوراً بعد میں نے پروفیسر ارشد سے فون پر رابطہ کیا تھا اور خوشی خوشی ساری صورت حال بتائی تھی۔

''اس دوران آپ کے سسرال والوں کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا تھا؟'' پروفیسر ارشد نے پوچھا۔

''بہت حوصلہ شکن' میرے کام سے ہاتھ اٹھا لینے پر انہوں نے بڑے طعنے دیئے' میرے میک اوور پر انہوں نے میرا مذاق اڑایا مگر میں ہمت سے ڈٹی رہی۔ انہوں نے اسد کے کان بھی بھرے مگر کیوں کہ اسد کے من کو خود بھی میرے اندر آنے والی تبدیلیاں بھا رہی تھیں اس لیے ایک دن انہوں نے سب کے سامنے دانشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ کوئی بھی مجھے کسی کام کے کرنے پر مجبور نہیں کرے گا ورنہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ کہیں اور شفٹ ہو جائیں گے۔ سونے کا انڈہ دینے والی مرغی کو کون ہاتھ سے جانے دیتا ہے' دوسرے دن سے سب سدھر گئے۔ میرے لیے وہ ہی احترام گھر والوں کے لہجے میں در آیا جو شادی کے شروع دنوں میں ہوتا تھا۔'' میں نے چہکتے ہوئے یوں بتایا تھا کہ پروفیسر ارشد بھی ہنس دیئے تھے پھر میں نے بہت بہت شکریہ ادا کرنے کے بعد فون رکھ دیا تھا۔

یہ اس بات کے ایک ہفتے بعد کی بات ہے کہ میرے چچازاد بھائی اظہر بیگ مجھ سے ملنے آئے تھے اور میں ابھی پروفیسر ارشد کے حوالے سے اُن کا شکریہ ادا کرنے ہی والی تھی کہ وہ بول پڑے تھے۔

''عاصمہ.....! میں بہت شرمندہ ہوں' میں نے تمہیں پروفیسر ارشد کا جو نمبر دیا تھا' وہ اب ان کے زیر استعمال نہیں۔ دراصل انہوں نے اپنا پرانا کرائے کا گھر چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ اپنے گلشن اقبال میں واقع اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ میری بڑے دنوں بعد کل جب اُن سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے یہ بات بتائی اور اپنا نیا نمبر بھی دیا ہے۔ تم آج چار بجے کے قریب اُن کو فون کر لینا۔'' اُس کے بعد انہوں نے ایک چٹ مجھے دی تھی جس پر کالے پین سے پروفیسر ارشد کا کوئی اور نمبر لکھا ہوا تھا۔

'تو پھر وہ کون تھے جن سے میں پروفیسر ارشد سمجھ کر اپنا حالِ دل کہتی رہی تھی؟' یہ سوال مجھے بہت زیادہ پریشان کر رہا تھا۔ میں نے اپنے چچازاد بھائی کے جاتے ہی فوراً پروفیسر ارشد کا دیا ہوا پرانا نمبر ملایا تھا۔ بہت دیر تک بیل ہوتی رہی تھی مگر کسی نے فون نہیں اٹھایا تھا۔ میں نے کئی بار ٹرائی کیا تھا۔ آخر ایک گھنٹے بعد کسی عورت نے فون اٹھایا تھا۔

محبت کچھ نہیں ہوتی.....

محبت کچھ نہیں ہوتی
محبت کچھ نہیں ہوتی
تمہیں کیسے میں سمجھاؤں؟
یقین کر لو
یہی سچ ہے
محبت اک نظر نہ آنے والے سائے جیسی ہے
ہمیشہ ساتھ چلتی ہے
محبت ایک دھواں سا ہے
جو بس تحلیل ہوتا ہے
ہماری نرم سانسوں میں
ہماری گرم سانسوں میں
محبت نم سا ہے اک لمس
جو دل کو سیلا رکھتا ہے
محبت چاند کے جیسی
جو اکثر ہاتھ آنے پر بھی مٹھی میں نہیں آتی
محبت رات کا گجنو
جو دکھنے اور چھپنے میں ہی بس الجھائے رکھتا ہے
محبت بس یہی ہے کہ
محبت کچھ نہیں ہوتی
محبت کچھ نہیں ہوتی.....

شازلی سعید مغل' کراچی

www.pdfbooksfree.pk

"مجھے پروفیسر صاحب سے بات کرنی ہے؟"

"اوہ..... آپ کا مطلب شاید ڈاکٹر صاحب سے ہے اوکے ویٹ۔" وہ نسیں پھڑپھڑا کھڑے ہو کر آواز دینے لگیں۔ "عابدی..... عابدی.....!

ارے بھئی آپ کا فون ہے۔ اب آپ کے مریض گھر پر بھی فون کرنے لگے ہیں۔" اس عورت کے لہجے میں شرارت تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ مہربان آواز میرے کانوں سے ٹکرائی جس کی وجہ سے میری زندگی کو سکون حاصل ہوا تھا۔

"وہ..... وہ..... آپ کون ہیں؟" میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں؟ "اچھا تو آپ کو پتا چل گیا کہ میں پروفیسر ارشد نہیں ہوں؟" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"پلیز..... آپ اس سسپنس کو توڑ دیں۔" میرے جسس اور لہجے میں عجلت تھی تو انہوں نے بھی مزید وقت برباد کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

"میں ڈاکٹر حسن عابدی ہوں نئی نے پروفیسر ارشد کی جگہ یہ گھر کرائے پر لیا ہے اس طرح اُن کا پرانا فون میرا نیا نمبر بن گیا ہے کیونکہ یہ فون مالکہ مکان نے لگوایا ہے تو ہر کرائے دار کے زیر استعمال رہتا ہے۔ اُس دن آپ نے شاید مایوسی کی انتہاؤں پر پہنچ کر اس نمبر کو پروفیسر ارشد کا نمبر سمجھتے ہوئے فون کیا تھا اور جب میں نے آپ کو بتانا چاہا تھا کہ میں پروفیسر ارشد نہیں ہوں تو آپ نے سننے کی زحمت نہیں کی تھی بلکہ کچھ گزرنے کی دھمکی دی تھی اس لیے مجبوراً میں نے آپ کی پوری کہانی سن کر اپنی تعلیم اور تجربے کے حساب سے آپ کا کیس حل کر دیا تھا بس اتنی سی بات تھی۔" ڈاکٹر حسن عابدی نے شگفتہ انداز میں سارا ماجرا کہہ سنایا تھا۔

"اوہ..... اچھا تو یہ بات تھی مگر آپ نے ابھی بھی میرے سوال کا جواب نہیں دیا کہ آپ....." میں نے جلدی سے پوچھا تھا۔

"بس بی بی! میں ایک نفسیاتی ڈاکٹر ہوں اسی لیے آپ کے شوہر کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے ریورس سائیکالوجی کی اصطلاح کے مطابق آپ کو کچھ مشورے اور ہدایات دی تھیں۔ اصل میں مرد تلون مزاج ہوتا ہے وہ زندگی میں تبدیلیوں کا خواہاں ہوتا ہے آپ کے شوہر اسد بھی روٹین لائف سے اکتا گئے تھے۔ آپ نے اُن کے معدے کا تو خیال رکھا مگر اُن کے دل کا خیال رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بیوی کو بیوی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے خادمہ کے روپ میں نہیں۔ میرے مشوروں پر عمل کر کے آپ نے ایسی تمام چیزوں کو اُن کی زندگی سے نکال پھینکا جو انہیں آپ سے دور کر رہی تھیں اور اُن باتوں کو اُن کی زندگی میں داخل کرنے کی کوشش کی جس سے وہ زندگی میں بدلاؤ محسوس کریں کیونکہ ہر وقت بیٹھا کھانا مضر صحت ہے اسی لیے آپ نے اپنی مٹھی محبت میں تھکاوٹ ڈال دیا تھا۔ آپ کے شوہر اسد کو آپ سے بس یہ ہی مسئلہ تھا جو میں نے دور کر دیا اور ہاں وہ زائچہ وغیرہ تو میں نے صرف آپ کی تسلی کے لیے بنایا تھا کیونکہ آپ مجھے ستاروں کا علم رکھنے والا پروفیسر سمجھ رہی تھیں ورنہ مجھے ستاروں کے بارے میں کوئی علم اور معلومات نہیں ہیں۔"

•.....•.....•

میری زندگی اب اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ بڑی بھرپور گزر رہی ہے اور ہاں ڈاکٹر حسن عابدی کا شمار ہمارے نہایت ہی قریبی فیملی فرینڈز میں ہوتا ہے۔ وہ مجھے زندگی کو بہترین انداز میں گزارنے اور سنوارنے کے لیے بے شمار مشورے دے چکے ہیں۔ اُن میں سے ایک مشورہ میں آپ قارئین کو بھی بتا رہی ہوں' یہ آپ کے لیے بہت کارآمد ہو سکتا ہے۔

"کسی کی نظروں میں اپنے آپ کو منوانے کے لیے پہلے خود سے اپنے آپ کو منوانا ضروری ہوتا ہے۔"

ثمرین ادریس

سفر حیات یوں کٹا

حباب عباسی کا خیال

آنکھوں میں لکھے ہوتے ہیں اک عمر کے مدعے
ہاتھوں کی لکیروں میں لکھا کچھ نہیں ہوتا

اپنی حوصلوں سے زندگی ایک صنف نازک کا قصہ دردوالم

میری طبیعت ساری رات ٹھیک نہیں رہی تھی۔ عجیب سی بے چینی محسوس ہوتی رہی تھی۔ میں دوسرے دن اپنی بہت ہی اچھی اپنی ہم نام دوست ڈاکٹر ثمرین افضل کے کلینک جا پہنچی تھی۔ بلڈ پریشر وغیرہ چیک کرنے کے بعد انہوں نے کچھ دوائیاں دی تھیں اور چند مشوروں کے بعد کہا تھا۔

"ثمرین.....! آج کل تو تم اسکول سے چھٹیوں پر ہو میری ایک واقف کار ضرورت مند خاتون کو free میں انگریزی پڑھا دو۔"

"میرے پاس ٹائم تو نہیں ہے۔ خیر میں دیکھوں گی۔ فی الحال تو میں چلتی ہوں میرے Dear hubby دفتر سے آچکے ہوں گے روٹی ڈالنی



www.pdfbooksfree.pk

ہے۔"

"سنو! وہ کل تمہارے گھر آ رہی ہے۔" ثمرین نے تو جیسے فیصلہ کر ڈالا تھا۔

دوسرے دن میں گھر کے کاموں میں مصروف تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ "اسامہ! اجالا! عثمان! دروازے پر کوئی ہے' دیکھو کون ہے؟" میں نے اپنے بچوں کو آواز دی تھی۔

"ممی! کوئی آنٹی آپ کو بلا رہی ہیں۔" عثمان یہ بتا کر بھاگ گیا تھا۔

"کون آ گیا؟" میں بڑبڑاتے ہوئے دروازے تک گئی تھی۔ وہاں ایک خاتون موجود تھیں۔

"آپ ثمرین ادریس ہیں؟" آنے والی خاتون نے تصدیق چاہی تھی۔

"جی' میں ثمرین ادریس ہوں..... اور آپ؟"

"میرا نام علیزہ ہے۔ مجھے ڈاکٹر ثمرین افضل نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ میں آپ سے انگریزی پڑھنا چاہتی ہوں۔" علیزہ صاحبہ نے اپنے تعارف کے ساتھ ہی آنے کی وجہ بتائی تھی۔ میں نے انہیں گھر کے اندر بلا کر بٹھانے کے بعد کہا تھا۔

"علیزہ صاحبہ..... اسوری' میں home tuition نہیں کرتی۔ میں آرام کے علاوہ بچوں کے ساتھ time spend کرنے کے لیے چھٹیوں پر ہوں۔ آپ کو برا تو لگا ہوگا مگر میں straight forward ہوں۔ خیر اب آپ یہ بتائیں' چائے لیں گی یا کولڈ ڈرنک؟" میں نے بہت خلوص سے پوچھا تھا۔

"دیکھیں..... میں بہت مایوس ہو چکی ہوں....." یہ کہہ کر انہوں نے رونا شروع کر دیا تھا اور اس قدر روئی تھیں کہ بس میرے لیے اُن کو چپ کرانا مشکل ہو گیا تھا' ساتھ ہی دل میں یہ تجسس بھی پیدا ہوا تھا کہ اُن سے پوچھوں' آخر ایسا کیا معاملہ ہے؟ وہ اتنی پریشان کیوں ہیں؟" اور پھر میں نے اُن سے یہ بات پوچھ بھی لی تھی۔

پانی وغیرہ پینے کے بعد جب اُن کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تھی تو انہوں نے کہنا شروع کیا تھا۔

"میں کراچی میں ناظم آباد کے علاقے میں پیدا ہوئی۔ میری ایک بہن اور بھائی مجھ سے بڑے ہیں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں میری شادی انوار احمد نام کے ایک صاحب سے کر دی گئی۔ وہ اُس وقت اڑتیس سال کے تھے اور پیشے کے اعتبار سے بزنس مین تھے۔ ہماری شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ مجھے دلہن بننے کا بہت شوق تھا۔ میں دلہن بنی خلیہ مُردی میں اپنے شریکِ زندگی کا بہت دیر تک انتظار کرتی رہی تھی اور پھر وہ آخر آ ہی گئے تھے۔ میں بہت شرما اور گھبرا رہی تھی کہ وہ میرا گھونگھٹ اٹھا کر کچھ کہیں گے مگر انہوں نے تو میری آرزو اور امید کے برعکس بس یہ فرمایا تھا۔ "میں لائٹ بند کر رہا ہوں' تم بھی کپڑے تبدیل کر کے سو جاؤ۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ فی الحال بس آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

میں حیران پریشان واش روم چلی گئی اور کپڑے تبدیل کر کے بیڈ کی دوسری طرف سونے کے لیے لیٹ گئی تھی مگر صبح سویرے اچانک انہوں نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا۔ میں نے آنکھ کھولی تو وہ اپنی مردانگی کا اظہار کر رہے تھے۔ میرے لیے یہ سب کچھ بڑا عجیب تھا اور پھر انہوں نے بس اپنی ضرورت پوری کر لی تھی اور دوبارہ سو گئے تھے۔ یہ تک محسوس نہ کیا تھا کہ میں رو رہی ہوں' میں روتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی۔ ایسی ہوتی ہے سہاگ رات؟

میری شادی شدہ زندگی کا آغاز بہت تکلیف دہ اور اذیت ناک تھا۔ انوار میری ہر بات' ہر چیز میں برائی تلاش کرتے تھے' میرا بولنا انہیں بڑا برا لگتا تھا۔ میں نے انٹر کیا تھا۔ میں باتونی تھی مگر جب سے یہاں آئی تھی' کم بات کرتی تھی۔ انہیں میرے گانے میں ہمیشہ نقص ہی زیادہ لگتا' میری عمر کم تھی' بات بھی ان کے لیے مسئلہ تھی۔ اکثر کہتے۔ "تم بچوں جیسی حرکتیں کر رہی ہو۔" میری ہر پسند انہیں ناپسند تھی۔ کپڑوں میں میرا پسندیدہ رنگ گلابی تھا' وہ کہتے۔ "گلابی رنگ میں تم بندر یا لگتی ہو۔" میں ٹی وی پر جو بھی مچینل لگاتی' غصے میں آ کر پوچھتے۔ "یہ کون سا چینل دیکھ رہی ہو؟" غصہ بھی ایسا تھا کہ جو چیز ہاتھ میں ہوتی' دے مارتے۔ بس قسمت ہی تھی کہ میں زیادہ تر اپنے آپ کو بچا لیتی تھی۔ میری شکل و صورت میں ہمیشہ نقص نکالتے حالانکہ میں کافی خوبصورت تھی۔ میں اکثر سوچتی۔ کہیں یہ نفسیاتی کریش تو نہیں؟ اُن کے ساتھ میرا دن تو کسی نہ کسی صورت گزر جاتا تھا لیکن شب تو بہت ہی اذیت ناک ہوتی تھی۔ رات ہوتی تو وہ وحشی درندہ بن کر میرے اوپر ٹوٹ پڑتے تھے۔ گلتا ہی نہیں تھا کہ وہ انسان ہیں۔ میں روتی اور شکایت کرتی تو جواب ملتا۔ "یہ تو میرا حق ہے' تم میری بیوی ہو' میں چاہے تمہارے ساتھ جو بھی سلوک کروں۔"

ان کے انہی رویوں اور حرکات کی وجہ سے رفتہ رفتہ میرے دل سے ان کا احترام بالکل ختم ہو گیا تھا۔ خیر زندگی کا سفر ایسا ہی چلتا رہا کہ ایک روز ان کے سامنے اچانک ہی مجھے الٹیاں شروع ہو گئی تھیں۔

"یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے علیزہ؟" انوار احمد نے واش روم کے دروازے پر کھڑے ہو کر مجھ سے پوچھا تھا۔

"میں pregnant ہو گئی ہوں شاید' پرسوں اماں کے یہاں بھی الٹیاں ہو رہی تھیں۔ انہوں نے سمجھایا تھا کہ....."

سنو.....!

سنو.....! میرے قریب تو آؤ
بہت اداس ہوں میں
بس آج ٹوٹ کے چاہو
بہت اداس ہوں میں
اندھیری رات ہے' کچھ بھی نظر نہیں آتا
ستارے توڑ کے لاؤ' بہت اداس ہوں میں

زوہیب ماہی۔ ملائیشیا

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" انوار احمد نے غصے میں میری بات کاٹتے ہوئے مجھے تھپڑ مارا تھا۔ "تو خود ابھی بچی ہے' بچہ کیا پالے گی؟ اور کمینی..... تو مجھے یہ بات آج بتا رہی ہے؟ مجھے یہ بچہ نہیں چاہیے' چل جلدی سے تیار ہو جا میں تجھے ڈاکٹر کے پاس لے جا کر یہ قصہ ہی ختم کروا دوں۔"

"نہیں..... میں اس بچے کو abort نہیں کرواؤں گی' یہ میرے لیے اندھیرے میں اجالے کی آخری کرن ہے۔" میں یہ فیصلہ کر کے بیڈ روم میں آئی تھی اور اپنے کپڑوں کے چند جوڑے اور ضرورت کا کچھ سامان بیگ میں ڈالا تھا۔ انوار احمد اُس وقت واش روم میں تھا۔ میں ابھی اُس گھر سے نکلا ہی چاہ رہی تھی کہ انوار احمد واش روم سے باہر آیا تھا اور میرا ارادہ جان کر اُس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر کھینچا تھا۔

"کمینی..... تو اس حرامی کو پیدا کرنے کے لیے میرے گھر سے بھاگ رہی ہے؟ جسے میں چاہوں تو تیری کوکھ میں ہی مار دوں....." یہ کہہ کر مجھے اس نے اتنا مارا تھا کہ میں گر کے بے ہوش ہو گئی تھی۔ بے

www.pdfbooksfree.pk

ہوش ہوتے ہوئے مجھے ایسا لگا تھا جیسے پڑوس کے کچھ لوگوں کی آواز کے ساتھ گھر کا دروازہ زور زور سے بجایا جارہا ہو۔

میری آنکھ کھلی تھی تو امی ابا میرے سرہانے موجود تھے۔ ”اب کیسی ہو بٹیا؟“ ابا نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تھا۔ میں ابا سے لپٹ گئی تھی اور روتے روتے faint ہوگئی تھی اور پھر پانی کے قطرے منہ پر پڑنے تو ہوش آیا تھا۔

”ابا..... ! یہ بچہ میری زندگی ہے، مجھے نہیں مارنا امی کو.....“ میں نے روتے اور بلکتے ہوئے کہا تھا۔

”تم فکر مت کرو میری جان..... ! اب تم جیسا چاہو گی ویسا ہی ہوگا۔ اس انوار کی تو ایسی کی تیسی، تم بس آرام کرو۔“ یہ کہہ کر ابا چلے گئے تھے۔

”امی..... ! وہ مجھے بہت تکلیف دیتا تھا۔ میں ہر رات کانٹوں پر سوتی تھی۔“ میں نے امی کا ہاتھ چوم لیا تھا۔

میرے سخت اور کڑے وقت میں پڑوسی بہت کام آئے تھے۔ انہوں نے ہی اس ظالم انوار سے مجھے بچایا اور میرے ماں باپ کو بلایا تھا اور پھر بڑی مشکلوں سے اس نے مجھے طلاق دی تھی۔ خلع کے ساتھ ہی اللہ نے مجھے ایک چاند سا بیٹا دیا تھا۔ اس کا نام ہم نے مہربان رکھا تھا۔

•.....•.....•.....•

وقت کا سفر جاری رہا تھا۔ مہربان عمر کے زینے پر قدم رکھتا چلا گیا تھا۔ باوجود اس کے کہ ابا امی مجھے سپورٹ کرتے تھے میں نے گلی کے اسکول میں نوکری کرلی تھی اور اپنی اولاد کی پرورش کے لیے خود بھی رزقِ حلال کمانے لگی تھی۔ اس دوران میں انوار احمد کے بارے میں خبریں ملتی رہی تھیں کہ اس نے دوسری شادی کرلی تھی اور اولادِ نرینہ کی خواہش میں لگاتار پانچ بیٹیوں کا باپ بن گیا تھا۔

اُس روز میں اسکول سے جیسے ہی نکلی تھی، ایک سفید ہنڈا اسٹی میرے سامنے آکر رکی تھی۔ کار کا دروازہ کھلا تھا اور انوار احمد نے باہر آتے ہی مہربان کو گلے لگالیا تھا اور نہایت جذباتی انداز میں بولا تھا۔ ”یہ میرا بیٹا ہے ناں؟ میرے دل کا ٹکڑا، بولو علینہ! یہ میرا بیٹا ہے ناں؟“

میں نے خوب سوچ سمجھ کر جواب دیا تھا۔ ”ہاں انوار احمد! یہ تمہارا ہی بیٹا ہے، وہ بیٹا جس کی دنیا میں آنے سے پہلے ہی تم جان کے دشمن تھے، تو پھر آج یہ سب کیا؟“

”دیکھو پلیز، مجھے معاف کردو، مجھے اپنی اولاد سے ملنے دو۔“ وہ جیسے میرے آگے گڑگڑانے لگا تھا۔

ہمارے چاروں طرف اب لوگ جمع ہونے لگے تھے۔ میں نے انوار احمد کی توجہ اس طرف دلائی تھی اور مہربان کا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے گھر کی راہ لی تھی۔ انوار احمد بھی میرے پیچھے پیچھے میرے گھر کے دروازے پر اور پھر میرے گھر کے اندر بھی آ گیا تھا اور ابا سے بہت دیر تک نہ جانے کیا بات کی تھی۔

انوار احمد کے جانے کے بعد ابا نے آواز دی تھی۔ ”بیٹی علینہ! اِدھر آؤ۔“

”جی ابا!“ میں جواب دیتے ہوئے ابا کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

”بیٹی! انوار احمد اپنی اولاد سے ملنا چاہتا ہے اور یہ تو قانوناً بھی جائز ہے، وہ اپنے بیٹے کے لیے تھوڑا خرچہ پانی بھی دینا چاہتا ہے۔ آج تمہارا بیٹا مہربان آٹھ سال کا ہے، مجھے ابا کہتا ہے مگر جب کل بڑا ہوگا اور باپ کا پوچھے گا تو کیا جواب دو گی؟ اب فیصلہ تمہارا ہے؟“ ابا یہ کہنے کے بعد اٹھ کر چلے گئے تھے اور میں اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

سارا دن اور ساری رات سوچتے ہوئے ہی گزری تھی۔ زندگی کسی فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی تھی اور پھر صبح اذان کی آواز پر نماز سے پہلے میں فیصلہ کرچکی تھی۔

صبح اسکول جاتے ہوئے میں نے ابا سے کہا تھا۔ ”ابا! آپ کسی وکیل سے مل کر مہربان کا اپنے باپ سے ملاقات کا قانونی طور پر کوئی طریقہ طے کرلیں، یہ فیصلہ میں صرف اور صرف اپنے بیٹے کی بھلائی کی خاطر کررہی ہوں۔“

ابا نے میری بات سن کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ”ویسے بیٹا! مجھے تو وہ انوار بھی اب بہت بدلا بدلا لگتا ہے۔“ ابا کی یہ بات سن کر میں بس ایک ٹھنڈی سانس ہی بھر کر رہ گئی تھی۔

اُس دوپہر اسکول سے واپس آنے کے بعد کھانے وغیرہ سے فارغ ہوکر میں نے اپنے بیٹے کو آواز دی تھی۔

”مہربان! کہاں ہو تم؟“

”میں یہاں ہوں ممی!“ مہربان نے جیسے ڈرتے ڈرتے ٹیبل کے نیچے سے جواب دیا تھا۔

”ٹیبل کے نیچے کیا کررہے ہو؟ باہر آؤ۔“ میں نے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا۔

”ممی! وہ انکل کون تھے؟ میرے پپا؟“ مہربان نے اپنی بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں حیرت بھر کے پوچھا تھا۔

”وہ آپ کے پپا ہیں اور ابا، میرے ابا ہیں۔ ٹھیک ہے، وہ آپ سے ملنے آئیں گے تو آپ کے لیے Toys بھی لے کر آئیں گے۔“ میں نے پیار سے اسے سمجھایا تھا کہ اچانک میرے موبائل کی اسکرین پر کوئی انجان نمبر نمودار ہوا تھا۔ ”کون ہوسکتا ہے؟“ یہ سوچتے ہوئے میں نے کال ریسیو کی تھی۔

دوسری طرف انوار احمد تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”دیکھو علینہ! میری موجودہ بیوی اچھی نہیں ہے، بہت سخت اور بدتمیز ہے۔ تم واقعی بہت اچھی تھیں۔ پلیز، میری زندگی میں لوٹ آؤ، مجھے اب اپنے بیٹے مہربان اور تمہارے ساتھ رہنا ہے۔ میں معافی مانگتا ہوں، اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوں۔ وہ تمام حرکتیں جو میں نے کیں، ان کا پچھتاوا ہوگئی تھیں۔“

میں نے حوصلے سے جواب دیا تھا۔ ”انوار احمد! میں تمہارے بچے سے تمہیں ضرور ملنے دوں گی اور رہی بات تمہاری اور میری تو ایسا ممکن نہیں ہے اور ہاں، تم نے کہا کہ تم اپنی بیوی سے خوش نہیں ہو تو یہ تو تمہاری پانچ عدد اولادوں سے اندازہ ہوگیا، تم مردوں کا بھی جواب نہیں، بیوی پسند نہیں مگر اولادیں اُس ہی بیوی سے خوب پیدا کرتے ہو۔ میں اب آٹھ نو سال اکیلی رہ چکی ہوں، اب مجھے کسی مرد کے سہارے کی ضرورت نہیں، تم نے مجھے اس قدر جسمانی اذیت دی اور abuse کیا کہ مردوں کی ذات سے میرا اعتبار ہی ختم کردیا۔ میرا تو سب کچھ تمہارا تھا، اگر تم مجھے پیار کرتے تو میں تم پر اپنا جسم و جان سب قربان کردیتی۔ تم پر اب اعتبار کیسے کروں؟ بہرحال تمہارا بیٹا مہربان قانوناً شرعاً اب تو سال کا ہونے والا ہے، وہ تم سے مل سکتا ہے اور ہاں، انوار احمد! اللہ نے تم کو پانچ بیٹیاں امتحان کے طور پر دی ہیں۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کردیا تھا۔

•.....•.....•.....•

انوار احمد عدالتی حکم کے تحت اپنے بیٹے مہربان سے مہینے میں دو بار ملنے لگا۔ مجھے بیٹے سے ہی پتا چلا تھا کہ اس نے داڑھی رکھ لی ہے اور کچھ لوگوں سے یہ بھی سننے میں آیا کہ وہ بدل گیا ہے۔ ایک دن ملاقات کے بعد وہ بیٹے کو چھوڑنے آیا تو گیٹ میں

www.pdfbooksfree.pk

نے ہی کھولا۔ اس نے سلام کیا۔ واقعی وہ کچھ کچھ تو بدل گیا تھا۔ کہنے لگا۔ ”کیا تم مجھ سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہو؟ میں حلالہ کا سارا انتظام کر دوں گا۔ میں اب اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں اور میں.....“

”انوار احمد! تم بالکل بھی نہیں بدلے۔“ میں نے اُس کی بات کاٹی تھی۔ ”تم آج بھی آئے ہو تو حلالہ کی بات لے کر مگر میں تو تم کو اپنی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال چکی ہوں۔“ میری یہ بات سن کر وہ سر جھکائے ہوئے چلا گیا تھا۔

•.....•.....•

وقت کے دھارے پر میری زندگی کا سفر جاری رہا۔ امی اور ابا ضعیف ہو گئے تو بھائی شادی شدہ۔ مہریان نے جوانی سے رشتہ جوڑا تو میرے بالوں میں چاندنی چمکنے لگی ہے۔ انوار احمد اُس دن کے بعد خود بھی میرے پاس نہیں آیا، کبھی کبھار اُس کا کوئی خط آتا ہے شرمندگی سے بھرا ہوا، وہ اپنے بیٹے مہریان کا بہت خیال رکھتا ہے۔ کبھی کبھار اُسے اپنے گھر بھی لے جاتا ہے۔ مہریان ویسا ہی بنا ہے جیسا میں نے چاہا۔ میں اب ایک اسکول میں Maths کی استاد ہوں مگر آج کل انگریزی کا دور دورہ ہے لہٰذا میں آپ سے انگریزی پڑھنا چاہتی ہوں۔ میرے بیٹے نے بیرونِ ملک اسٹوڈنٹ ویزہ کے لیے اپلائی کیا ہے۔ وہ وہاں جا کر مجھے بلا لے گا۔ مجھے انگریزی نہیں آتی اور زندگی میں کچھ پانے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ میں اب چالیس سال کی ہونے والی ہوں، مہریان تقریباً بائیس برس کا ہو رہا ہے۔ وہ پڑھائی کے ساتھ job بھی کرتا ہے، بس یہی ہے میری کہانی۔ لوگ اپنی بیٹیوں کے لیے بڑے گھر، بہت پیسوں والے کی خواہش کرتے ہیں مگر وہ نہیں جانتے کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ میرے گھر والوں نے بھی میرا بھلا ہی چاہا تھا مگر.....“ وہ پھر رونے لگی تھیں۔

میں انہیں غور سے دیکھ رہی تھی۔ لمبا قد، بڑی بڑی آنکھیں، گورا رنگ، کتابی چہرہ، چالیس کے بجائے وہ تیس کی لگ رہی تھیں، سر پر دوپٹا اوڑھا تھا، اس میں سے ریشمی بال جھانک رہے تھے۔ میرے دل میں آیا تھا، اُن سے کہوں۔

"Why don't you get married again?"

شاید وہ میرے دل کی بات سمجھ گئی تھیں۔ ”میں اب شادی نہیں کر سکتی۔ ہمارا معاشرہ ایسی عورت کی شادی مشکل سے قبول کرتا ہے جو جوان بیٹے کی ماں ہو۔ اب یہ الگ بات ہے کہ بیٹا اپنی شادی کے بعد ماں کو بیوی کے کہنے پر گھر سے نکال ہی کیوں نہ دے۔“

میں نے انہیں صرف پڑھانے کی حامی ہی نہیں بھری تھی، زندگی کے ہر موڑ پر اُن کے کام آنے کا بھی سوچ لیا تھا۔

محترم قارئین.....! میری اکثر کہانیوں میں عورت کی زندگی دکھوں سے بھری نظر آتی ہے جبکہ یہ حقیقت ہے کہ عورت بہادری کا نام ہے۔ اللہ نے عورت کو فولاد سے زیادہ مضبوط، گلاب کی پنکھڑی سے زیادہ نرم، سمندر سے زیادہ گہرا اور محبتوں کا انمول خزانہ بنایا ہے۔ ہمیں عورت کے ہر روپ کو اہمیت دینی چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ اللہ کو جب اپنے بندوں پر پیار آیا تو اس نے عورت کو تخلیق کیا اور ماں بنا کر تو اس پاک پروردگار نے اِس جہان پر ایک بہت بڑا احسان کیا۔ اللہ کے بعد اگر کوئی ہمیں سب سے زیادہ پیار کرتا ہے تو وہ ہے ہماری پیاری ماں..... تو آج سے اپنی ماں کی قدر کریں اور گھروں میں عورتیں آپ کی ماں، بہنیں اور بیویاں ہیں، اُن کو انسان سمجھیں اور اُن کا خیال کریں۔ عورت صرف محبت کی بھوکی ہوتی ہے۔

ھ

حقیقی جاگتی تحریریں ☆ زندگی کی ہفت رنگ تصویریں

حنیف سحر

گردشِ رنگِ چمن

رسا چغتائی کا خیال
صرف مانع تھی حیا بند قبا کھلنے تک
پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

اس عورت کا حقیقی روپ سامنے لاتی کہانی جسے زاہدہ حنا لائف کہتا ہے، دوسرا حصہ



www.pdfbooksfree.pk

"عزیمت....." ایک سرد آہ ماہ لقا نے کھینچی اور اس کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کے احساسات کے عکس بن بن کے بگڑنے لگے جیسے وہ ماضی کے ہیولوں کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ کس منظر میں رکے اور کسے چھوڑ دے فیصلہ نہیں کر پا رہی۔

"غالباً آپ احتیاط سے کام لے رہی ہیں' منظروں کے چناؤ کے فیصلوں میں الجھی ہوئی ہیں؟" سائرس نے تادیر خاموشی کو محسوس کرنے کے بعد کہا۔

"شاید آپ صحیح کہتے ہیں' ایک لکھنے والے کی نظر اتنی ہی گہری ہونی چاہیے۔" وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد گویا ہوئی۔

"دنیا سے طوائفوں کو بھی ڈر لگتا ہے؟"

"ڈر.....عورت کا سب سے بڑا دشمن ہے کیونکہ وہ نگوم تھی یا نہ تھی مگر اس کی زندگی کنیزوں اور زرخرید لونڈیوں جیسی بنا دی گئی۔ ہزاروں طرح کی زنجیریں پہنائی گئیں اور وہ جتنی توڑتی جاتی ہے' اتنی ہی پھر پہنا دی جاتی ہیں اس حد تک کہ جب وہ پوری طرح آزاد ہو جائے گی' تب بھی اس احساس سے پیچھا نہ چھڑا سکے گی کہ زنجیریں اس کی کتنی گہری رفیق اور ساتھی رہی ہیں' بس کچھ وقت گزرنے کے بعد ٹھہرا ہوا سا رہتا ہے تو یوں سمجھو کہ طوائف کے پاس شریف اور باکردار لڑکیوں جیسی عزت اور اس کے کھو جانے کا ڈر بھلے ہی نہ ہو' پر اس ڈر کا احساس عورت کے وجود میں ہمیشہ کنڈلی مارے بیٹھا رہتا ہے۔ کیا طوائف کو عورت نہ سمجھنے سے وہ عورت نہیں رہتی؟"

"ماہ لقا' یہ تو اتنی گہری باتیں کرنا کس سے سیکھ گئی؟ میں نے تو تجھے ہمیشہ منہ پھاڑ قسم کی گالیاں اور فحش کاروباری گفتگو کرتے ہی دیکھا ہے؟" نصرت نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

"تیرا دوست فلسفی ہے' لکھتا ہے اور حکیم کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ اتنی دیر اس پڑھے لکھے آدمی کی محبت میں بیٹھنے سے کچھ فلسفی سی ہو گئی..... مگر تو لگتا ہے دیوار کے ساتھ لگا پتھر ہے' جو دیوار بھی نہیں بن سکتا' وہی پتھر کا پتھر ہی رہے گا۔"

"آپ دونوں آپس کی گفتگو چھوڑیں اور آپ ماہ لقا' اپنی کہانی کو وہیں سے شروع کریں جہاں سے چھوڑی تھی۔" سائرس کو لگا' دونوں پھر بکھارنے نہ لگیں کہیں۔

"کہاں سے چھوڑی تھی؟" وہ کچھ عجیب سی معذوریت سے بولی۔

"آپ فیصل کے گھر پہنچیں تو وہ پھر اکیلا تھا۔"

سائرس نے اس فضا کو دانستہ اپنے لہجے کی گمبھیرتا سے مزید لبریز بنائے رکھا۔

"ایک دفعہ تو بچ نکلی تھی مگر مجھے لگا کہ یار پارچ نہ پاؤں گی' یہ وقت مجھ پر آتا ہی رہے گا اور کبھی نہ کبھی وہ شکاری میرے پر نوچ ہی ڈالے گا' بس یہ سوچ تھی جس نے مجھے آناً فاناً طواف بنا دیا اور سچ پوچھو تو سائرس۔ طواف بھی عورت ہے' اسے صرف سوچ کی برہنگی نے ہی طوائف بنایا ہے۔" سائرس چپ رہا۔ وہ ماہ لقا کو بولنے کا زیادہ موقع دینا چاہتا تھا۔

"پھر میں گھر میں داخل ہوئی' سوچوں کی چنگھی نے ایک ایسی جست میں مضبوط عورت کا روپ دھارن کر لیا کہ میں نے اس ملاقات کو خود طے کیا اور کہاں سے شروع ہو کر کہاں تک لے جا سکتی ہوں' بس پھر فیصل کو مجھ سے فلسوں کی طرح زور آزمائی کر کے میری عزت لوٹنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں اسے ایسا ماحول اور اتنی گرم جوشی دیتی کہ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر کر دیتی تھی۔ یہی تھی میرے طوائف بننے کی ابتدا..... بے حد دلآویز تسلیاں اور خوشنما امیدوں کی دنیا میں لے جاتی کہ میں بہت ہر طرح کی خرمستیوں کے باوجود اسے محبت کے رستے پر چلنے کی ترغیبیں دیتی۔ ہر روز جب وہ ملتا' بلاسبب اس سے ایسے سوالات کرتی کہ وہ مجھے اکیلے میں یاد کرتا ہے؟ میں اس کے خوابوں میں آتی ہوں یا نہیں اور میرے بارے میں اس کی سوچیں کیا ہیں؟ اس کی راتوں کی نیند اڑی کہ نہیں؟ ایک موہوم سی امید پر جانے کتنی ہی بار میں نے فیصل سے ایسے سوالات کیے مگر ہر بار اس کی ہونا کی اور بڑھتی ہوئی دست درازی میں میرا نصیب بنتی' وہ بس مجھے جلد سے جلد داغدار کرنے اور پھر سستی سی رکھیل بنانے پر ہی مصر نظر آتا۔ میں جتنا اسے پاکیزہ اور آرزوؤں' ارمانوں بھری محبت کی داستانیں اور حکایتیں سناتی' وہ اتنا ہی مجھے دبوچ لینے کو مچلتا۔ میری سب طرح کی باتیں سن کر بھی بس یہی کہتا کہ.....

"وہ تو سب ٹھیک ہے' محبت تو میں تجھ سے ہی کرتا ہوں مگر اب تو محبت میں اتنا بھی نہیں کر سکتی کہ کم سے کم ایک دفعہ ہی میری بات مان لے؟"

"یہ سب شادی کے بعد اچھا لگتا ہے' شادی سے پہلے بڑی غلط بات ہے۔" میں بڑی نرمی سے اس کے چہرے کو چھو کر کہتی۔ "مگر آج سوچتی ہوں' ٹھیک ہی لگتا ہے کہ یہ آگ لگائے سے لگ نہیں جاتی اور لگ جائے تو اس کا بجھانا مشکل ہے۔ اس پر میری باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

"شادی تو میں تجھ سے کر ہی لوں گا مگر اس میں ابھی دیر ہے۔ مجھ سے بڑا ایک بھائی اور ایک بہن بیٹھے ہیں' پہلے ان کی ہو گی پھر کہیں جا کے میری باری آئے گی۔ دیکھ تو اتنے عرصے تک مجھ سے انتظار نہیں ہو گا۔ میں تجھے چھوتا ہوں تو تیرے جانے کے بعد بھی جسم انگارے کی طرح دہکتا رہتا ہے جیسے سمندر میں نہانے کے بھی سوکھا کے سوکھا..... دیکھ' مان جا' نہیں تو جلد اس کی سب خواہشیں پوری کر دوں گی مگر یہ آدھی بچی عزت وعصمت بھی بڑے طوفانوں سے گزرتی گئی۔ بڑے عذاب تھے جن سے میں نے ثواب کمائے' بہت سے روپے مجھے فیصل سے مل جاتے تھے' بس یوں سمجھو کہ جتنی قیمت لے رہی تھی' اتنے ہی مزے بیچ رہی تھی۔"

سائرس کا دل چاہا کہ وہ ماہ لقا سے پوچھے کہ اس وقت بھی اس طرح طوائفوں کی طرح سوچتی تھی اور پھر اسے لگا کہ ماہ لقا نے اس کی یہ سوچ معا پڑھ لی ہے۔

"تم سوچتے ہو گے کہ ایک نوخیز دوشیزہ جس کا وجود خوابوں اور سپنوں سے لبالب بھرا ہونا چاہیے' وہ سپنوں جیسی لڑکی اتنی بازاری باتیں کیسے سوچ سکتی ہے تو تم غلط نہیں سوچتے۔ میں ایسی باتیں اس وقت نہیں سوچتی تھی۔ اس وقت تو میں ہر ہر طرح فیصل کو اس بات پر مائل کرتی تھی کہ وہ میرے جسم کو لوٹنے کے بجائے میرے من کے مندر میں دیوتا بن کے بیٹھ جائے۔ میں ساری عمر اس کی پوجا کرنا چاہتی تھی۔ کہتے ہیں' محبت خودرو پودے کی طرح آپ ہی آپ جنم لیتی ہے اور خودہی دل کی زمین میں چپ چاپ اگتی ہے۔ بندہ نہ چاہے' تب بھی پوری زبردستی اور ڈھٹائی سے تناور درخت بنتی چلی جاتی ہے جیسے وہ غالب نے کہا ہے نا کہ

عشق پر زور نہیں' ہے یہ وہ آتش غالب
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

پتا نہیں' ایسی محبتیں کن خوش نصیب لڑکیوں کا مقدر بنتی ہیں؟ میں تو اپنی ضرورت کی تھیلی میں زور زبردستی سے محبت کو بند کرنے کی اوہیڑ بن میں تھی اور دل سے چاہتی تھی کہ فیصل مجھے لٹ ڈال مجھ کے نہ لوٹے' بلکہ عزت سے اپنے دل اور گھر میں جگہ دے' اس سوچ کو دن رات اپنا لہو پلاتی اور فیصل کی

www.pdfbooksfree.pk

کسی دن زبردستی وہ سب کردوں گا جس کے لیے اتنے پیار سے تجھے سمجھا رہا ہوں۔" میں غصہ ہو جاتی' اسے مارکو ٹنے لگتی اور وہ..... "ہاہ لتار کی۔

سائرس نے گہری خاموش نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور اس اطمینان کے بعد پھر پہلو تن گوش ہو گیا کہ وہ اب بھی اسی منظر میں بسی ہوئی تھی۔ "وہ اور سرکش ہو جاتا تو بڑی گہری اور ڈرا دینے والی سرگوشی میں کہتی۔

"جو کچھ ہو گیا تو؟"

"کچھ نہیں ہوگا' میرا وعدہ ہے۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ جواب دیتا۔

"تو کیا مجھے یقین دلاتا ہے' میں خوب جانتی ہوں تجھے اور تیرے وعدوں کو۔"

"تو تو نہیں مانے گی؟"

"نہیں....."

"بس یہی ہے تیری محبت..... اتنی سی قربانی تو دے نہیں سکتی تو کیا محبت کرے گی حرافہ.....؟" وہ اپنی اوقات پر آ جاتا۔

"اور تو تیری محبت کیا ہے' بس مجھے برباد کر دینے سے کام ہے تجھے۔ جو ذرا سی بھی غلطی ہو گئی تو میں کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں رہوں گی۔"

"تو پھر ٹھیک' میں وہ کروں گا جو مجھے ٹھیک لگتا ہے۔"

"زبردستی کرے گا تو میں چیخوں گی' چلاؤں گی....."

"اول تو میں تجھے چیخنے چلانے دوں گا نہیں' جو تو پھر بھی نہ مانی تو سمجھ لے اس میں نقصان تو سراسر تیرا ہی ہے۔ محلے والے تجھے ہی برا بھلا کہیں گے۔" وہ خباثت سے بولا۔

"اور تو صاف بچ جائے گا؟"

"اور نہیں تو کیا' کہہ دوں گا' بچے کو اکیلا دیکھ کر خود ہی سر ہو رہی تھی۔"

"ایسے بولے گا بے شرم؟ اور تو بچہ ہے؟" ہنسنا چاہتی تھی پر ہنس نہ سکی۔

"اس سے بھی زیادہ کہ تو کب سے مجھ سے پیسے اینٹھ رہی ہے اور آج پیسے نہیں دیے تو لگی مکر کرنے؟" میں عجیب بے بسی سے اسے دیکھتی رہتی اور مجھے لگتا کہ اس شیطان سے اس سے بھی زیادہ کی توقع کرنی چاہیے۔"

"اب ہم دونوں میں یہ کشمکش کئی دنوں تک چلی۔ اس محلے میں ایسی عورت دو چار ہی تھیں جن کے خاوند گھروں سے باہر کمانے گئے تھے اور انہیں گہنے لتے بنانے اور خریداری کرنے کے علاوہ کوئی دوجا کام ہی نہیں تھا۔ بلقیس باجی کے علاوہ باقی کی عورتیں مین شہر میں درزیوں سے سلواتی تھیں یا ان کی کپڑے سینے والیاں موجود تھیں جو پیسہ دیکھ بھال اور سوچ سمجھ کے خرچ کرتی تھیں' وہ سال میں تین چار بار ہی کپڑے بناتی تھیں۔ دونوں عیدوں پر یا پھر کسی کے شادی بیاہ پر۔ اب یوں چار پانچ موٹوں سے تو ہمارا گھر چل نہیں سکتا تھا۔ اس طرح بلقیس باجی خورمیری سب سے بڑی ضرورت بن چکی تھی۔ اسے چھوڑنا میرے لیے بھی جیسے ممکن ہی نہ رہا تھا۔ کبھی کبھی جب رات کو مجھے ایسی گھبرا دینے والی سوچوں کی وجہ سے نیند نہیں آتی تھی تو میں بڑے دل سے دعا مانگتی تھی کہ اللہ کرے' فیصل کا ایکسیڈنٹ ہو جائے اور وہ مر جائے..... یا اسے بھی میرے ابے کی طرح پولیس والے اٹھا لے جائیں اور مار مار کے جان سے مار دیں کیونکہ میرے اور گھر کے بیچ جو پیٹ لگا تھا' اس کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ منحوس فیصل ہی تھا حالانکہ جتنی بار وہ مجھے چھو چکا تھا' ان لمحوں اور ان منظروں کو یاد کرنے کے بعد میرے دل میں ہمیشہ بس یہی ایک خیال آتا تھا کہ اب میں

کسی اور کے لائق نہیں رہی۔ جب بھی ہو' میری شادی اسی حرام خور سے ہو مگر ہر طرح کے جتن کر کے بھی میں ناکام تھی اور مجھے کوئی راستہ سجھائی نہ دیتا تھا کہ آخر گھر کی غربت جو دوزخ بن کے ہر وقت دہکا کرتی تھی' اسے کیسے بجھاؤں؟ اسی طرح کی سوچوں میں جانے کب ٹوٹی ہوئی چارپائی پہ نیند آ جاتی اور پھر جب اس کا مطالبہ حد سے بڑھ گیا تو میں نے باجی بلقیس کے گھر جانا چھوڑ دیا۔ ہفتہ بھر تو اماں کو ٹالتی رہی کہ اب باجی بلقیس کے پاس کام نہیں ہے پھر ایک ہفتے بعد اماں بضد ہوئی کہ میں کم سے کم چکر لگا کے پوچھ ہی آؤں۔ اماں کے اصرار پر گھر سے نکلی' راستے بھر یہی سوچتی رہی کہ جاؤں گی نہیں اور اماں سے آ کے جھوٹ بول دوں گی کہ کام نہیں ملا مگر جب کچھ دیر یونہی خواری کر کے گھر میں گئی تو اماں کے سوال نے جھاڑ پٹ میرا جھوٹ کھول دیا۔

"ارے..... تو" تو خالی ہاتھ آ گئی؟ وہ لڑکا بلقیس کا بھائی تجھے پوچھتا ہوا آیا تھا کہ باجی بلا رہی ہے اور تو بہت دنوں سے ان کے گھر جھانکی بھی نہیں؟" تب میں چپ رہی۔ "اری' بولتی کیوں نہیں؟ تو نے کیا چوری کر لی جو یوں ڈری ہوئی ہرنی کی طرح چپ چاپ کھڑی ہوئی ہے؟" اماں کو غصہ آنے ہی والا تھا۔

"کیا بولوں اماں.....؟ کپڑوں کی مزدوری پر اس کا بھائی میری عزت کی قیمت مانگتا ہے۔ بتا پھر کیسے جاؤں؟ تجھے کیا بتاؤں؟" بڑی ہمت کر کے میں نے کہہ دیا۔ ماں کے جیسے کھڑے کھڑے جسم سے جان ہی نکل گئی' ایک دم سکتے میں آ گئی۔ مجھے بھی کچھ سمجھ نہیں آیا اور گھر میں سناٹا بہ رسنے لگا۔

رات کو ماں دونوں چھوٹے بھائیوں کو سمجھانے لگی کہ اب کچھ بھی کرو' کوئی بھی محنت مزدوری کر کے تم دونوں کو ہی گھر چلانا ہے۔ ظاہر ہے' وہ ابھی چھوٹے تھے' انور پندرہ سال کا تھا' اصغر تیرہ کا تھا' نوری سمجھو' دس کی رہی ہوگی اور سب سے آخری آفرین پانچ سال کی ہونے کو آئی تھی۔ ان علاقوں اور محلوں میں لڑکا ریڑھے پیدا ہوتے ہیں۔ اماں کے تو پھر بھی پانچ تھے اور پانچوں میں وقفہ بھی مناسب ہی تھا۔ کاش..... میں کسی طرح چار پانچ سال تک چلا لیتی تو انور ضرور گھر سنبھال لیتا مگر چلاتی کیسے' غریب اور مفلس لڑکی کی عزت چوراہے پر رکھا وہ گلاس ہے جو خالی ہو جائے' تب بھی آس پاس سے گزرنے والا ہر شخص ایک نظر اس پہ ڈالتا ضرور ہے۔

انور اور اصغر صبح سے شام تک جانے کہاں جاتے اور شام کو کچھ نہ کچھ پیسے لے کر لوٹ آتے جس سے کسی نہ کسی طرح کم سے کم شام کا کھانا مل جاتا تھا۔ بہت بعد میں مجھے پتا چلا' انور ایک ہوٹل پر بیرا گیری کا کام کرنے لگا تھا۔ آدھے پیسے ٹھیکے دار لے لیتا اور آدھے پیسے وہ گھر لے آتا۔ سگریٹ بھی چھپ چھپ کے پینے لگا تھا جبکہ اصغر کو صرف ایک دکان میں کام کرنے پر دوپہر کا کھانا ملتا تھا۔ بقول اصغر' ابھی وہ اس کا امتحان لے رہا ہے' ایمانداری ثابت ہو گئی تو کچھ نہ کچھ مزدوری بھی ضرور ملنے لگے گی۔

گھر میں مفلسی کم نہ ہوئی' اوپر سے دونوں بھائی جن لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے تھے' ان سے خراب عادتیں بھی سیکھ رہے تھے۔ اس دوران میں فیصل ایک مرتبہ پھر آیا تھا مگر اماں نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھنے کے بعد کافی برا بھلا کہہ کر بھگا دیا' یوں سمجھو اماں نے میرے طوائف بننے کی نیو کھود ڈالی۔ مجھے پوری کی پوری حاصل نہ کرنے کا دکھ ایک قسم کا انتقام بن کر فیصل کے رگ و پے میں تیرنے لگا' وہ نئے نئے منصوبے بنانے لگا کہ کیسے مجھے توڑ پھوڑ ڈالے؟ اس کی انا کو بڑی زبردست ٹھیس پہنچی تھی کہ

www.pdfbooksfree.pk

میں اتنے دن تک اس کے سامنے رہی اور وہ اپنی مردانگی مجھ پہ ثابت نہ کر سکا۔

ایک روز رات کے دس بجے ہوں گے کہ ایک بیس، اکیس برس کا نوجوان لڑکا ہمارے گھر آیا اور بولا کہ "انور کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے' اس پر چوری کا الزام ہے....." اماں کے اور میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ جولڑکا بتانے آیا تھا' وہ ہماری بگڑتی ہوئی حالت کا تماشہ دیکھنے کو بدستور کھڑا رہا۔ میں نے اماں سے کہا۔ "میں تھانے جاؤں؟ کہیں....." ہم دونوں ماں بیٹیوں کے ذہنوں میں اباوالی بات' وہ واقعہ تیر کمان ہو گیا۔ ہم خوف سے لرزنے لگے کہ کہیں پولیس والے انور کو بھی تشدد کر کے مار ہی نہ ڈالیں۔ اماں نے کہا۔ "تم گھر میں رہو' میں جاتی ہوں۔"

مگر اچانک وہ لڑکا بولا۔ "خالہ جی آپ فکر نہ کریں' ہم لوگ انور کے دوست ہیں' ہم اسے چھڑا لائیں گے۔ آپ مت چلیں۔ پولیس والے آپ سے پیسوں کا تقاضہ کریں گے۔" پھر اس نے پولیس کی رشوت خوری کے بارے میں بتایا اور یوں اماں اور میں جاتے جاتے رک گئے۔ اماں بڑی بے بسی سے اس لڑکے کی جس نے اپنا نام اکرم بتایا تھا' منتیں کرنے لگیں' اسے دعائیں دینے لگیں کہ وہ کسی بھی طرح انور کو چھڑا لائے۔ اسی کشمکش کے درمیان میں اصغر آ گیا۔ اس نے سنا تو وہ اس لڑکے کے ساتھ چلا گیا اور ہم دونوں ماں بیٹی یہ سوچتے رہے کہ پولیس کہیں اصغر کو بھی نہ پکڑ لے۔

دو گھنٹے گزر گئے جب اصغر بھی واپس نہ آیا تو اماں نے کہا۔ "میں جاتی ہوں زلیخاں' نہیں تو بڑا اندھیر ہو جائے گا۔" اماں دروازے سے نکل ہی رہی تھیں کہ اکرم بھی آ گیا اور بڑے غصے اور گھبراہٹ ہوئے انداز میں بولا کہ "پولیس والوں نے اصغر کو بھی یہ کہہ کر پکڑ لیا ہے کہ چور کا بھائی بھی چور ہی ہو گا۔" تب اماں غش کھا کے گری اور بے ہوش ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہوش میں آئی اور جیسے اب اس غریب عورت کے پاس بے بسی اور مجبوری سے مجھے بھیجنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ آخر کار اکرم کے ساتھ میں چلی گئی۔ وہ مجھے مختلف گلیوں اور محلوں سے گزارتا ہوا ایک ایسے علاقے میں لے آیا جہاں کچھ غیر آباد سے مکانات بھی تھے اور بہت تھوڑے سے گھروں میں شاید لوگ آباد تھے۔ رات کے گھپ اندھیرے میں پوری طرح تو کچھ پتا نہ چلتا تھا اور یوں بے کہ کہیں کہیں کچھ روشنی بعض گھروں میں نظر آتی تھی۔ اکرم ایک گھر کے سامنے رک کر بولا کہ یہاں اس کے چچا رہتے ہیں' انہیں بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔ وہ اندر گیا۔ میں اس ویرانے میں اکیلی کھڑی رہ گئی۔

گھروں کی ان قطاروں کے سامنے لق و دق خالی زمین پڑی تھی جسے نوجوان کھیلنے کودنے کو استعمال کرتے ہوں گے۔ بہت دور ایک کھمبے کی لائٹ میں کچھ دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ میں انجانے خوف اور وسوسوں سے اندر ہی اندر لرز رہی تھی۔ اس بے بسی کو لفظوں میں کون بیان کر سکتا ہے کہ میں کہیں نہ کہیں دور اپنے دل کے اندر اس خوف سے بھی لرز رہی تھی جو ایک لڑکی کو ہوش سنبھالتے ہی فطرت کی طرف سے عطا ہو جاتا ہے۔ سب کچھ تھا مگر میری بے چارگی ایسی تھی کہ میں اس کے سوا اور کچھ نہ سوچ سکتی تھی کہ میرے دونوں بھائیوں کو پولیس نے چوری کے الزام میں پکڑ لیا تھا اور صرف یہی نہیں کہ ان دونوں کو مار مار کے جان سے مار دیا جائے گا بلکہ یہ خوف بھی بہتیرا ہی بھیتر کہیں سر سرا رہا تھا کہ اصغر اور انور نہ آئے تو ہم دو عورتیں اور دو چھوٹی بچیوں کی زندگی کے ساتھ کیا ہونے والا ہے' اس سے زیادہ میں کچھ سوچ نہ سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اکرم آیا اور بولا۔

"چچا اندر بلا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں' میں تیار ہو کے چلوں گا۔ تھوڑا سا وقت لگے گا۔" ناچار میں گھر میں داخل ہو گئی۔ ایک تنگ سی راہداری کے داہنے ہاتھ پر ایک کمرہ بنا ہوا تھا' اس کا دروازہ کھلا۔ میں نے ابھی قدم ہی رکھا تھا اندر کہ میرا ہاتھ پکڑ کے اس زور سے مجھے گھسیٹا گیا بلکہ گھسیٹ کے بستر پہ پھینکا گیا کہ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میرے سامنے فیصل اپنی پوری شیطانیت کے ساتھ کھڑا تھا اور اس لڑکے اکرم کے علاوہ دو اور دوست بھی تھے یعنی میں چار درندہ صفت لٹیروں کے چنگل میں پھنس چکی تھی۔ فیصل کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی' اس کے موٹے موٹے ہونٹ اور بڑی بڑی آنکھوں میں ایک ایسی فاتحانہ چمک دمک تھی کہ وہ کچھ بھی حاصل کرنے سے پہلے سب کچھ جیت چکا تھا۔ چند لمحے تو مجھے ڈر اور خوف نے اپنی لپیٹ میں لیے رکھا اور اس کے بعد جیسے بڑی تیزی سے میرے اوسان بحال ہو گئے۔ میں ایک بات اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ اب کوئی بھی کوشش میری عزت و عصمت کی حفاظت نہیں کر سکتی تھی لہٰذا مجھے ہر طرح سے ہوش سے کام لینا ہو گا۔

"اچھا تو یہ سب ڈرامہ تیرا اکیلا ہوا ہے؟" میں نے کسی قدر اپنے اوسان اور حواس مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ کھیل کھیل کے کچھ نہ کچھ سمجھ تو مجھ میں آ ہی چکی تھی۔

"اچھا ہوتا اگر تو مجھ اکیلے کی بات مان جاتی۔ اب پورے چار چار....." وہ ہنسا۔

"اب کیسے فیصلہ کرے گی کہ اگر کچھ ہوا تو وہ کس کا ہو گا؟" اس نے دوسری بار گہری اور پھاڑ کھانی سرگوشی میں کہا۔ یہ سنتے ہی میں پورے وجود سے لرز گئی کہ کسی بھی طرح اس قسم کی پوزیشن میں کوئی بھی لڑکی اس طرح کے حالات میں پیدا ہونے والے بچے کا سوچ کر کتنی بھی دلیر کیوں نہ ہو' کمزور پڑ سکتی ہے اور سچ پوچھو تو میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب تھا بھی نہیں۔

"ہرامی بچہ..... ایک کا ہو یا چار چار کا' اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تو اُس وقت بھی حرام کاری کرنا چاہتا تھا اور اب بھی تیرا یہی ارادہ ہے اور اپنی گھٹیا چالوں سے تو نے مجھے بے بس کر دیا ہے' یہ مجھے اب مان لینے میں کوئی حرج نہیں' صرف اتنا بتا دے میرے دونوں بھائی کہاں ہیں؟"

"وہ برابر کے کمرے میں بند پڑے ہیں' تیرا کام ہو جائے پھر چھوڑ دیں گے انہیں بھی۔" فیصل مکاری اور بے حسی سے بولا۔ شیطان کیا ہوتا ہے' اس رات پہلی بار میں نے دیکھا۔

"انہیں چھوڑ دے' میری ماں بہت پریشان ہے۔" میں نے جیسے اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"چھوڑ دیں گے..... چھوڑ دیں گے..... گھنٹے بھر کی تو بات ہے....." وہ بولا۔

"میں پولیس کو سب کچھ بتا دوں گی۔" یہ میرا آخری حملہ تھا یا بچنے کا آخری راستہ۔ وہ چاروں ایک ساتھ ہنستے ہوئے ہاتھوں پہ ہاتھ مارنے لگے۔

"ہم تو چار ہیں اور وہاں پورا تھانہ تیرا وہ حشر کرے گا جو تو نے سوچا بھی نہ ہو گا۔" فیصل ہی اب تک میری باتوں کا جواب دے رہا تھا۔

"تم میں سے پہلے کون کرے گا؟" یہ کہتے ہوئے میں جو اب تک سکڑ سمٹ کے بیٹھی ہوئی تھی' بستر پر نیم دراز ہو گئی تو چاروں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"میں ہی کروں گا پہلے' یہ منصوبہ بھی میرا ہے اور تو مال بھی میرا ہی ہے۔" فیصل کچھ تکبر سے بولا۔

"تو' تو اکرم ہے اور تم دونوں کے نام کیا

www.pdfbooksfree.pk

ہیں؟" میں نے ان اجنبی لڑکوں کی طرف دیکھا۔

"نام پوچھ کے کیا کرے گی' کام سے مطلب رکھ بس' پولیس والوں کو بتانا چاہتی ہے سالی....؟" فیصل نے ہوشیاری دکھائی۔

"دو کے نام تو معلوم ہیں جو پولیس والوں کو بتانا ہوا تو تم دونوں کے نام بھی کافی ہیں۔ میں تو اس لیے پوچھتی ہوں کہ....." میں جان بوجھ کے رکی۔

"بول' بول' کیا کہنا چاہتی ہے اور اب زیادہ دیر مت لگا۔" فیصل کو لگا کہ میں ہوشیاری کر رہی ہوں۔

"اس لیے پوچھتی ہوں کہ میں بعد میں بھی تم میں سے کسی ایک سے رابطہ رکھنا چاہوں گی۔"

"بڑی بے شرم ہے بھئی..... میں تو سمجھا تھا تو' تو روئے گی' گڑگڑائے گی اور ہمیں زبردستی تیرے....."

"زبردستی میں وہ مزا کہاں جو رضامندی میں ہے....." میں پوری بے شرمی سے بولی مگر کچھ ایسا تھا کہ مجھے اپنی آواز بھی اجنبی لگی۔

"میں نواز ہوں۔" ان میں سے ایک بولا جو کم صورت اور لمبی سی شکل والا تھا۔

"اور تو.....؟" جو ایک بچا تھا' میں نے اس کی طرف دیکھا' سب سے خوبصورت وہی تھا' خاموش طبع اور شکل سے کچھ معصوم بھی لگتا تھا۔ "میں فراز ہوں۔" اس وہ اتنا ہی بولا۔

"فراز' اگر تو پہل کرے تو مجھے بڑا اچھا لگے گا' باقی بعد میں آ جائیں۔" یہ ایک دھکا کہ تھا جو ان چاروں کے بیچ ہوا۔ سب سے زیادہ فیصل کو اس بات سے تکلیف ہوئی۔

"نہیں..... نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا۔ تجھ پر سب سے پہلا حق میرا ہے۔" فیصل نے میری طرف دیکھ کر اور باقی جملہ ان تینوں کی طرف دیکھ کر ادا کیا۔ "کیوں دوستو..... صحیح ہے نا؟"

"یار' وہ فراز کے ساتھ پہلے جانا چاہتی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے' ہم بعد میں..... ویسے بھی دوسرا نمبر تیرا ہی ہوگا۔ گھبراتا کیوں ہے؟ کیوں فراز؟" اکرم نے کہا۔

اس سے پہلے کہ فیصل کچھ بولتا' فراز بولا۔

"اکرم ٹھیک کہتا ہے۔"

"مگر یہ اصول کی خلاف ورزی ہے' جس کا مال ہو' پہلا حق بھی اسی کا ہوتا ہے۔" فیصل تلملایا۔

"میں تیرے باپ کا مال ہوں جو تیرا پہلا حق ہوگا؟" میں نے جلتی پر تیل ڈالا۔ "سب برابر ہیں۔"

"فراز..... جو تو نے پہل نہ کی تو میں تجھے نامرد سمجھوں گی....."

اب چاروں میں تو تکار ہونے لگی' اکرم اور فراز ایک طرف ہو گئے اور نواز اور فیصل ایک طرف' کافی دیر تک چاروں اپنے اپنے طریقے سے بکواس کرتے رہے اور میں اپنی عزت کی حفاظت کی دُعائیں مانگتی رہی۔

"اس..... کتیا نے بڑی ہوشیاری سے ہم چاروں میں جھگڑا کرا دیا ہے اور اب یہ ہم چاروں کا تماشہ دیکھ رہی ہے۔" فیصل نے کہا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ فیصل ایسی صورت حال میں اس سارے قصے کو ہی ختم کر دے گا۔ چاروں کمرے سے باہر چلے گئے مگر میں جانتی تھی مجھے بھاگ نکلنے کا موقع پھر بھی نہیں ملے گا اس لیے ان لوگوں کے کسی فیصلے تک پہنچنے تک میں دبکی بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد صرف فراز اکیلا میرے والے کمرے میں داخل ہوا مگر بولا کچھ نہیں' صرف میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔ میں اپنے بھائیوں کو بخیریت واپس لے جانا چاہتی تھی اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب میں کچھ بھی کروں مگر کوئی ایسی حرکت نہ کروں جس سے چاروں میں پھر ایکا ہو جائے۔

"تو نے ہمیں لڑانے کے لیے یہ حرکت کی ہے؟" کچھ دیر بعد وہ دھیرے سے بولا۔

"نہیں..... مجھے تو' تو اچھا لگا ہے۔"

"مگر فیصل نہیں مانتا۔" وہ بولا۔

اور پھر لمحے کے ہزارویں حصے میں شاید میں نے وہ فیصلہ کیا جو فراز سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں ایک عورت ہوں اور عورت ایسی مخلوق ہے جو آخری سانس تک اپنی خواہشوں کی جنگ لڑتی ہے۔ میں فیصل کی اس کمینی اور شیطانی حرکت کی اسے سزا دینا چاہتی تھی اور اس وقت میری سب سے بڑی اور آخری خواہش یہ ہی تھی کہ فیصل جیت کے بھی ہار جائے۔ اس سارے منصوبے کو میں مٹی ہو کر بھی خاک میں ملا دوں۔ میرا سب کچھ لٹنے سے بچ نہیں سکتا تھا' میں ہر طرح سے ہار ہی تھی مگر اپنی اس ہار سے بھی میں فیصل کو جیتنے نہ دینا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ ساری زندگی وہ اس شکنجی اور شکست میں سلگتا رہے کہ میری عصمت کو سب سے پہلے اس کی مردانگی نہیں روند سکی۔ فراز سے مجھے نہ محبت ہوئی نہ ہی وہ اس قابل تھا کہ میں یوں پہلی ہی نظر میں اس پر اپنی عزت لٹا دیتی..... بس وہ ان چاروں میں بہتر تھا اور میں اس وقت ڈوبتے ہوئے بھی اپنی مرضی سے اپنے ڈبونے والے کا چناؤ کر رہی تھی' یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی خودکشی کرنا چاہتا تھا مگر مرنے کے لیے کسی بھی ہتھیار کا انتخاب اس کی اس وقت تک کی اپنی مرضی تھی جب تک کہ وہ زندہ ہو..... میں فراز پر اس کی سوچ سے بھی پہلے جھپٹی تھی..... اتنا کہہ کر ماہ لقا بری طرح ہانپنے لگی اور سارس کو لگا کہ وہ کم سے کم اس لمحے میں طوائف نہیں ہے۔

"پھر کیا ہوا؟" جیسے فصرت سانسیں روکے یہ سب سن رہا تھا اور اب اس کی سانسیں وقفتاً بحال ہو گئیں۔

"فراز جیسے بے خود ہو گیا اور مجھے تو بے خودی اور وارفتگی کی ایکٹنگ بھی کرنا تھی کہ اچانک فیصل اور اکرم دندناتے ہوئے آئے اور انہوں نے جو یہ منظر دیکھا تو سمجھو' فیصل کا خون ہی کھول اٹھا' اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ایک زور کا طمانچہ فراز کے منہ پر جڑ دیا۔ فراز کب یہ برداشت کرنے والا تھا' وہ بھی برابری پر اتر آیا۔ ویسے بھی فراز زیادہ جسیم اور طاقتور دکھتا تھا' اوپر سے اکرم بھی بیچ بچاؤ کرانے میں اس ہوشیاری سے کام لے رہا تھا کہ وہ فیصل کو پکڑ رہا تھا اور فراز کو کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ کچھ گھنٹوں میں نواز آ گیا جو فیصل سے زیادہ قریب تھا مگر اس اثنا میں فیصل کی اچھی خاصی دھنائی ہو چکی تھی اور اب وہ ہانپتا کانپتا غصے سے بھنبھنا رہا تھا۔ کم سے کم میں نے اس سے کچھ بدلا تو چکا ہی دیا تھا اور اس وقت تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب لڑائی کا انجام یہ ہوا کہ فراز نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب فیصل' زلیخا (ماہ لقا) کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ جس جگہ میں شیطانی چنگل میں پھنسی ہوئی تھی' یہ جگہ بھی چونکہ فراز اور اکرم کی کوششوں سے حاصل کی گئی تھی لہٰذا فیصل کو وہاں سے زخم چاٹتے کتے کی طرح خوار اور نامراد واپس لوٹنا پڑا۔ قدرت کے بھید نرالے..... ہونا کیا تھا' ہو کیا۔

تھوڑی دیر بعد فراز نے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے انور اور اصغر کو رہا کر دیا۔ میرے دونوں بھائیوں کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میں وہاں موجود ہوں۔ اس شرط پر فراز نے انہیں رہا کیا تھا۔ اب صرف اکرم اور فراز تھے اور کالی سیاہ رات دانت نکوسے افلاس کی ماری ایک لڑکی کو ڈس لینے پر آمادہ تھی۔"

ماہ لقا ایک مرتبہ پھر ہانپ گئی اور اس نے

www.pdfbooksfree.pk

غٹاغٹ پوری بوتل پانی کی خالی کر دی۔ میں اور نصرت اس کے پھر سے کہانی شروع کرنے کی امید لگائے ہمہ تن گوش تھے کہ وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک دم چونکی۔

"اوہ..... میرے ربا.....! کتنا کوں وقت ہو گیا؟ دھندے کا ٹائم سر پر آن کھڑا ہوا اور تم لوگوں کی باتوں میں مجھے پتا ہی نہ چلا۔ چلو بھاگو یہاں سے....."

"مگر ماہ لقا..... ابھی تو یہ پتا ہی نہ چلا کہ تم طوائف کیسے بنیں؟ کہانی ادھوری ہی نہیں بلکہ پوری طرح تشنہ ہے۔ اس طرح ذرا بھی بات نہ بنے گی۔" سائرس نے تحت لایوسی سے کہا۔

"پر رائٹر بابو میں تمہارے لیے اپنا دھندہ تو خراب نہیں کر سکتی نا؟"

"آج چھٹی کر لو؟" نصرت بے تکلفی سے بولا۔

"واہ..... کس آسانی سے کہہ دیا' چھٹی کر لو؟ پورے دو ہزار کا نقصان ہو گا۔ پہلے سے بکنگ ہے گاہکی ٹوٹے گی وہ نقصان الگ ہو گا۔ نہ بابا' نہ یہ ممکن نہیں ہے۔" وہ ایک دم سے ہی صرف چیخ ہی نہیں ہوئی بلکہ فی الفور طوائف اور دھندہ کرنے والی خود غرض عورت بن گئی حالانکہ وہ جانتی تھی' ہم اسے دو ہزار تو کیا' ایک ہزار بھی نہیں دے سکتے تھے۔

"اچھا تو پھر کل آنا' ویسے بھی مزید کہنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔" وہ کسمسائی' ایک کاہلی سے بھری منہ کھول کے اس نے انگڑائی لی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ٹھیک ہے' ہم کل آئیں گے۔" سائرس نے مجسوس کیا کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں' ساتھ ہی سائرس نے یہ بھی محسوس کیا کہ طوائفوں کے پاس گھریلو عورتوں کو چھوڑ کے آنے والے لوگ ان کی ایسی ہی اداؤں پر جان دیتے ہیں۔ تجسس نے ہی انسان کو جیتے چلے جانے پر مجبور کیا ہے ورنہ ہزاروں سال سے زندگی ایک جیسے منظروں کی ایسی داستان بن کے رہ گئی ہے جس سے اب شدید بوریت ہونے لگی ہے۔

اب وہ دونوں ماہ لقا کے پاس سے نکل کر پھر کسی منظر کا حصہ بننا چاہتے تھے۔ ایک کمرے میں ایک موٹی تازی پھٹکار برستی شکل والی عورت بیٹھی تھی۔ نصرت جھک کے سلام کرتا ہوا جھپاک سے اس کمرے میں جا گھسا۔ عورت جو محو استراحت کے سے انداز سے بیٹھی ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوئی جیسے وہ نصرت کی اوقات پہلے سے جانتی تھی مگر جیسے ہی اس نے سائرس کو دیکھا تو کچھ ہل جل ہوئی اس کے بے ہنگم وجود میں۔

"ارے آؤ' آؤ' نصرت میاں.....!" رکی پھر سائرس کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ خوب دھندہ شروع کیا۔ چلو اچھا ہے' نکھٹو بندہ کسی کام کا نہیں ہوتا' کچھ ٹھکانے لگے تمہارے بھی..... اری او..... بلقیس..... لے تیری پارٹی تو آ گئی۔"

سائرس اور نصرت دونوں بری طرح چونکے' پہلے دھندے والی بات پر پھر بلقیس پر۔ نصرت غریب کو اس بے پناہ بھاری وزن والی عورت نے سنبھلنے کا موقع دیا نہ ہی اپنی صفائی میں کچھ بھی کہنے کی مہلت دی۔ سائرس کو لگا کہ چھس تو وہ بھی گیا ہے کیونکہ جس غلط فہمی بلکہ خوش فہمی میں یہ پہاڑی خاتون مبتلا ہو گئی تھیں کہ وہ کوئی پارٹی ہے' ایسی کوئی بات نہیں تھی' جس بوسیدہ دری اور پرانی دھرانی چاندنی پر بیٹھے سے ٹیک لگائے یہ پرانے وقتوں کی ماہ لقا لیٹی بیٹھی پڑی تھی' اس کے پیچھے ریلنگ سے ایک دبیز اور گہرے نیلے رنگوں والا چھپا ہوا پردہ پڑا تھا اور اس کے پیچھے سے بلقیس نکل کر آنے والی تھی۔

یہ کمرہ زیادہ کشادہ نہ تھا مگر بعض عمارتوں میں کشادہ کمرے بھی دیکھنے میں آتے ہیں' تاہم ترتیب و تزئین سب ہی کی ایک جیسی ہے۔ فرش پر حسب استطاعت قالین اور دریاں خاصے پرانے ہو چکے ہیں۔ اگر بہت قریب سے محسوس کیا جائے تو ان میں سے بدبوئیں اٹھ اٹھ کر سانسوں میں اترتی ہوئی بھی محسوس ہوتی ہیں۔ دیوار کے برابر برابر گاؤ تکیے لگے ہوتے ہیں۔ ان تکیوں کی حالت بھی کہیں میلی کچیلی اور بدرنگی ہے اور کہیں نئے نئے غلاف چڑھا کر انہیں قابل برداشت بنا دیا گیا ہے۔ چھت سے سالخوردہ پنکھے لٹکے ہوئے ہیں اور تعفن کمروں میں ملحقہ باتھ روم بھی ہیں۔ قالینوں اور دریوں پر پان دان' اگال دان اور ایش ٹرے بھی دھرے ہیں' تقریباً تمام ہی طوائفیں پان اور سگریٹ کا شوق کرتی ہیں' بعض شراب بھی پیتی ہیں جو نہیں پیتیں' وہ اس کا خرچ برداشت نہیں کر سکتیں' بالکل ایسے ہی جیسے کوئی شریف آدمی اس لیے شریف نہیں کہ وہ خدا خوفی اور عاقبت کی فکر میں مبتلا ہے بلکہ اس کی شرافت کی واحد وجہ یہ ہے کہ اسے گناہ کرنے کے مواقع اور وسائل مہیا نہیں ہیں' ایسے میں شرافت خود بخود ایسے آدمی کی چادر بن جاتی ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ طوائفوں میں زیادہ تر ایسی ہیں جنہیں اپنے نشے پر قابو آ چکا ہے لہٰذا وہ پینے کے بعد بھی پوری ہوش مندی سے گفت و شنید کرنے پر قادر ہیں۔ یہاں موجود طوائفوں کے ملبوسات فلموں والی طوائفوں کے برابر جچتے نہیں ہوتے' ہو بھی نہیں سکتے' اب ذرا سوچیے' مادھوری نے 'دیوداس' میں جو طوائف والے کردار میں ملبوسات پہنے' وہ یہاں کی طوائف خواب میں بھی نہیں پہن سکتی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جتنے پیسے مادھوری نے ان ملبوسات کو پہننے کے لیے' اتنے تو....."

بعض ناچنے والیاں اس روٹین ورک سے کسی قدر اکتائی ہوئی بھی لگتی ہیں کہ وہ بناؤ سنگھار کو زیادہ

غزل

یہ آرزو تھی' بناتا میں گھر محبت میں
ملا جو ہوتا کوئی ہم سفر محبت میں

غریب شہر کے' پاس اب کچھ نہیں باقی
نثار کر دیئے دل و جان محبت میں

ہمیشہ دور رہے جو دو محبت سے
دکھائی دیتے ہیں وہ معتبر محبت میں

وہ مجھ سے دور ہے' یہ ہے صلہ محبت کا
اُسے میں نے چاہا کیا محبت میں

وہ جو کہ گردشِ دوراں میں ہو گھرا زاہد
اُسے نصیب سے ملتا ہے گھر محبت میں

زاہد علی جے پوری

www.pdfbooksfree.pk

وقت نہیں دیتیں۔ جس وقت آپ پہلی منزل پر پہنچتے ہیں تو وہاں ہال اسی طرح شیشے کے شوکیسوں میں نوٹوں کی گڈیاں سجی ہوئی اور بکتی ہوئی ملیں گی جیسے بولٹن مارکیٹ کراچی میں پرائز بانڈ بکا کرتے تھے شاید اب بھی بکتے ہوں۔ نوٹوں کا بکنا کتنا عجیب ہے' یہ تصور کہ ہر چیز نوٹوں سے خریدی جاسکتی ہے مگر یہاں تو نوٹ بھی بکتے ہیں۔ اس بازار کی ہر چیز ہی نکاؤ ہے' نوٹوں کے بکنے سے یہ مطلب ہے کہ جو تماش بین ہزار اور پانچ سو کے نوٹ لاتے ہیں' وہ ظاہر ہے' ہزار اور پانچ سو کے نوٹ ان عام سی طوائفوں پر' سارا تو نہیں سکتے اور مجرے کی توریت یہی ہے کہ جب تک نوٹ نہ لٹائے جائیں' مجرا' مجرا نہیں لگتا لہٰذا تماش بین ہزار اور پانچ سو والے نوٹوں سے 10 اور 20 والے نوٹوں کی گڈیاں بلیک میں خریدتے ہیں اور اس وقت تک لٹاتے رہتے ہیں جب تک مجرا باقاعدہ ختم نہیں ہو جاتا یا پھر تماش بین کے نوٹ اختتام پذیر نہیں ہو سکتے..... اگر تماش بین نوٹ لٹانے میں کنجوسی سے کام لیتے ہیں تو پوری ڈھٹائی سے ناچنے والی انہیں طعنہ دیتی ہے جس سے ان کی مردانگی اور فیاضی دونوں کو ٹھیس پہنچتی ہے اور وہ زیادہ تیزی سے برباد ہونے لگتے ہیں..... عموماً تماش بین ایک ہزار یا پانچ سو روپے سے زیادہ لٹانے کی سکت نہیں رکھتے.....

اس لمحے پردہ سرکا اور ہرے کپڑوں میں ملبوس ایک پختہ چہرے والی عورت نمودار ہوئی' اس نے جالی والا دوپٹہ سر پر کس رکھا تھا' خوب کشادہ تھا' ناک تھوڑی سی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تسلیمات کرتی ان کے سامنے آ بیٹھی۔

"وقت ہوگا آپ کے پاس.....؟" سائرس نے پوچھا۔

"بڑا عجیب سوال ہے' وقت تو کیا' ہم تو سب ہی کچھ بیچنے کو بیٹھے ہیں۔ یہ دکان کھولی ہی اس لیے گئی ہے۔" اس کے لہجے میں کوئی جذبات نہ تھے' وہ جیسے ٹیکنکل طوائف بن چکی تھی یا اصل رنڈی تھی غریب.....

"نصرت..... تم نے سمجھا نہیں یا پہلی بار آیا ہے تمہارا گاہک؟ مگر یہ کون سے سوال ہیں پوچھنے والے؟" موٹی نے قدرے برداشت کا مظاہرہ کیا۔

"ارے بیگم دلشاد' یہ اس طرح کا گاہک نہیں ہے' یہ تو رائٹر ہے۔ طوائفوں کی زندگی پر کتاب لکھ رہا ہے۔ جاننا چاہتا ہے کہ کوئی بھی عورت طوائف کیسے بنتی ہے؟"

"چل نگوڑے..... خدائی خوار..... نکٹھو ہے پینڈی کے..... کم بخت..... میں سمجھی آج تو بھی کوئی گاہک پکڑ لایا۔ پر تو' تو سدا کا مفت خورا ہے۔ سات گھڑی کی آئے تجھ پر..... کم بخت نے منہ کا ذائقہ ہی کسیلا کر دیا۔ چل بلقیس..... کمرے میں جا..... خوامخواہ تجھے بھی تکلیف دی۔ آدمی پہچاننے کی صلاحیت بھی دم پخت ہو جاتی ہے جو لائٹ کا پردہ آنکھوں پر آن گرے۔" موٹی بے تکان اور نان اسٹاپ بولے چلی گئی۔ بلقیس اٹھ کے جانے لگی۔ سائرس اور نصرت بھی اٹھ لیے' کافی تو اشتہ ہو چکی تھی' یہ منظر کچھ یوں تھا کہ بلقیس پردہ سرکا کے غڑاپ ہونے والی تھیں اور سائرس جھک کر جوتے پہن رہا تھا۔ نصرت جل سا موٹی بے مروت کو دیکھنے میں بزی تھا۔ اسی حالت میں سائرس نے کہا۔

"آپ فیصل کو جانتی ہیں؟" بلقیس ایک غیر معمولی حیرت لیے واپسی کے لیے مڑی اور سائرس نے اسے تجسس سے دیکھا۔ وقت کی طنابیں دنادن ہلنے لگیں۔

(جاری ہے)

محمد فہیم

کاربرا بلیس آسیب زدہ ہوٹل

احمد فراز کا خیال
جن کو پیراہن تو قبر و شرف بخشتا ہے
وہ برہنہ ہیں انہیں خلعتِ رسوائی دے

نورانی لبادے میں ملبوس شیطان کے کارندوں کا شرمناک ماجرا

نیکی اور بدی' خیر اور شر' ان دونوں ہی کا وجود روزِ ازل سے ہے اور روزِ ابد تک جاری رہے گا۔ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نیکی پھیلانے کے کام کو جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ شیطان صفت انسانوں نے خواہشات کو بھڑکا کر شیطان ملعون کے کام کو آسان بنا رکھا ہے اور یہ کم بخت' بدبخت اس عمل کے دوران اللہ کے بابرکت نام کو بھی استعمال کرنے سے نہیں چوکتے اور اپنے لیے جہنم کے دہکتے الاؤ کو مزید بھڑکانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

ایسے ہی ایک بدقماش اور بدکردار انسان کی کہانی میں آپ کو سنا رہا ہوں جو کہ میرے ایک ایسے دوست



www.pdfbooksfree.pk

نے سنائی جواب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔

•.....•.....•

میں ڈیفنس سوسائٹی میں ایک بڑی بیکری چلا رہا تھا۔ میرے گاہکوں میں بڑے بڑے صنعت کاروں، کاروباری حضرات سے لے کر ان کے گھریلو ادنیٰ ملازمین تک سبھی شامل تھے۔ صبح 10 بجے کے بعد سے شام 5 بجے تک چونکہ گاہکوں کی آمد کم رہتی تھی، چنانچہ اس دوران میرے پاس فرصت کے لمحات بہت ہوتے تھے۔ اس وقت میں میرے پرانے دوست احباب اور واقف کار اکثر و بیشتر گپ شپ کے لیے آجاتے تھے۔ اس طرح فرصت کے یہ لمحات بہت اچھی طرح گزر جاتے تھے اور بہت سی رنگا رنگ اور دلچسپ کہانیاں بھی مجھے سننے کو مل جاتی تھیں۔ ان کہانیوں کے راوی زیادہ تر وہ گھریلو ملازمین ہوتے تھے جو اپنے مالکان کے لیے بیکری کا سامان لینے میری دکان پر آیا کرتے تھے اور مجھے فارغ دیکھ کر اپنے دکھڑے سنانے بیٹھ جاتے اور بعض اوقات دل چلے انداز میں اپنے صاحب و بیگم صاحبہ کے قصے اور ان کے علیحدہ علیحدہ خلوت کے لذت انگیز واقعات بھی نمک مرچ لگا کر بیان کرنے سے نہیں چوکتے تھے جن میں سے زیادہ تر ان کے احساسِ محرومی اور کچلے ہوئے جنسی جذبات کے محرک ہوتے تھے۔ میں اُن کی باتیں توجہ سے سنتا تھا اور کبھی ان لوگوں کو مایوس نہیں کیا تھا بلکہ ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی ہی کی تھی کہ اس میں میرا ہرافائدہ تھا، ایک تو یہ کہ ایسے ملازمین کہیں اور جانے کے بجائے خریداری کے لیے میری ہی دکان کا رخ کیا کرتے تھے، دوسرے فرصت کے اوقات بہت اچھی طرح گزر جاتے تھے۔ میری دکان پر اکثر آنے والوں میں سے ایک صاحب کیپٹن منصور اعجاز بھی تھے جو قریبی ایک ولا میں رہائش پذیر تھے۔ وہ مرچنٹ نیوی سے تعلق رکھتے تھے اور اُن دنوں ایک غیر ملکی بحری جہاز پر بحیثیت کیپٹن خدمات انجام دے رہے تھے۔ اُن سے میرا تعلق صرف دکاندار اور خریدار کا سا نہیں تھا بلکہ وہ میرے دوست کی حیثیت بھی اختیار کر گئے تھے۔

ویسے تو مرچنٹ نیوی کے ملازمین کے پاس وقت ہوتا ہی نہیں کیونکہ وہ طویل بحری سفر میں مصروف رہتے ہیں اور اس طرح وطن اور گھر سے دور ہی دور رہتے ہیں لیکن جب وہ صاحب اپنے ڈیپارٹمنٹل (ادارتی) امتحانات کے لیے sign off کرتے ہیں تو بہت طویل رخصت پر آتے ہیں۔

ٹھہریئے! پہلے تو آپ کو بتا دوں کہ مرچنٹ نیوی ہوتی کیا ہے اور کیا کبھی پاکستان میں بھی اس نام کا ادارہ ہوا کرتا تھا؟

مرچنٹ نیوی ایک ایسے ادارے کو کہتے ہیں جو نہ صرف ملکی تجارت بحری جہازوں کے ذریعے کرکے ملک کی خدمت کرتا ہے بلکہ تحمل و حمل کے ساتھ ساتھ اپنے خوبصورت جہازوں کے ذریعے مسافروں کو ایک ملک سے دوسرے ملک تک لانے لے جانے کی ذمہ داریاں بھی نبھاتا ہے۔ یہ بحری سفر لوگوں کے لیے سستے ہونے کے علاوہ بے پناہ تفریحی اور دلچسپ تجربات سے بھی بھرپور ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہماری مرچنٹ نیوی لوگوں کو ملک کے دو حصوں مشرقی اور مغربی پاکستان لانے لے جانے کی خدمت دن رات انجام دیتی تھی۔ اس کے علاوہ حج کے زمانے میں مرچنٹ نیوی کے بحری جہاز حاجِ کرام کو جہازگام اور کراچی کی بندرگاہوں سے حجاز مقدس تک پہنچانے میں بھی سرگرم رہتے تھے، یوں شپنگ کی دنیا میں ہمارے وطن کا بھی ایک بڑا نام تھا۔

اوہ..... میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ ہمارے یہ منصور اعجاز صاحب مرچنٹ

سوال

وہ شام سے بادل کی آنکھ میں پھیلتا کاجل
تم کیوں روتے ہو اے بادل.....؟
کیا!!
مجھے روتے دیکھ کر
یا!.....تم بھی ہو میرے
سنگی ساتھی ہو؟

اُجالا عادل

میں اُن دنوں چیف آفیسر تھے کہ بنگلہ دیش کے قیام کے دنوں میں ہندوستان کی طرف سے ہماری تمام کی بندرگاہ پر بم باری کے سبب اُن کا جہاز تباہ ہوگیا اور وہ کئی ماہ تک پانی والوں کے بھیجے چڑھ گئے اور ہندوستان کے قبضے کے بعد جنگی قیدی بن کر ہندوستان کی مختلف جیلوں میں رہنے کے بعد تین سال کا عرصہ گزار کر وطن واپس آئے تھے۔ حکومت کی جانب سے انہیں دو سال کی چھٹیاں دی گئیں تاکہ وہ ان تلخ یادوں کو بھلا سکیں۔

اُن دنوں وہ زیادہ تر وقت میرے ساتھ گزارتے اور جنگ اور قید کے دوران پیش آنے والے دلچسپ اور عبرت ناک واقعات سنایا کرتے۔ آہستہ آہستہ میرے اُن سے تعلقات دوستی میں بدل گئے جن میں بے تکلفی کا عنصر بھی در آیا۔

اُن ہی کے ایک قریبی دوست عادل پنجوانی تھے جو اُن کے ساتھ ہی چیف انجینئر کے فرائض انجام دیتے تھے۔ وہ منصور اعجاز کے ذریعے مجھ سے متعارف ہوئے تھے۔ اُن دنوں وہ بھی کراچی میں قیام پذیر تھے اور اکثر صبح کے اوقات میں میری بیکری میں آجاتے اور گھنٹے دو گھنٹے میرے ساتھ گزارتے تھے۔

مگر یہ صاحب مجھے ایک آنکھ نہ بھاتے تھے کیونکہ ان کی گفتگو صرف اور صرف ان رنگین اور سنگین واقعات کے گرد ہی گھومتی تھی جو انہیں پیرون ملک سفر کے دوران پیش آئے تھے اور مجھے ایسے واقعات سے قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن چونکہ وہ ہمارے ایک مخلص دوست کے دوست تھے پھر ایک دکاندار کی حیثیت سے بھی میں انہیں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ دکان پر نہ آیا کریں، سو قہر درویش، برجان درویش کے مصداق انہیں برداشت کرتا تھا لیکن ایک روز میری برداشت کی حد ہوگئی اور میں پھٹ ہی پڑا۔

دراصل اُن دنوں وہ روزانہ اپنی ایک نئی واردات سنانے لگے تھے جن کا لب لباب یہ ہوتا تھا کہ کراچی میں بے راہ روی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ وہ ہر روز جب گھر سے باہر نکلتے ہیں تو کوئی نہ کوئی طرح دار حسینہ ان سے آملتی ہے اور ان کی عیاشیوں کی داستانوں میں ایک نیا اضافہ ہو جاتا ہے اور یوں ان کا دن بے حد خوبصورت گزرتا ہے۔

میں آپ کو بتاتا چلوں کہ اکثر مرچنٹ نیوی کے افراد چھ ماہ سے ایک سال تک کا وقت سمندر میں اپنے گھر بار سے دور گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ چاروں اطراف سمندر اور کئی کئی دنوں تک انہیں زمین اور انسانوں کی (ماسوائے جہاز پر اپنے ساتھیوں کے) شکل تک دیکھنے کو بھی نہیں ملتی۔ چنانچہ ان کی نفسیات میں پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ جیسے ہی کسی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتے ہیں اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ یہ بات مجھے کیپٹن منصور اعجاز کئی بار بتا چکے تھے۔

بہرحال میں متواتر تین دنوں سے اُن کی یہ واردا تیں سن سن کر بے زار آ گیا تھا لیکن اس روز انہوں نے حد ہی کر دی جب انہوں نے کہا کہ کل وہ

www.pdfbooksfree.pk

جب گھر سے نکلے تو ایک بے حد خوش اندام لڑکی نے ہاتھ دکھا کر انہیں رکنے کے لیے کہا۔ جیسے ہی انہوں نے گاڑی روکی' لڑکی بے تکلفی سے دروازہ کھول کر ان کے برابر کی سیٹ پر آ بیٹھی اور بولی۔ ”چلو.....“

”کہاں.....؟“ انہوں نے پوچھا۔

”تمہارے پاس کوئی ٹھکانہ ہے چند خوبصورت گھنٹے گزارنے کے لیے تو وہاں دور نہ پھرتیں لیے چلتی ہوں۔“

انہوں نے ابھی بات یہیں تک سنائی تھی کہ ہم پھٹ پڑے۔

”پنچوانی صاحب..... حد ہوگئی ہے' اب بس کریں۔ شہر کراچی کو تو آپ نے کسی بائی کا کوٹھہ بنا کر پیش کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے جیسے آپ کوئی پری زاد ہیں کہ پورے شہر کی حسینائیں رات بھر آپ کے فراق میں آہیں بھرتی رہتی ہیں اور صبح ہوتے ہی اپنے آپ کو آپ کی راہوں میں بچھانے کے لیے نکل پڑتی ہیں؟ بھائی میرے..... ہم اسی شہر میں پیدا ہوئے اور یہیں پلے بڑھے' ہمیں تو کبھی ایسی لڑکیوں سے واسطہ نہیں پڑا؟“

”میاں..... ایسی لڑکیوں کو پانے کے لیے دیدہ بینا چاہیے' دیدہ بینا' کیا سمجھے؟“ انہوں نے میرے درشت لہجے کی قطعی پروا کیے بغیر میری بات درمیان میں ہی کاٹ دی اور ایک نادر روزگار نسخہ بتایا۔

”میاں..... اگر تم بھی چاہتے ہو کہ کسی حسن نایاب کی بہتی گنگا نہاؤ تو شہر کی کسی بھی معروف شاہراہ کے معروف بس اسٹاپ پر جاؤ' تم ہر بس اسٹاپ پر پان' سگریٹ کا ایک کھوکا موجود پاؤ گے' اس کھوکے سے چند گز کے فاصلے پر گاڑی کھڑی کردو اور اگلا دروازہ کھلا رکھو اور پھر دیکھو کہ پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ ایک مکارانہ سی مسکراہٹ لبوں پہ سجیرتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ میں سمجھا تھا کہ آج ان کے ساتھ میں نے بہت کردی' اب مشکل ہی ہے کہ وہ دوبارہ میری دکان کا رخ کریں لیکن یہ میری خام خیالی تھی' چوتھے ہی روز وہ اپنے مکروہ وجود کے ساتھ پھر آ موجود تھے۔

”ہاں میاں..... کیسا رہا؟ ہمارا ٹوٹکہ آزمایا؟ فیض یاب ہوئے؟“ پھر جواب کا انتظار کیے بغیر گویا فشانی فرمائی۔ ”میاں..... شریف آدمی ہو اور ہر شریف آدمی بزدل ہی ہوتا ہے۔ چلو تمہیں آج آسان سا نسخہ بتاتے ہیں' کیا یاد کرو گے۔“

وہ آسان سا نسخہ کراچی کی ایک پوش بستی کے ایک مکان کا پتہ تھا اور صاحب خانہ کا نام شاہ صاحب تھا۔

انہوں نے مکروہ انداز میں ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ ”اس پتے پر چلے جاؤ' ڈور بیل ایک بار بجا کر اور دروازے سے ہٹ کر کھڑے ہو جانا۔ جب شاہ صاحب طلب کریں تو اندر جا کر ہمارا نام لینا اور پھر دیکھنا کہ عیش و نشاط تمہارے اس شہر میں کتنی آسانی سے دستیاب ہے جسے تم شہر پار سا کہتے اور سمجھتے ہو۔“ پنچوانی صاحب شاید اس روز بہت جلدی میں تھے اس لیے یہ نسخہ کیمیا ہمیں عنایت کر کے الٹے قدموں رخصت ہو گئے۔

اتفاق سے اسی وقت میرے پاس میرے ایک دوست نما گاہک بھی تشریف فرما تھے۔ ”کیا بک رہا تھا یہ شخص؟“ انہوں نے پنچوانی صاحب کے جاتے ہی دریافت کیا۔ ہم نے الف سے یے تک تمام کہانی انہیں سنادی کہ کس طرح یہ روزانہ لاف گزاف کرتا ہے۔

”یہ نہیں' اپنے آپ کو کتنا حسین سمجھتا ہے جیسے کہ شہر بھر کی لڑکیاں اس پر ٹریفتہ ہوں؟“ ہم نے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

”یار' چلو' کسی روز وقت نکالو' چلتے ہیں اس کے شاہ صاحب کے پاس اور پہنچاتے ہیں جھوٹے کو اس کے گھر تک..... کیا خیال ہے؟“ ان صاحب نے

کہا۔ ہم بھی نہ جانے کس موڈ میں تھے کہ وعدہ کر بیٹھے کہ کل تین بجے آ جاؤ' چلیں گے۔

اگلے روز ٹھیک ساڑھے تین بجے ہم پنچوانی کے دیئے ہوئے پتہ کو ڈھونڈتے ہوئے وہاں جا پہنچے۔ وہ دو ہزار گز کے پلاٹ پر تعمیر کردہ ایک خوبصورت گھر تھا اور عمارت پر سبز رنگ کے بڑے بڑے علم لہرا رہے تھے جیسے کہ عموماً بزرگوں کی خانقاہوں پر ہوتے ہیں۔ ہم تذبذب کے عالم میں اس گھر کے گیٹ پر کھڑے ہو گئے۔

”یار' کہیں یہ ہم سے انتقام تو نہیں لے رہا؟ یہ تو کسی بزرگ کا آستانہ لگ رہا ہے۔ یہاں ایسی باتوں کا کیا کام؟“ ہم شش و پنج میں مبتلا ڈور بیل بجانے سے گریزاں تھے۔

”چل یار..... دیکھتے ہیں' کیا ہوتا ہے؟ بیل تو بجا کر دیکھتے ہیں۔“ ہمارے ساتھی شاہد نے آگے بڑھ کر بیل پر ہاتھ رکھ دیا اور عادل پنچوانی کی ہدایت کے مطابق ہم دونوں دروازے سے تھوڑا ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک دس گیارہ سال کی بچی باہر آئی۔

”جی فرمایئے؟“ وہ نہایت ادب سے ہم لوگوں سے مخاطب ہوئی۔

”بیٹا..... شاہ صاحب سے ملنا ہے' ہمیں عادل پنچوانی صاحب نے بھیجا ہے۔“

”جی اچھا۔“ کہتی ہوئی وہ بچی دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ پیغام لے کر آئی۔ ”شاہ صاحب کہہ رہے ہیں' انتظار کیجیے۔“

بیس منٹ بعد ایک بار پھر اسی بچی نے دروازہ کھولا۔ ”آیئے' شاہ صاحب یاد کر رہے ہیں۔“ اس سے پہلے ایک خاتون سر تا پا سیاہ چادر میں ملبوس باہر نکلی تھیں اور ان کی روانگی کے بعد ہی ہمیں اذنِ باریابی ملا تھا۔ اس بچی کی معیت میں ہم ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے اور ہمارے پیچھے وہ بچی بھی دروازہ بند کر کے غالباً عمارت کے اندرونی حصے میں کہیں غائب ہو گئی۔

”آیئے' آیئے۔“ ایک فربہ اندام پہلوانوں کی سی جسامت اور نورانی سی شکل وشباہت رکھنے والے صاحب نے ہمارا استقبال کیا۔ ”تشریف رکھیے۔“ ہم چاندنی بچھے فرش پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔

”ارے یار' کیا تکلفات میں پڑے ہو؟ میاں..... آپ تو ہمارے یار کے یار ہیں۔ پنچوانی نے بھیجا ہے۔ آپ کی خدمت تو ہمارا فرض ہے۔“ یہ کہہ کر شاہ صاحب نے ایک طویل انگڑائی لی اور ہمیں گاؤ تکیے پیش کیے۔ سر سے عمامہ اتار کر ایک طرف پھینکا اور ارشاد فرمایا۔ ”ہاں بھئی' کیا خدمت کی جائے یار کے یاروں کی؟ ارے ٹھہرو بھئی' پہلے کچھ چائے پانی ہو جائے پھر کریں گے کھل کے بات۔“ انہوں نے آواز لگائی۔ ”عذرا.....“ شاہ صاحب کی پشت پر بند کھڑکی کھلی اور بوتل کے جن کی طرح نمودار ہونے والی عذرا وہی بچی ثابت ہوئی جو اب تک شاہ صاحب کے احکامات ہم تک پہنچاتی رہی تھی۔

”جی ابو.....؟“ عذرا نے کہا۔

”ارے بھئی' کچھ کھانے پینے کو لاؤ' مہمان آئے ہیں' ہمارے یار کے یار۔“

”جی ابو.....!“ عذرا نے حکم سنتے ہی کھڑکی بند کر دی۔ اس اثنا میں ہمیں اپنے حواس درست کرنے کا موقع مل گیا تھا اور ہم نے تفصیل سے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ شاہ صاحب بھی اپنے اوپر لادا ہوا نورانیت کا لبادہ اتار کر پھینک چکے تھے۔ سنجیدگی اور معنوی سی گمبھیرتا کو وہ ایک طرف رکھ کر پاؤں پسار کر ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا چکے تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

کمرے میں عجیب دہشت انگیز اسرار بھرا سا ماحول تھا۔ چاروں جانب دیواروں پر سبز رنگ کی گوٹہ کناری لگی چادریں لٹک رہی تھیں جن پر کلمۂ طیبہ اور نجنتن پاک کے نام اور دیگر آیات قرآنی تحریر تھیں۔ ایک جانب کسی برتن میں عود و عنبر سلگ رہے تھے جن کی خوشبو نے کمرے کی فضا کو اور بھی بوجھل بنا رکھا تھا۔ شاہ صاحب کی نشست کے برابر تپائی پر انسانی کھوپڑی اور دو بڑی بڑی ہڈیاں جو یقیناً انسانی تھیں' رکھی ہوئی تھیں جو اس ماحول کو اور بھی ہیبت ناک بنا رہی تھیں۔

پشت پر موجود کھڑکی ایک بار پھر کھلی جس سے بوتل کی جن یعنی عذرا نمودار ہوئی۔ اس بار اس کے ہاتھوں نے ایک بڑی ٹرے سنبھالی ہوئی تھی۔ شاہ صاحب نے بڑھ کر ٹرے سنبھالی۔

"آؤ یار' کچھ پیٹ پوجا ہو جائے۔ بہت ہی تھکن ہو گئی ہے آج تو۔"

ٹرے میں گرم گرم سموسے' پیٹیز' پیسٹریاں' گلاب جامن اور نہ جانے کیا کیا لوازمات بھرے ہوئے تھے۔

"آؤ بھئی' کیا لڑکیوں کی طرح شرما رہے ہو..... اور بھئی' یہ تکلفات ختم کر دو۔ تم ہمارے یار کے یار ہو۔ تمہاری خدمت تو ہمارا فرض ہے اور اب تک بتایا نہیں تم لوگوں نے کہ کیا خدمت کی جائے؟"

ہم لوگ عجب شش و پنج کا شکار تھے کہ ہم تو کیا سمجھ کر آئے تھے لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا نکلا' خانقاہ' درگاہ اور بارعب شاہ صاحب..... یا الٰہی! کیا کریں؟

"لو بھئی' دستِ خود' دہانِ خود۔" شاہ صاحب نے ایک ایک پلیٹ ہماری جانب سرکا کر اپنی پلیٹ بھرنی شروع کر دی۔ ہم جواب تک دم بخود بیٹھے تھے' گم سم سے بمشکل لرزتے ہاتھوں چائے کا کپ اٹھا سکے۔

"ہاں یار' اب بتاؤ' بھئی' کیا خدمت کریں تمہاری؟ کیا منہ میں گنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہو؟ کیا کہے گا ہمارا یار کہ پہلی بار اپنے دوست شاہ صاحب کے پاس بھیجے اور خالی خولی ٹرخا دیا شاہ صاحب نے؟"

چائے کے بعد شاہ صاحب نے انتہائی بے تکلفی سے وہی موضوع چھیڑ دیا۔ ہم دونوں ہی انتہائی نروس ہو رہے تھے۔ ہم تو عادل بخوانی کو گھر تک پہنچانے کے خیال سے یہاں آئے تھے اور یہاں کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے تھے۔ انتہائی مقدس سی جگہ نظر آنے والی خانقاہ میں ہم کیسے کہیں کہ ہمیں بخوانی نے کس مقصد سے یہاں بھیجا ہے؟ پھر ایسے تقدس بھرے مقام پر اس قسم کی گفتگو؟ ہمارے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ بدحواسی ہمارے چہروں سے عیاں تھی اور گھبراہٹ میں دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ میرے ساتھ تو ایسی صورتِ حال پہلی مرتبہ پیش آ رہی تھی۔ شاہد کا مجھے علم نہیں کہ اس پر کیا بیت رہی تھی؟ ہو سکتا ہے' وہ اس میدان کا کھلاڑی رہا ہو لیکن میرے سامنے اس نے اس سے پہلے اس قسم کی گفتگو کبھی نہیں کی تھی جو مجھے علم ہوتا۔

"ارے یار' سمجھ گیا' نئے ہو اور شرما رہے ہو۔ چلو بتاؤ' کیسی لڑکی پسند کرو گے؟ میرے پاس 17 سال سے لے کر 35 سال تک کی ہر رنگ و شکل کی خوبصورت چیزیں موجود ہیں' بتاؤ' کس عمر کی اور کون سی زبان بولنے والی درکار ہے؟"

"وہ..... وہ..... شاہ جی..... ہم شریف....."

"تو یہاں کون بدمعاش بیٹھا ہے یار؟" شاہ صاحب نے جواپنی شرافت کا چولہ پہلے ہی اتار پھینکے تھے' ایک مکروہ سے قہقہے کے ساتھ شاہد کی بات کاٹ دی جو اس نے بہت تذبذب کے ساتھ شروع کی تھی۔

"یہ بتاؤ' کس عمر اور کس طرح کی لڑکی اپیل کرے گی اور کہاں لے جاؤ گے؟"

"وہ..... وہ....." شاہد نے پھر ہکلاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔

"اچھا' اٹھو آؤ میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر ہمارے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی کمرے کا بیرونی دروازہ کھولا۔ ہم کسی معمول کی طرح ان کے پیچھے اٹھ کر چلے۔ وہ لان کے کونے میں بنے زینے سے اوپر چڑھنے لگے۔ چند سیڑھیاں اوپر چڑھنے کے بعد انہوں نے ایک دروازہ کھولا۔ "آؤ....." اندر داخل ہوتے ہوئے انہوں نے ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔

یہ ایک دس بائی بارہ فٹ کا مختصر سا کمرہ تھا لیکن نہایت نفاست سے سجا ہوا تھا' کھڑکیوں پر خوبصورت دبیز پردے پڑے ہوئے تھے' ایک کونے میں خوبصورت ڈبل بیڈ موجود تھا جس پر خوبصورت رنگ کی پھولدار چادر بچھی ہوئی تھی' ساتھ ہی ایک چھوٹا سا روم فریج بھی موجود تھا۔ دیواریں خوبصورت پینٹ کی ہوئی تھیں اور ساتھ ہی اٹیچڈ باتھ روم بھی تھا۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت میز کے ساتھ دو آرام دہ نفیس کرسیاں بھی رکھی تھیں۔ غرضیکہ وہ چھوٹا سا کمرہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل کی سی تمام سہولیات سے مزین تھا۔

"ہاں بھئی' دیکھو ہم اپنے دوستوں کے آرام کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کے پاس اپنی کوئی جگہ نہیں تو چار گھنٹوں کے لیے یہ جگہ استعمال کر سکتے ہیں لیکن اس سے زیادہ وقت کے لیے دل بہلانا مقصود ہو تو پھر آپ کو لڑکی کو ساتھ لے جانا ہو گا۔" وہ اطمینان سے ہمیں ٹھکانہ دکھا رہے تھے اور ہمارا حال یہ کہ کاٹو تو لہو نہیں..... کہ اس تقدس کے زیرِ سایہ یہ خرافات؟ ہم تو بھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

"آیئے چلیں اور آپ کو یہاں کے قواعد و ضوابط بتا دیں۔"

ہم واپس اسی خانقاہ نما کمرے میں واپس پہنچے لیکن اب ہمیں یہ سب کچھ دیکھ اور سن کر انتہائی کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔

"دیکھیے' یہ آپ کا اپنا گھر ہے' جب دل چاہے شغل میلہ کا تو تشریف لے آیئے۔ جس قسم کی لڑکی درکار ہو' وہ بتا دیجیے۔ اگلے روز 5 بجے آیئے' بیل بجا کر اپنی گاڑی میں بیٹھ جایئے' گاڑی کا دروازہ کھلا رکھیے اور گلی پار کر کے مین روڈ پر پہنچ جانے سے پہلے لڑکی سے نہ کوئی سوال کیجیے اور نہ ہی اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کیجیے۔ ویسے اس کی آپ کو ضرورت بھی نہیں کہ آپ کی فرمائش کے مطابق ہی لڑکی آپ کے حوالے کی جاتی ہے اور ہاں' ایک درخواست یہ بھی کی جاتی ہے آپ کو جتنی دیر کے لیے لڑکی درکار ہو' وہ پہلے ہی بتا دیجیے اور کوشش کیجیے کہ پہلے سے طے شدہ وقت پر لڑکی کو فارغ کر دیجیے۔ اگر آپ کو اس کے ساتھ شہر سے باہر جانا ہو تو بھی آپ کو بکنگ کے وقت بتانا ہو گا۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو لڑکی آپ کا حکم ماننے سے بھی انکار کر سکتی ہے اور آپ کو اس انکار پر چراغ پا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کہ یہ شرفا کا ٹھکانہ ہے اور ہمارے پاس کوئی بازاری لڑکیاں نہیں آتیں۔ معزز اور شریف گھرانے کی تعلیم یافتہ لڑکیاں ہی ہوتی ہیں اور یہ سب کچھ اس لیے کہ لڑکیاں اپنے گھروں سے باقاعدہ اجازت لے کر آتی ہیں۔"

"شاہ جی..... ہم شریف لوگ ہیں' کوئی ایسی ویسی بات....."

"بھائی میرے..... ہم نے کہا نا کہ یہاں کوئی بدمعاش نہیں اور آپ لوگ دیکھ ہی رہے ہیں میرے آستانے کا مقام..... ہے کسی میں ہمت کہ کوئی انگلی بھی

www.pdfbooksfree.pk

اٹھا سکے یہاں آنے جانے والے پر؟ یہاں 25 سالوں سے یہ کام چلا رہا ہوں عزت ہے ایک مقام ہے آپ کے شاہ جی کا..... کوئی غلط بات کہنے والے کی پہلے تو مجھے دار ہی تکہ بوٹی کر ڈالیں گے پھر ہمارے کرم فرما بھی کوئی گنگو تیلی نہیں ہیں علاقے کا تھانے دار ایس پی اور اس کے اوپر کے بڑے بھی ہمارے معزز گاہک ہیں ان کی بھی ہم حسب منشا خدمت کرتے رہتے ہیں۔ ان ہی کے زیر سایہ سب کچھ چل رہا ہے ان کی اپنی عزت کا بھی سوال ہے آخر..... اور اب آپ اپنی فرمائش بتائیں کہ بہت وقت ہو گیا ہے اور باہر کچھ اور شرفا اپنی باری کے منتظر ہیں۔"

قصہ مختصر ہم لوگوں نے جان چھڑانے ہی میں عافیت جانی۔ شاہد نے ہمت کر کے اپنی فرمائش نوٹ کراتے ہوئے کہا۔ "شاہ جی' لڑکی دراز قد' تعلیم یافتہ' گوری اور اردو اسپیکنگ ہو' پہلے روز تو صرف چند گھنٹوں کے لیے کہیں باہر گھمانے پھرانے لے جاؤں گا۔ اگر وہ معیار پر پوری اتری تو پھر آئندہ روز کی فرمائش اس ہی کو نوٹ کرا دیں گے۔"

"جی' آپ کو مطمئن کرنا ہمارا فرض ہے پھر آپ تو یار کے یار ہیں۔" شاہ صاحب نے پھر اپنا تکیہ کلام دہرایا۔

میں آپ کو یہ بتانا بھول ہی گیا کہ جب شاہ صاحب ہمیں اوپر بے عشرت کدہ کی سیر کروا رہے تھے تو ڈور بیل بجی تھی اور بوتل کی جن عذرا نے باہر نکل کر کسی کو شاہ صاحب کی مصروفیت کی اطلاع دی تھی۔

ہم شاہ صاحب سے ہاتھ ملا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور شاہ صاحب نے جلدی جلدی اپنا عمامہ زیب تن کر کے اپنی مسند سنبھال لی اور ہم گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے شاہ صاحب کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

باہر نکلے تو دو جوان رعنا لڑکیاں جو دیکھنے میں بے حد اسمارٹ تھیں' ہمارے پیچھے اس مقدس خانقاہ میں داخل ہوئیں۔ اب ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ اپنے آج کے اپائنٹمنٹ نبھانے کے ارادے سے آئی تھیں یا اپنے مسائل کے حل کے لیے شاہ صاحب سے فیض یاب ہونے؟ بہر حال حلیہ و چال ڈھال سے کسی معزز اور باوقار گھرانے کی دکھائی دیتی تھیں۔

اس کے بعد کی کہانی ہمارے لیے تو بہت مختصر اور سنگین ہے لیکن شاہد کے لیے رنگین ہے' مواسی کی زبانی سنیے۔

•.....•.....•

اگلے روز میں مقررہ وقت پر گاڑی شاہ صاحب کے مقدس آستانے سے تھوڑی دور پارک کر کے ڈور بیل بجا کر اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔ دو منٹ کے بعد ایک طرح دار لڑکی باہر آئی اور اتنے اعتماد سے گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر میرے برابر کی سیٹ پر آ بیٹھی جیسے کہ وہ میری کوئی عزیزہ ہو۔

"چلیے....." اس نے اسی اعتماد سے کہا۔ اُسے میرے ساتھ بیٹھے دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کوئی کال گرل ہے۔ دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ کوئی باپردہ' حیادار لڑکی اپنا کوئی مسئلہ لے کر خانقاہ آئی تھی اور اب واپس جا رہی ہے۔

"کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"ابھی نہیں' میں روڈ پر پہنچنے کے بعد۔"

"سوری۔" میں نے کہا۔

اور پھر میں روڈ پر آتے ہی اس نے کہا۔ "میرا نام زرینہ ہے۔" اور ساتھ ہی اس نے اپنے وجود کو چھپائے سیاہ چادر بھی اتار کر پچھلی سیٹ پر پھینک دی۔ اب اسے کوئی دیکھتا تو بلا تامل کہہ سکتا تھا کہ وہ حیادار لڑکی نہیں بلکہ کال گرل ہے۔ نہایت حسین سراپا' دراز' سیاہ' گھنے بال' بڑی بڑی سیاہ پرکشش آنکھیں' سرخ و سپید رنگ' دراز قد' ٹائٹ ٹراوزر پر شاکنگ پنک شرٹ میں وہ اپسرا دکھائی دیتی تھی۔ اس کا حسن اور گداز جسم دیکھ کر کسی بھی پارسا کا ایمان ڈول سکتا تھا۔

میں اسے لے کر ہی ویو کے ایک ریسٹورنٹ میں چلا گیا۔ پہلے آئس کریم اور پھر کولڈ کافی منگوائی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں جب کافی دیر گزر گئی تو زرینہ نے پوچھا۔ "بس باتیں ہی کرنے کے لیے طلب کی گئی تھی میں؟" یہ کہتے ہوئے ایک دلفریب سی مسکراہٹ ہونٹوں پر رقصاں تھی۔ میں کچھ نروس سا ہو گیا۔

"ہاں زرینہ..... آج تو بس تمہیں جاننے کا پروگرام ہے۔ تمہاری دریافت اگلی ملاقات میں سہی۔"

اس ملاقات میں یہ راز کھلا کہ شاہ صاحب کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ زرینہ جیسی بیسیوں شگفتہ اور نوخیز لڑکیاں اس کے اشاروں پر ناچتی ہیں۔ گرچہ کچھ ایسی بھی ہیں جو اپنا پاپی پیٹ پالنے کے لیے بخوشی یہاں آتی ہیں لیکن زیادہ تر تو جوان لڑکیاں وہ ہیں جو اپنے عشق و محبت کے سلسلے میں اپنے محبوب کو قدموں میں دیکھنے کی خواہش لیے شاہ صاحب کے دربار میں حاضر ہوتی ہیں اور پھر محبوب قدموں میں گرے یا نہ گرے' وہ خود شاہ صاحب کے حضور گر جاتی ہیں اور پھر یہ سلسلہ چل پڑتا ہے۔ زیادہ تر لڑکیاں معزز گھرانوں کی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتی ہیں' کالج اور یونی ورسٹی کی آزاد خیال اور آزاد معاشرے کی پروردہ.....!

•.....•.....•

قارئین کرام.....! آپ خود بتائیے کہ معصوم سی لڑکیوں کو زرینہ بنانے کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ بے راہ رو معاشرہ؟ یہ مادر پدر آزادی کے دلدادہ بچے؟ یہ اندھا دھند دولت کے پیچھے بھاگنے والے ماں باپ جو اس حصول زر کی دوڑ میں مصروف ہو کر اپنے اردگرد سے بے نیاز ہو جاتے ہیں یا پھر یہ نام نہاد شاہ صاحبان؟ جواب دیجیے کہ آپ بھی اس معاشرے کے فرد ہیں اور یہ آپ کی بھی ذمہ داری ہے؟

تاج محل

لوگ کہتے ہیں میرا تاج محل زخمی ہے
جوڑ کر لاج محبت کی یہاں رکھتی ہے

شاہ جہاں کتنی محبت تجھے ممتاز سے تھی
تخت و تاج اپنا لٹا دے وہ گل ناز سے تھی

ایسی الفت کہیں دنیا میں نظر آتی نہیں
آئے بھی گر کہیں ایسی تو وفا پاتی نہیں

وقت اس یاد محبت کو لرزتا پائے
اس مینار محبت کو بکھرتا پائے

وہ جو مغرور محبت ہے یہاں آتی نہیں
اس کی گرتی ہوئی حالت پہ ترس کھاتی نہیں

عشق کی دنیا میں ایسا کوئی معمار نہیں
یاد الفت کو بچا لے وہ پرستار نہیں

وقت تاراج کیے دیتا ہے اک تاج محل
عشق کی دنیا میں اس کا نہیں اب تک تو کوئی بدل

بھارت سرکار کا ذمہ ہے حفاظت اس کی
ڈالر و دھن سے لوٹائے گا چاہت اس کی

سیدہ تبسم زہرہ رضوی

www.pdfbooksfree.pk

موبائل کہر اساں ایسی جان سوز کہانیاں جنہوں نے اس ایجادِ جدید کے ذریعے جنم لیا

ممتاز احمد

میری مہرباں محبت

رمزی آثم کا خیال

روشنی مجھ سے ہم کلام ہوئی
دل کی گلیوں میں پھر نہ شام ہوئی

موبائل سے جڑی ایک عجیب محبت کی کہانی، اسے دل کی آنکھ سے پڑھیے



موبائل فون سے جڑی آپ نے بہت سی ایسی کہانیاں پڑھی ہوں گی جن میں کسی مرد نے کسی عورت کی عزت برباد کی، کسی عورت نے کسی مرد سے دھوکہ کیا، کسی کی زندگی برباد ہوئی، کسی کا گھر اجڑا اور کوئی اپنی جان سے گیا مگر میرے ساتھ حیرت انگیز، ناقابلِ یقین اور ناقابلِ فراموش حالات پیش آئے اور موبائل فون دوستی سے نہ صرف میری زندگی کا رخ تبدیل ہو گیا بلکہ میری زندگی سنور گئی۔

میرا نام صفدر ہے۔ گریجویشن کے بعد مجھے ایک سرکاری محکمے میں ملازمت مل گئی۔ میں ایک وجیہہ مرد بلکہ مردانہ حسن کا نمونہ ہوں۔ میرا گورا رنگ اور لمبا قد ہے۔ میں فطرتاً رومان پسند شخصیت کا حامل ہوں، شاید اسی لیے میری شدید خواہش اور تمنا رہی کہ میں کسی لڑکی سے پیار کروں اور کوئی لڑکی مجھے نوٹ کر جائے، مجھ سے محبت کرے مگر میں اپنی خواہش کو کبھی عملی جامہ نہیں پہنا سکا کہ مجھ میں شرافت کے ساتھ جھجک بہت زیادہ تھی۔

خاندان اور محلے میں بہت سی لڑکیاں تھیں اور ان میں کچھ اچھی بھی لگتی تھیں مگر میں جب بھی کسی لڑکی سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے، زبان اٹک جاتی اور الفاظ جیسے حلق میں پھنس کر رہ جاتے۔ میرے ساتھ ایک اور مسئلہ بھی ہے کہ بچپن سے میری آواز بہت بھاری، بھدی اور کرخت ہے لہٰذا اس وجہ سے بھی کبھی کسی لڑکی سے اظہارِ عشق نہ کر سکا۔ یوں میری زندگی کی کتاب کا عشق و محبت والا صفحہ ہمیشہ خالی رہا اور میری اس تمنا کی تکمیل نہ ہو سکی۔ جوں ہی مجھے سرکاری نوکری ملی، گھر والوں نے فوراً ہی مجھے شادی کے بندھن میں باندھنے کی تیاریاں شروع کر دیں اور ایک رشتہ دیکھ کر شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ مجھے اس بات کا شدید ملال تھا کہ کاش..... میری شادی لو میرج ہوتی حالانکہ لڑکیاں مجھے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتیں مگر کسی نے بھی پیار کا اظہار نہ کیا۔ شادی کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ چلو اپنی بیوی سے عشق کروں گا اور اپنی اس خواہش کی تکمیل کروں گا مگر بدقسمتی سے مجھے جو بیوی ملی وہ ہر لحاظ سے پھوہڑ تھی.....

صرف پانچ جماعتیں پاس، عمر میں مجھ سے پانچ سال بڑی، واجبی سی شکل و صورت جس میں ذرا بھی کشش نہ تھی جبکہ اس کی شخصیت میں رومانس نام کی ذرا سی بھی رمق نہ تھی، عشق و محبت کے جذبے سے عاری تھی، حد درجہ کی دقیانوس اور توہم پرست بھی تھی۔ اسے گھر کے کام کاج سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، ٹی وی دیکھنے کا شوق نہ قلم کا نہ پڑھنے لکھنے کا اور نہ ہی کسی سوشل ایکٹیویٹیز کا۔ نہ ہی بنے سنورنے کا کوئی شوق تھا۔ وہ ایک دم بور تھی، عشق کے جذبے کو فضول سمجھتی تھی، مزید ستم یہ کہ سرد مہر اور شرمیلی اتنی کہ ایک بیڈ پر میرے ساتھ سونے سے اس کو شرم آتی نتیجتاً ہمارے ازدواجی تعلقات میں کوئی گرم جوشی نہ تھی اسی لیے مجھے اپنی بیوی سے عشق تو دور کی بات، ذرا سی بھی دلچسپی نہ رہی۔ گھر میں میرا دل بالکل نہ لگتا، میں بے تحاشہ سگریٹ پینے لگا، تمباکو والے پان کھاتا اور زیادہ وقت گھر سے باہر دوستوں میں تاش کھیلنے میں گزارتا۔ اسی ڈگر پر زندگی گزارتے ہوئے ہمارے دو بچے ہو گئے۔ مجھ پر ہر وقت مایوسی اور افسردگی طاری رہتی تھی اور میں وقت سے پہلے ہی بوڑھا نظر آنے لگا۔

ایک دن میں اپنے آفس میں تنہا بیٹھا تھا اور اپنی سوچوں میں گم تھا کہ میرا موبائل بج اٹھا، کوئی نیا نمبر تھا۔ میں نے کال اٹینڈ کی تو ایک لڑکی نے بڑے شائستہ اور مہذب انداز میں سلام کرتے ہوئے کہا۔

”میری حاجرہ سے بات کروا دیں۔“

”سوری..... یہ حاجرہ کا نمبر نہیں ہے۔“ میں

www.pdfbooksfree.pk

نے کہا پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون بول رہا ہوں تو جواب میں میں نے اپنا نام بتایا۔

"مگر حاجرہ نے تو یہی نمبر دیا تھا؟" اس نے حیرانی سے کہا۔

"میں تو کسی حاجرہ کو نہیں جانتا؟"

"لگتا ہے کہ غلطی سے رانگ نمبر مل گیا ہے۔" اور وہ معذرت کر کے فون بند کرنے لگی۔

"پلیز' ایک منٹ..... آپ مجھ سے ہی بات کر لیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"جب یہ حاجرہ کا نمبر نہیں ہے تو آپ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ کوئی لڑکی میری دوست نہیں' میرا بہت دل چاہتا ہے کہ میری کسی لڑکی سے دوستی ہو' آپ کی آواز بہت خوبصورت ہے لہٰذا میری التجا ہے کہ آپ مجھ سے دوستی کر لیں۔"

"میں آپ کو جانتی نہیں کہ آپ کون ہیں اور کس قسم کے انسان ہیں پھر میں کیسے آپ سے دوستی کر سکتی ہوں؟"

"میں شریف' پڑھا لکھا اور سرکاری ملازم ہوں۔" میں نے اپنا تعلق اور عہدہ بھی بتایا۔

"ٹھیک ہے' میں سوچوں گی' فی الوقت تو مجھے اپنی سہیلی حاجرہ سے بات کرنی ہے۔ اگر دل مانا تو آپ کو مس کال دوں گی۔" اور پھر اس نے فون بند کر دیا۔ اس کی آواز اور بات کرنے کا انداز اتنا دلکش تھا کہ وہ فوراً سماعت کے راستے میرے دل میں اتر گئی تھی۔ میں رو دینے والے انداز میں دُعائیں کرنے لگا کہ کاش..... یہ لڑکی میری دوست بن جائے۔ اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو پر میں خود حیران تھا کہ میں نے اتنی باتیں کرنے کا حوصلہ کس طرح کر لیا؟ خیر' میں اس کی مس کال کا بڑی شدت سے انتظار کرنے لگا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد اُس نے مجھے مس کال دی تو میں نے فوراً اُسے رنگ بیک کر دیا۔

سلام کے بعد وہ کہنے لگی۔ "آپ مجھے اپنے بارے میں تفصیل سے سچ سچ بتائیں کہ کہاں رہتے ہیں؟ کون ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔" جواباً میں نے اس کو اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دیا اور یہ بھی بتایا کہ میں شادی شدہ ہوں اور دو بچے بھی ہیں۔

"بیوی کے ہوتے ہوئے آپ کسی دوسری لڑکی سے دوستی کے خواہش مند کیوں ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا تو میں نے اُسے اپنی بیوی کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ یہ سب سن کر اسے میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے یقین دلایا۔ قصہ مختصر وہ میرے ساتھ دوستی پر آمادہ ہو گئی۔ اس نے اپنا نام مہک بتایا تھا۔

"آپ کہاں اور کس شہر میں رہتی ہیں؟ آپ کے والد کیا کرتے ہیں؟ بہن بھائی کتنے ہیں؟ آپ خود کیا کرتی ہیں؟ اسٹوڈنٹ ہیں یا جاب وغیرہ کرتی ہیں؟"

میرے ان سوالوں کے جواب میں اس نے کہا تھا۔ "آپ کو ان باتوں سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہی آپ میرے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کریں گے بس اتنا کافی ہے کہ میں مہک ہوں اور آپ کی دوست ہوں اور آپ سے ہمیشہ مخلص رہوں گی۔"

مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ میں تو خوش تھا کہ وہ میری دوست بن گئی تھی لہٰذا میں نے اس سے وعدہ کیا کہ آئندہ میں یہ سوالات نہیں کروں گا۔ اس طرح ہماری موبائل دوستی کا آغاز ہو گیا۔ ہم روزانہ کئی کئی گھنٹے فون پر بات کرتے اور میں اکثر اس کا شکریہ ادا کرتا کہ اس نے مجھ جیسے شادی شدہ بھدی آواز والے مرد سے دوستی کر کے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس پر وہ ایک روز کہنے لگی۔

"اگر آپ کی آواز اچھی نہیں ہے تو اس میں آپ کا کیا قصور ہے؟ یہ آپ کے بس میں تو نہیں ہے

مگر اس کے برعکس آپ کی سوچ' خیالات اور باتیں بہت ہی اعلیٰ اور عمدہ ہیں۔ آپ سچ بولنے والے' ایک سلجھے ہوئے' مہذب اور باخلاق انسان ہیں۔" اس کی یہ بات سن کر میرا دل خوشی سے بھر گیا۔

وہ بہت خوبصورت باتیں کرتی تھی۔ اس کی گفتگو اتنی دلکش اور مزے دار ہوتی' دل چاہتا کہ وہ ساری زندگی بولتی رہے اور میں اس کی متزنم اور کانوں میں رس گھولنے والی آواز سنتا رہوں۔ جب وہ کسی بات پر کھلکھلا کر ہنستی تو لگتا جیسے جلترنگ بج اٹھے ہوں۔

وہ روزانہ باقاعدگی سے مجھے مس کال کرتی اور ہم زندگی کے ہر موضوع پر خوب باتیں کرتے۔ اس کے پاس بہت علم تھا' وہ مذہب' سیاست' کمپیوٹر' ٹی وی' اُلم' معاشرتی معاملات' معاشی حالات اور گھریلو معاملات پر بے تکان بولتی اور میں بڑی دلچسپی سے اس کی خوبصورت باتیں سنتا۔ میں روزانہ اس کے فون کا شدت سے انتظار کرتا تھا۔ اگر کبھی اسے فون کرنے میں دیر سویر ہو جاتی تو مجھے بہت بے چینی اور اُلجھن ہونے لگتی۔ وہ میری زندگی میں بادِ صبا کے جھونکے کی طرح داخل ہوئی تھی اور میری روکھی پھیکی زندگی کو گل و گلزار بنا دیا تھا۔ دن اسی طرح گزرتے رہے اور ایک روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں اس کی محبت میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ اس دن اس کا فون آیا تو میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے کہا تھا۔

"مہک' میں تم سے عشق کرنے لگا ہوں اور تمہیں ٹوٹ کر چاہنا ہوں....."

"مجھے بھی پیار ہو گیا ہے اور میں بھی تم سے شدید محبت کرتی ہوں' جب تک تم سے بات نہ کر لوں' مجھے سکون نہیں ملتا۔" اس کی زبانی یہ سب سن کر میں ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔ یہ خیال ہی خوش کن تھا کہ کوئی ہستی مجھے ٹوٹ کر چاہتی ہے۔

"لیکن صفدر' ہماری محبت الگ انداز کی ہے' تم مجھ سے کبھی بھی شادی کا نہیں کہو گے کیونکہ ہمارا ملاپ ناممکن ہے۔ ہاں' ہم مرتے دم تک ایک دوسرے سے سچی اور پاکیزہ محبت کرتے رہیں گے کیونکہ صرف حاصل کر لینے کا نام ہی محبت نہیں ہے۔" اس کی اس بات پر تھے بھر کو میں بجھ گیا تھا مگر پھر میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا' وہ درست کہہ رہی تھی۔

ایک روز مہک نے مجھ سے میرے معمولات اور عادات کے بارے میں تفصیل سے پوچھا۔ میں نے اس کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا کہ میں سگریٹ پیتا ہوں' تمباکو والے پان کھاتا ہوں اور تاش کھیلتا ہوں۔ نماز مجھی نہیں پڑھتا۔ یہ سب جاننے کے بعد اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں آئندہ باقاعدگی سے پانچ وقت کی نماز باجماعت پڑھوں گا جس پر میں نے اُسی دن سے نماز پڑھنی شروع کر دی تھی پھر اس نے میرے پان کھانے بند کروائے اور تاش کھیلنے پر بھی پابندی لگا دی۔ مجھ میں ایک اور بری عادت بھی تھی' وہ یہ کہ اکثر باتیں کرتے ہوئے میرے منہ سے گالیاں بھی نکل جایا کرتی تھیں۔ اس نے مجھے اپنی قسم دی کہ اب میں کسی کو گالی نہیں دوں گا پھر اس نے مجھے تاکید کی کہ صبح فجر اور مغرب کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کروں۔

ایک روز اس نے اپنی محبت کا واسطہ دے کر کہا تھا۔ "اگر میں اس سے سچی محبت کرتا ہوں تو سگریٹ پینا چھوڑ دوں۔" اور میں نے اسی وقت سے سگریٹ چھوڑ دیئے۔ اس کی باتوں میں جانے کیا جادو تھا کہ وہ مجھ سے جو کہتی' میں بلا چون و چرا اس کی ہر بات مان لیتا' نتیجہ یہ نکلا کہ میری شخصیت دن بدن نکھرتی چلی گئی پھر اسی کے کہنے پر میں نے روزانہ واک بھی شروع کر دی۔ واک کے دوران اکثر اس کی کال آ جاتی اور ہم ڈھیروں باتیں کرتے۔

اب میں پکا نمازی بن گیا تھا۔ تاش' پان اور

www.pdfbooksfree.pk

سگریٹ چھوڑ دیئے تھے جس سے میرے اندر بہت سی خوشگوار تبدیلیاں آتی گئیں۔

ہماری محبت نما دوستی کو کئی ماہ گزر گئے تھے اور میرے دل میں اس سے ملنے اور اسے دیکھنے کی خواہش شدت سے انگڑائیاں لینے لگی تھی' سو اب میرا اس سے ملاقات کا اصرار دن بدن بڑھتے لگا تھا۔ وہ مجھ سے ملاقات کا وعدہ کرتی رہتی مگر بقول اس کے' وہ وقت نہیں نکال پا رہی تھی۔

ایک دن میں نے تنگ آ کر اس سے کہا۔ "اگر تم واقعی مجھ سے سچی محبت کرتی ہو تو اسی ہفتے مجھ سے ملو ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم مجھ سے محبت کا ناٹک کر رہی ہو۔" تب اس نے دو دن بعد ملنے کا وعدہ کر لیا تھا' یہ دو دن میں نے کس بے قراری میں گزارے تھے' یہ میں ہی جانتا ہوں۔ جب ملاقات کا دن آیا تو مسرت سے میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ میں نے اُس روز اپنے آفس سے چھٹی لے لی تھی اور خوب تیاری کی تھی۔ اُس دن بارہ بجے ملاقات کا وقت طے تھا' ہماری ملاقات ایک مشہور جنرل اسٹور پر ہونا تھی اور پھر ٹھیک بارہ بجے وہ وہاں موجود تھی۔

میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا' اس کی آواز جتنی خوبصورت اور متزنم تھی' اس سے بڑھ کر وہ خود حسن کا شاہکار تھی۔ لگتا تھا جیسے کوئی حسین ماڈل ہو۔ میں اس کے ملکوتی حسن میں کھو کر رہ گیا۔ ہم اس جنرل اسٹور سے قریبی ریسٹورنٹ کے فیملی کیبن میں جا کر بیٹھ گئے۔ میری نظریں مہک کے خوبصورت چہرے اور حسین سراپے سے ہٹتی ہی نہیں تھیں۔ وہ میرے لیے بہت خوبصورت اور قیمتی گفٹ لے کر آئی تھی۔ ہم دو گھنٹے وہاں بیٹھے رہے' کھانا وغیرہ کھایا' خوب باتیں کیں۔ مہک کے کپڑوں سے بہت دلفریب خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس سے پوچھا کہ وہ کس علاقے میں رہتی ہے اور کیا کرتی ہے مگر اس نے محض اتنا بتایا کہ وہ اسی شہر میں رہتی ہے' باقی اس نے مزید کچھ بتانے سے معذرت کر لی۔ میرا موبائل کیسرے والا تھا' میں نے اس کی بہت ساری تصویریں بنائی تھیں' اس کی خوبصورت آواز ریکارڈ کی تھی اور اس کی مووی بھی بنائی تھی۔ جتنی دیر ہم بیٹھے رہے' وہ تمام وقت دلفریب انداز میں ہنستی مسکراتی رہی تھی۔ میرے دل میں شدت سے یہ خواہش جاگی تھی' وقت تھم جائے اور وہ ساری زندگی میرے سامنے اسی طرح بیٹھی رہے' باتیں کرتی رہے' ہنستی رہے اور میں اسے محویت سے دیکھتا رہوں مگر افسوس..... ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ وقت کا کام گزرنا ہے اور اس کے دیدار کا وقت بھی گزر گیا۔ اس نے واپس جانے کی اجازت چاہی۔ میں نے بھی اس کو بہت اچھا گفٹ لے کر دیا اور وہ دوبارہ بہت جلد ملنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے جاتے ہی میں اداس ہو گیا تھا۔

بہرحال ہماری روزانہ فون پر ڈھیروں باتیں ہوتیں۔ میرے یار دوست اب مجھ سے شکوہ کرتے کہ میں نے تو اُن کو کہنی دینا ہوں اور نہ ہی تاش کھیلتا ہوں جس پر میں مصروفیت کا بہانہ بنا کر اُن سے جان چھڑا لیتا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میں نے تاش کھیلے یا سگریٹ وغیرہ پینے کی کوشش کی تو یہ مہک کی توہین ہوگی۔ وہ میرے لیے ایک دیوی کی طرح تھی جس کا ہر حکم بجالانا میرے لیے کسی عبادت سے کم نہ تھا۔

تقریباً دو ماہ بعد پھر ہماری ملاقات ہوئی۔ میں اس کو بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"مہک..... کاش..... تم میری بیوی ہوتیں یا میری بیوی تم جیسی ہوتی....."

"تمہاری بیوی بننا تو ناممکن ہے البتہ میں تمہاری بیوی کو بہتر بنا سکتی ہوں۔"

"اچھا' وہ کیسے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اپنی بیوی کا موبائل نمبر مجھے دو۔" اس نے کہا۔

اس کے پاس موبائل نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے' تم اسے موبائل خرید کر دو۔"

اس کے کہنے پر میں نے اپنی بیوی کو نیا موبائل اور نئی سم لے کر دی اور اس کو کال کرنے اور سننے کا طریقہ بتایا۔ میری بیوی کا کہنا تھا کہ اس کو نہ تو موبائل کی ضرورت ہے اور نہ ہی شوق..... خیر بڑی مشکل سے اسے موبائل فون رکھنے پر آمادہ کیا۔

میری بیوی نے گھر کی صفائی ستھرائی اور کپڑے وغیرہ دھونے کے لیے ایک ماسی رکھی ہوئی تھی اور وہ خود سارا دن بیڈ پر لیٹی رہتی یا کھانا وغیرہ پکاتی جس کے باعث وہ دن بدن فربہ ہوتی جا رہی تھی۔ سلیقہ تو اس میں پہلے ہی نہیں تھا' اب وہ موٹاپے کی وجہ سے بھدی ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی بیوی کا موبائل نمبر مہک کو دے دیا اور اس نے چند دنوں میں ہی میری بیوی کو اپنی سہیلی بنا لیا اور اسے لمبی لمبی کالز کرنے لگی۔ ایک روز میں نے اپنی بیوی سے ان فون کالز کا پوچھا تو اس نے کہا کہ میری بہت ہی پیاری اور گہری سہیلی کا فون ہے۔ یہ سن کر میں مسکرا کر رہ گیا۔ مہک نے پتہ نہیں اپنی باتوں کا کیا جادو چلایا کہ میری بیوی میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ اب وہ مزے مزے کے کھانے پکانے لگی تھی' گھر کے کام کاج میں خوب دلچسپی لیتی تھی' اس میں سلیقہ بھی آتا جا رہا تھا۔

ایک دن میں دفتر میں تھا تو مہک نے فون پر بتایا کہ وہ میرے گھر میری بیوی سے ملنے جا رہی ہے' اس نے مجھے تاکید کی کہ میں اس کی موجودگی میں اپنے گھر نہ جاؤں۔ خیر' اُس روز میں جان بوجھ کر گھر دیر سے گیا تو دیکھا کہ گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ فرنیچر اور بیڈ وغیرہ کی سیٹنگ تبدیل تھی۔ نئے پردے لگے ہوئے تھے اور میری بیوی بہت ہی خوشگوار موڈ میں تھی۔ جب میں نے اس تبدیلی کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگی کہ یہ سارا میری سہیلی مہک کا کمال ہے۔ بہرحال اس روز مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اب میں نے ایک خاص بات یہ نوٹ کی کہ جب گھر آتا تو میری بیوی بنی سنوری ہوتی اور بڑی خوش دلی اور چاہت سے میرا استقبال کرتی۔ اس کا مٹاپا بھی دن بدن کم ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ ہر کام سلیقے اور ڈسپلن سے کرنے لگی تھی۔ پانچ وقت نماز پڑھتی۔ اپنے بناؤ سنگھار پر خصوصی توجہ دیتی' رشتے داروں اور عزیز و اقارب سے ہمارا میل جول کافی بڑھ گیا تھا۔ گھر آنے والے مہمانوں کی خوب تواضع کرتی حتیٰ کہ اُس کی سلیقہ مندی' رکھ رکھاؤ اور اچھے اخلاق کے سب ہی قائل ہو گئے۔

یہ کرشمہ فقط مہک کی وجہ سے ہوا تھا۔ ان تمام چیزوں کی تفصیل مہک مجھے فون پر بتاتی جس پر میں اس کا بہت ممنون ہوتا تھا اور اس کا ہر دم شکریہ ادا کرتا تھا' جواب میں وہ خوب ہنستی اور کہتی کہ وہ یہ سب کچھ میری محبت میں کر رہی ہے۔ الغرض مہک کی وجہ سے ہم دونوں میاں بیوی کی زندگیاں تبدیل ہو گئیں اور خاندان بھر میں ہمیں مثالی جوڑا تصور کیا جانے لگا۔ مہک ہمارے لیے بہت دُعائیں کرتی تھی۔ یہ اُس کی دُعاؤں' محبت' خلوص' چاہت اور محنت کا نتیجہ تھا کہ ہمارا گھر نہ مثالی بن گیا تھا۔ ہماری دوستی دو سال چلتی رہی۔

مہک کی شخصیت میں ایک تقدس تھا' پاکیزگی تھی۔ ہماری بے شمار ملاقاتیں ہوئیں مگر ہم نے ایک دوسرے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اگر کبھی میرے دل میں اس کو چھونے کا خیال بھی آیا تو مجھے لگتا کہ میرے چھونے سے وہ میلی ہو جائے گی۔ اس نے کبھی کوئی عامیانہ بات یا حرکت نہیں کی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح اس نے کبھی موبائل بیلنس یا کسی چیز کی فرمائش نہیں کی تھی۔ میں اسے کوئی تحفہ دیتا تو بڑی مشکل سے قبول کرتی اور اگلی

www.pdfbooksfree.pk

مرتبہ میرے لیے اس سے بڑھ کر قیمتی تحفہ لے کر آتی۔

پھر ایک روز مہک نے مجھے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ اس کی شادی ہو رہی ہے اور وہ شادی کے فوراً بعد اپنے شوہر کے ساتھ بیرونِ ملک چلی جائے گی۔ میں بہت پریشان ہو گیا اور مجھ پر اداسی طاری ہونے لگی۔ جب وہ آخری بار مجھ سے ملنے آئی تو اس کی جدائی کا سوچ سوچ کر مجھے ہول اٹھ رہے تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات جاری تھی۔ اس نے مجھے اپنی قسم دے کر رونے سے منع کیا تھا' بس اس کی ایک ہی درخواست تھی کہ میں ہمیشہ اسے اپنی دُعاؤں میں یاد رکھوں۔ آخر جدائی کی گھڑی آن پہنچی' میں نے ڈھیروں دُعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا کیونکہ اگلے روز اس کی اسلام آباد روانگی تھی جہاں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں اس کی شادی کی تقریب ہونا تھی اور وہ یں سے ویسے کے بعد اس کی بیرونِ ملک روانگی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میری بیوی بھی اداس رہنے لگی تھی اور میں بھی بہت مغموم رہتا تھا۔ جب بھی آنکھوں سے آنسو نکلتے تو مجھے اس کی دی ہوئی قسم یاد آجاتی اور میں اپنے آنسوؤں کو روک لیتا اور دل سے اس کی خوشیوں بھری زندگی کے لیے دُعا کرتا۔ جب بھی اس کی یاد ستاتی' میں اپنے موبائل فون پر اس کی مووی اور تصویریں دیکھتا' اس کی ریکارڈ کی ہوئی آواز سنتا۔

مگر پھر اس کے دیدار کا یہ سہارا بھی ختم ہو گیا' ایک دن موٹر سائیکل چلاتے ہوئے میں موبائل فون سن رہا تھا کہ فون میرے ہاتھ سے نیچے گر گیا اور پیچھے سے آنے والی گاڑی نے اسے روند دیا اور فون چکنا چور ہو گیا۔ یوں اس کی یاد تازہ کرنے کا یہ ذریعہ بھی ہاتھ سے گیا۔

کوئی چھ ماہ بعد اچانک اس کا فون آیا' اس نے بتایا کہ وہ بہت خوش ہے۔ اسے بہت چاہنے والا شوہر ملا ہے پھر مزید چھ ماہ بعد اس نے فون پر بتایا کہ اللہ نے اُسے اپنی رحمت اور نعمت سے نوازا ہے اور جڑواں بیٹا بیٹی پیدا ہوئے ہیں جس پر میں نے اُس کو بہت مبارکباد دی تھی پھر ایک سال بعد اس نے سعودی عرب سے فون کر کے مجھے بتایا کہ اللہ کے لطف و کرم سے اس نے حج اور عمرہ کی سعادت بھی حاصل کر لی ہے۔ یہ سب سن کر میں خوشی سے سرشار ہو گیا' تب سے اب تک اس کا کوئی فون نہیں آیا۔ ہماری گھریلو اور ازدواجی زندگی بہت اچھے اور خوشگوار انداز میں گزر رہی ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ پیار اور محبت کی وہ مقدس دیوی کون تھی جس نے نہ صرف اتنا پیار اور چاہت دی کہ میری اور میری بیوی کی زندگیوں کا رخ تبدیل کر دیا' ہماری زندگی میں ایک دوسرے کے لیے چاہت پیار اور مٹھاس آ گئی۔ اس کا حکم تھا کہ میں اپنی بیوی کے چہرے اور عکس میں اس کو دیکھوں کیونکہ میری بھرپور توجہ اور حقیقی پیار کی حق دار صرف اور صرف میری بیوی ہے۔ بدلے میں میری بیوی نے بھی مجھے اسی شدت اور بھرپور جذبے سے پیار دیا ہے۔ اس کی کہی ہوئی باتوں پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہماری ازدواجی زندگی میں بہت سکون ہے۔ اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے ہمارے چار بچے ہیں۔ میری مالی حالت پہلے سے بہت بہتر ہو گئی ہے۔ اب ہمارے پاس کار بھی ہے۔ میری ترقی بھی ہو گئی ہے اور میں اب گریڈ سترہ کا آفیسر ہوں۔

مہک کی پاکیزہ اور لازوال محبت کو میں مرتے دم تک نہیں بھول سکوں گا۔ میری بیوی کو آج تک مہک سے میری دوستی اور اگلی تمام خوشگوار تبدیلیوں کے راز کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ اکثر سوچتا ہوں کہ بیوی کو سب کچھ بتا دوں پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو جاتا ہوں۔ آپ ہی مشورہ دیجیے' کیا میں اپنی بیوی کو یہ سب کچھ بتا دوں یا راز ہی رہنے دوں؟

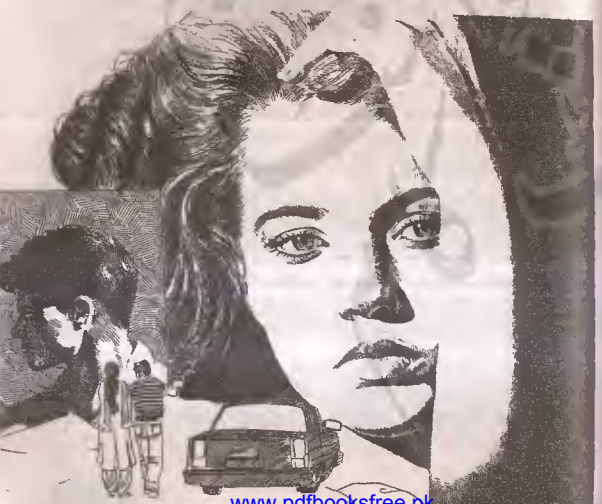
مہتاب خان

وہ ایک نشان

ظریف احسن کا خیال

ایک آواز اٹھا لے جاتی ہے ہم کو
ایک سائے کے پیچھے ہم بھی چلتے ہیں

ایک پراسرار گھر کی عجب کہانی، آپ کو اس قصے پر اعتبار کرنا پڑے گا



www.pdfbooksfree.pk

اُن دنوں میری نئی نئی شادی ہوئی تھی اور اُن ہی دنوں میرا دفتر سے پنجاب کے ایک علاقے جوہر آباد تبادلہ ہوگیا تھا۔ میں نے سوچا کہ پہلے وہاں کرائے کا گھر وغیرہ تلاش کرلوں پھر بیوی کو بھی پاس بلوالوں گا۔ یہی سوچ کر میں جوہر آباد روانہ ہوگیا تھا اور وہاں پہنچ کر ڈیوٹی جوائن کرلی تھی۔

جوہر آباد میں میری رہائش ایک ہوٹل میں تھی۔ یہ بڑا سرسبز علاقہ تھا اور یہ سردیوں کا موسم تھا۔ بڑی کڑاکے دار سردیاں پڑ رہی تھیں۔ میرا تعلق چونکہ کراچی سے ہے اور کراچی میں سردی اتنی شدید نہیں ہوتی۔ پہلی بار میرا واسطہ ایسی سردی سے پڑا تھا۔ قصہ مختصر میں نے وہاں زور وشور سے مکان کی تلاش شروع کی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں اپنے دفتر کے ساتھیوں سے بھی کہہ رکھا تھا۔

میرے دفتر کے ساتھیوں نے مجھے کافی گھر دکھائے تھے مگر مختلف وجوہات کی بنا پر مجھے اُن میں سے کوئی بھی پسند نہیں آیا تھا۔ اس تلاش میں دو ہفتے گزر چکے تھے اور معاملہ جوں کا توں تھا۔ ہوٹل کی رہائش بھی مجھے مہنگی پڑ رہی تھی۔ بیوی کے بھی فون پر فون آرہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں؟

اُس روز موسم صبح ہی سے ابر آلود تھا۔ شام ہوتے ہی بارش شروع ہوگئی تھی اور موسم انتہائی سرد ہوگیا تھا۔ میں ہوٹل کے کمرے میں پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا' باہر گرج چمک کے ساتھ تیز بارش ہو رہی تھی۔ اُس وقت مجھے چائے کی بڑی طلب محسوس ہو رہی تھی' سو میں نے ہوٹل کے بیرے رشید سے چائے منگوائی ہوئی تھی۔ وہ تھوڑی دیر بعد میرے لیے چائے لے کر آگیا تھا۔

رشید بہت شریف النفس اور بھلا انسان تھا۔ مجھ سے کافی بے تکلف ہوگیا تھا اور میرے کئی چھوٹے موٹے کام کر رہا تھا۔ مجھے چائے دینے کے بعد اُس نے مجھے پریشانی کے عالم میں بیٹھے دیکھا تھا تو فوراً ہی پوچھا تھا۔

"خیر تو ہے صاحب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟"

"ہاں' پریشان تو ہوں اور پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اب تک کوئی کرائے کا گھر نہیں ملا ہے۔ اگر کوئی مکان پسند آتا ہے تو کرایہ زیادہ ہوتا ہے اور اگر کرایہ مناسب ہوتا ہے تو مکان اچھا نہیں ہوتا۔ مجھے یہاں اپنی فیملی کو بھی بلانا ہے مگر جب تک گھر کا انتظام نہ ہوجائے میں انہیں بھی نہیں بلاسکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں؟"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد رشید پرسوچ انداز میں بولا تھا۔ "صاحب! ایک بنگلہ کرائے کے لیے خالی ہے مگر وہ آبادی سے تھوڑی دور ہے۔ اُس کا مالک ملک سے باہر ہے لیکن اس کے منشی سے میری جان پہچان ہے' وہ بنگلہ سامان وغیرہ کے ساتھ ہی کرائے پر دیتے ہیں اور....."

"یار! اس کا کرایہ بھی تو زیادہ ہوگا ناں؟" میں نے فوراً ہی رشید کی بات کاٹی تھی۔

"صاحب.....! یہی تو اچھی بات ہے کہ اُس کا کرایہ کم ہے کیونکہ وہ غیر آبادی جگہ پر ہے' لیکن ایک بات بتا دوں' اُس بنگلے کے بارے میں کچھ لوگوں نے مشہور کیا ہوا ہے کہ وہاں کچھ سائے وغیرہ کا سلسلہ ہے۔" رشید نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا تھا۔ "مگر صاحب.....! آپ تو بہت پڑھے لکھے ہیں' اُس لیے ان باتوں پر یقین تو نہیں رکھتے ہوں گے۔ ہماری طرف کے لوگ تو خاصے توہم پرست ہوتے ہیں' وہ یونہی سنی سنائی بات بغیر کسی تصدیق کے آگے بڑھا دیتے ہیں۔"

"رشید! تم منشی سے بتا کر دو کہ کیا میں ایک دو دن اس بنگلے میں گزار سکتا ہوں؟ اگر بنگلہ مجھے پسند آگیا اور کرایہ بھی مناسب ہوا تو میں اپنی فیملی کو بلوالوں گا۔" میں جانتا تھا کہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا مگر جب رشید نے منشی سے بات کی تو وہ اس پر راضی ہوگیا۔ منشی بنگلے کی دیکھ بھال کے لیے اکثر وہاں جایا کرتا تھا اور نہ اُس کی رہائش شہر ہی میں تھی۔ اُس نے میرے لیے وہاں نا صرف ایک کمرہ صاف کروا دیا تھا' ساتھ ہی وہاں میرے لیے دو چار دن کھانے پینے کا انتظام بھی کروا دیا تھا۔

وہ بنگلہ آبادی سے کچھ دور ایک سنسان مقام پر تھا' شہر سے باہر جانے والی سڑک سے جڑی ایک چھوٹی سی سڑک اُس بنگلے کے سامنے سے جاتی تھی' اُسی سڑک پر دن بھر میں شاید ہی کوئی ٹیکسی یا بس وغیرہ جاتی ہو۔ میں تین دن کی چھٹی لے کے وہ بنگلہ دیکھنے کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔ اُس دن بھی ہلکی پھلکی بارش ہو رہی تھی اور بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جب میں بنگلے میں پہنچا تو منشی میرے خیر مقدم کے لیے وہاں موجود تھا۔

منشی مجھے بنگلہ دکھانے لگا۔ یہ ایک کشادہ بنگلہ تھا۔ اُس وقت میں کچھ تھکن محسوس کر رہا تھا اسی لیے تفصیلی معائنہ نہیں کرسکا۔ ہم لوگ اس کمرے میں چلے آئے جو منشی نے میرے لیے ٹھیک کروایا ہوا تھا۔ اُس نے میرے لیے کھانا بھی تیار کرایا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تھا جو بہت لذیذ تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ چلا گیا تھا اور میں یہاں تنہا رہ گیا تھا۔

میں بنگلے کا ایک چکر لگانے کے خیال سے باہر آگیا تھا۔ اندھیرا بڑھ چکا تھا' بارش کم ہوگئی تھی۔ مکان کے پچھلے دروازے سے کوئی پندرہ گز کی دوری پر کیا راج تھا' میں نے اُس کا بھی چکر لگایا مگر اُس کے اندر نہیں گیا' اِدھر اُدھر کچھ دیر ٹہل کر میں اندر چلا گیا اور ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ چاروں طرف مکمل سکوت طاری تھا' کہیں سے کوئی آواز نہیں آرہی

ہم سفر

اپنے رستے، سب چلتے تھے
ترے ساتھ
ہم چلتے تھے
اپنے رستے، سب چلتے ہیں
ترے ساتھ
ہم چلتے ہیں
اپنے رستے، سب جائیں گے
ترے ساتھ
ہم جائیں گے
اے ہمسفر، ہم کون ہیں؟
اور کون تھے؟

ظریف احسن، بتاؤ تم

لکھنے پڑھنے والوں کا
یہ رشتہ ازل سے ہے
ہم ہر صدی کا قصہ ہیں
ہم ہر رستے کا حصہ ہیں
ہم ہر اول کا آخر ہیں

ظریف احسن

www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ سردرات کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

رات بہت سکون سے گزری تھی۔ میں نے وہاں کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی تھی۔ میں بڑا بہادر آدمی واقع ہوا ہوں مگر مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ رات کے اندھیرے میں مجھے کچھ خوف سا محسوس ہو رہا تھا چودن کی روشنی میں معدوم ہو چکا تھا۔ میں نے بنگلے کا تفصیلی جائزہ لیا تھا' یہ ایک خاصا وسیع بنگلہ تھا جو مجھے بے حد پسند آیا تھا۔ یہاں موجود فرنیچر اور قالین وغیرہ اگرچہ خاصے پرانے لگ رہے تھے مگر قابل استعمال تھے' سو میں نے اپنی بیوی کو بھی فون کر کے یہ خوش خبری سنادی تھی کہ کرائے پر ایک بہترین بنگلہ مل گیا ہے اور جلد ہی میں اسے بلوا لوں گا۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی تھی لیکن میں نے اسے سایہ وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا کیونکہ عورتیں کچھ توہم پرست ہوتی ہیں اور پھر مجھے خود بھی ایسی کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں ہوئی تھی۔

•.....•.....•.....•

وہ اُس بنگلے میں میری تیسری رات تھی۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے کافی دیر اپنی بیوی سے فون پر بات کی تھی۔ رات کے تقریباً بارہ بج رہے تھے' میں بستر پر لیٹنے ہی جا رہا تھا کہ مجھے ایک کار کی آواز سنائی دی تھی' یوں لگا تھا کہ وہ کار بنگلے کے گیٹ پر کھڑی ہوگئی ہے۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا تھا' مجھے گیٹ کے پاس کار کی ہیڈ لائٹ کی روشنی تو دکھائی دی تھی مگر کار وہاں سے نظر نہیں آ رہی تھی' میں نے سوچا تھا کہ گیٹ تک ہو آؤں اور معلوم کروں کہ کیا مسئلہ ہے؟

میں نے وہاں پہنچ کر دیکھا کہ ایک چھوٹی سی خوبصورت سفید کار گیٹ کے سامنے کوئی بیس گز کی دوری پر چھوٹی سڑک کے عین درمیان میں رکی ہوئی تھی۔ ہیڈ لائٹ کی روشنی کافی تیز تھی' جب میں گھوم کے کار کے سامنے پہنچا تو دیکھا کہ ایک جوان العمر لڑکی بونٹ اٹھا کر انجن پر جھکی ہوئی کچھ کر رہی تھی۔

''میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟'' میں نے اُس کے قریب جا کر پوچھا تھا۔

''انجن میں کوئی خرابی ہوگئی ہے' گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی۔'' اُس نے انجن سے نظر اٹھا کر مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا' میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن انجن اس سے مس نہ ہوا تھا۔ وہ اتنا گرم ہوگیا تھا کہ چھونے سے ہاتھ جلتا تھا۔

میں نے لڑکی سے پوچھا تھا۔ ''ریڈی ایٹر میں پانی ہے؟''

''غرور ہوگا۔'' اُس نے بڑے یقین سے جواب دیا تھا لیکن مجھے اطمینان نہیں ہوا تھا۔ میں دوڑ کر اپنے گھر سے پانی کی ایک بوتل لے آیا تھا اور ریڈی ایٹر کا ڈھکن کھول کر جیسے ہی اُس میں پانی ڈالنا چاہا تھا' وہ ابل کر باہر آ گیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ وہ لڑکی کافی دیر سے ریڈی ایٹر میں پانی ختم ہونے پر بھی رائیڈ کرتی چلی جا رہی تھی اور اب انجن بند ہوگیا تھا۔ ہم لوگوں نے کافی دیر تک انجن ٹھنڈا ہو جانے کا انتظار کیا تھا لیکن کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ مجھے ساری رات یہاں رکنا پڑے گا؟''

''اس میں کوئی مشکل نہیں' مطلب..... اگر تم چاہو تو میں اس گھر میں تمہاری میزبانی کر سکتا ہوں۔'' میں نے اُس کے سوال کے جواب میں کہا تھا۔

''مگر.....'' اُس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ رکنا نہیں چاہتی تھی۔

''تم رات کے اس پہر اکیلی' پیدل کہاں جاؤ گی؟'' میرے سوال پر وہ خاموش رہی تھی کہ اسی

دوران اُس سڑک پر کسی گاڑی کی چمکتی ہیڈ لائٹس ہمیں اپنی جانب آتی نظر آئی تھیں۔

میں نے لڑکی سے کہا تھا۔ ''لو بھئی' تمہارا مسئلہ حل ہوگیا۔ یہ گاڑی تمہیں شہر تک پہنچا دے گی۔'' مگر میری یہ بات سن کر بھی اس کا اضطراب اور پریشانی کم نہیں ہوئی تھی۔ میں بہت تعجب سے سوچنے لگا تھا کہ آخر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے؟

گاڑی قریب آئی تھی تو میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی ہمارے قریب لا کر روکی تھی اور ساری صورت حال جان کر اس نے بتایا تھا کہ وہ شہر جا رہا ہے اور لڑکی کی خراب گاڑی کو tow کرنے کے لیے تیار ہے لیکن وہ لڑکی اس بات کے لیے بھی تیار نہ ہوئی تھی اور پھر آخر میں یہی طے ہوا تھا اس لڑکی کی کار وکیل کر بنگلے کے گیراج میں پہنچا دی جائے جسے وہ صبح کسی کو بھیج کر منگوالے گی جبکہ وہ خود اس وقت دوسری گاڑی کے ڈرائیور' اُس نوجوان کے ساتھ شہر جانے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔

میں گیراج کی چابی ڈھونڈ لایا تھا اور کار کے ڈرائیور کی مدد سے جس کا نام جہانگیر تھا' لڑکی کی کار وکیل کر گیراج میں پہنچائی تھی اور پھر میں نے اُن دونوں سے کہا تھا۔

''رات کافی سرد ہے اس لیے اگر وہ چاہیں تو اندر چل کر میرے ساتھ گرم گرم چائے پی لیں پھر اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں۔''

جہانگیر فوراً ہی میرے مشورے پر عمل کے لیے تیار ہوگیا جبکہ لڑکی کچھ جھجک رہی تھی۔ بہرحال میں نے اندر آ کر چائے بنائی تھی' ایک ایک کپ انہیں دے کر خود بھی اُن کے ساتھ پینے لگا تھا اور چائے کے دوران ہی میں نے اُس لڑکی کو غور سے دیکھا تھا' وہ تقریباً پچیس' چھبیس برس کی ہوگی' خاصی خوبصورت تھی لیکن اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر تھا جسے میں ٹھیک لفظوں میں نہیں بتا سکتا۔ اُس کے خوبصورت ہونٹوں پر گہری نارنجی رنگ کی لپ اسٹک بھی بڑی عجیب سی ہی لگ رہی تھی۔ اُس کا برتاؤ بھی مجھے غیر فطری سا لگ رہا تھا۔ میں اور جہانگیر بڑے خلوص سے اس کی مدد کر رہے تھے مگر ہمیں لگ رہا تھا کہ ہمارے لیے اس لڑکی کے دل میں کچھ شک ہے۔ چائے کے خاتمے پر جب جہانگیر گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لیے باہر نکلا تھا تو میں نے لڑکی سے پوچھا تھا۔ ''تمہیں پیسوں وغیرہ کی ضرورت تو نہیں ہے؟''

''نہیں..... میرے پاس کافی پیسے ہیں.....'' اس نے بہت روکھائی سے کہا تھا اور میرا شکریہ ادا کیے بغیر باہر نکل گئی تھی۔

اُن دونوں کے جانے کے بعد میں نے سب دروازے بند کیے تھے اور اپنے کمرے میں جا کر سونے کی تیاری کرنے لگا تھا کہ میرے ذہن میں یہ سوچ جاگی تھی کہ آخر وہ لڑکی کون تھی؟ اور رات گئے اس سنسان مقام پر کیوں اور کہاں سے آ رہی تھی؟ میرے دل میں نجانے کیوں اس لڑکی کے متعلق ایک شک سا پیدا ہوگیا تھا۔ وہ اپنی گاڑی اس بنگلے کے گیراج میں چھوڑ گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اُس گاڑی کو ذرا ٹھیک سے ایک بار چیک کر لینا بہتر ہوگا اس لیے میں نے پھر گیراج کی چابی اٹھائی اور باہر کی جانب چل دیا تھا۔

باہر بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہوا بھی بند ہوگئی تھی۔ رات بالکل اندھیری تھی۔ گیراج میں کیونکہ روشنی کے لیے بلب وغیرہ نہیں تھا اس لیے میں ایک موم بتی اور ماچس ساتھ لے گیا تھا۔

یہ گیراج زیادہ بڑا نہیں تھا' اس میں بمشکل ایک ہی کار کھڑی کرنے کی گنجائش تھی۔ میں نے موم بتی کی روشنی میں کار کا پچھلا دروازہ کھولنے کے لیے

www.pdfbooksfree.pk

ہینڈل کو دبایا ہی تھا کہ یوں لگا کہ جیسے کسی چیز کو اندر سے کسی نے دھکا دیا ہو' دروازہ زور سے کھل گیا تھا اور اس میں سے کوئی چیز نکل کر بالکل میرے اوپر آ گری تھی۔ اس چیز کے دھکے سے میں دیوار سے جا ٹکرایا تھا اور میرے ہاتھ سے موم بتی بھی گر گئی تھی جو گرتے ہی بجھ گئی تھی۔ خود پر گرنے والی چیز کو میں نے ذرا ٹٹول کر دیکھا تھا تو مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ کوئی لاش ہے' کسی آدمی کی لاش جس کی مونچھیں بھی تھیں کیونکہ میرا ہاتھ اس کے مونچھوں والے چہرے پر ہی پڑا تھا۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے لاش کو دھکیل کر کار کے اندر کیا تھا اور کسی نہ کسی طرح دروازہ بند کر دیا تھا پھر کافی دیر اندھیرے میں کار کے نیچے ٹہلنے کے بعد مجھے بجھی ہوئی موم بتی اور ماچس کی ڈبیا مل گئی تھی۔ میں نے اسے دوبارہ جلایا تھا۔ لاش کی صورت گاڑی میں موجود وہ مرد بہت لمبا تھا' اندازِ چھوٹ سے بھی لمبا' وہ بہت دبلا پتلا اور سانولہ تھا' اس کا چہرہ بالکل مرجھایا ہوا تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لیا تو یہ پتہ چلنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کی موت کسے واقع ہوئی تھی۔ اس کی کمر میں گولی ماری گئی تھی' گولی کا سوراخ اس کی پیٹھ میں دائیں بازو کے نیچے دکھائی دیا' گولی باہر نہیں نکلی تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھیپھڑے میں کہیں اٹک گئی تھی۔

تلاش کے باوجود مجھے اس کی جیب میں کسی طرح کا کوئی کاغذ نہیں ملا تھا کہ اس کی شناخت کا پتہ چل سکے۔ ہاں' اس کے قریب سیٹ پر رکھے منی بیگ میں ہزار ہزار کے نوٹ موجود تھے۔ یہ سب دیکھ کر میرا دماغ چکرا کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ آخر اسے کس نے قتل کیا تھا؟ اتنا تو صاف ظاہر تھا کہ وہ لڑکی اب تک اس لاش کے ساتھ اس کار میں شہر کے باہر گھومتی رہی ہوگی اور شاید اسی نے اس کا قتل بھی کیا ہو..... مگر اب تو وہ جا چکی تھی اور میں ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پولیس کو اس معاملے کی خبر دوں گا پھر میں نے صبح تک انتظار کرنے کے خیال سے گیراج کا دروازہ بند کر دیا تھا اور اسے تالا لگائے بغیر اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا تھا۔

کروٹیں بدلتے صبح ہو گئی تھی۔ میں پولیس سے رابطہ کرنے سے پہلے ایک بار پھر گیراج میں گیا تھا لیکن گیراج کا دروازہ کھولتے ہی جیسے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں' گیراج خالی تھا' وہاں کچھ نہیں تھا نہ کار نہ ہی لاش..... گیراج کے فرش پر جہاں رات کو موم بتی گری تھی' وہاں موم کی بوندیں جمی ہوئی تھیں اور کہیں کوئی نشان نہیں تھا۔ اس صورتِ حال کے بعد صرف دو ہی باتیں ممکن تھیں یا تو رات میں اس لڑکی کے بھیجے ہوئے لوگ وہ کار نکال کر لے گئے تھے یا پھر میں شاید بیوی سے گفتگو کے بعد بستر پر لیٹے لیٹے اونگھ گیا تھا اور میں نے وہ لڑکی اور اس سے متعلق سب معاملہ خواب میں دیکھا تھا لیکن پھر فوراً ہی مجھے یاد آیا کہ میں نے تو خود ان لوگوں کے لیے چائے بنائی تھی' انہیں پلائی تھی اور چائے کے خالی کپ وہیں ڈرائنگ روم میں ٹیبل پر پڑے رہنے دیئے تھے۔ میں فوراً ڈرائنگ روم میں گیا تھا' چائے کے خالی کپ وہیں موجود تھے۔ اس کا مطلب' وہ سب خواب نہیں تھا' وہ لوگ رات میں کسی وقت کار گیراج سے نکال کر لے گئے تھے۔

دوسری صبح میں سیدھا پولیس اسٹیشن جا پہنچا تھا اور تمام واقعہ ڈیوٹی پر موجود افسر کو کہہ سنایا تھا۔ وہ قدرے حیرانی اور دلچسپی سے میری باتیں سنتا رہا تھا پھر اس نے میرے بارے میں' میرے دفتر اور ہوٹل وغیرہ سے تسلی کر کے مجھے جانے دیا تھا۔

پولیس والے اپنے کام میں بڑے ماہر ثابت ہوئے تھے' انہوں نے دوسرے دن اس واردات اور مجرم کے بارے میں پتا لگا لیا تھا اور اس لڑکی کی شناخت کے لیے مجھے پولیس اسٹیشن طلب کیا تھا۔ میں اُس وقت ڈیوٹی افسر کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک پولیس والا بڑی موٹی سی فائل لے کر اندر آیا تھا اور وہ فائل اس نے ڈیوٹی آفیسر کے سامنے رکھ دی تھی۔ ڈیوٹی آفیسر نے اس لڑکی کا نام شہناز بتاتے ہوئے ایک فوٹو مجھے دکھایا تھا' وہ تصویر اسی لڑکی کی تھی۔ میں نے اسے فوراً ہی پہچان لیا تھا۔

ڈیوٹی آفیسر نے مجھے بتایا تھا کہ وہ لڑکی ایک عادی مجرم تھی اور اپنے شروع کے دنوں میں وہ شاپنگ مال وغیرہ سے مختلف چیزیں چرانے کے جرم میں کئی بار پکڑی بھی جا چکی تھی۔ اس کے بعد وہ مجرموں کے ایک گروہ میں شامل ہو گئی تھی اور پھر مجرموں کے وہ مختلف گروپس کے ایک مسلح تصادم کے دوران میں اُس لڑکی کے ساتھی کو گولی مار دی گئی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کی لاش کو کار میں لیے وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب تو ہو گئی تھی لیکن اس کی کار شہر کے باہر کسی مقام پر خراب ہو گئی تھی۔ اس لڑکی شہناز نے لاش کے ساتھ اس کار کو ایک بنگلے کے گیراج میں چھپا دیا تھا اور خود کسی دوسری کار میں لفٹ لے کر شہر کے لیے چل دی تھی لیکن وہ شہر تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ راستے میں تیز رفتاری کے باعث وہ کار حادثے کا شکار ہو کر الٹ گئی تھی اور وہ ڈرائیور کے ساتھ جس کا نام جہانگیر تھا' جائے حادثہ پر ہی ہلاک ہو گئی تھی.....

ڈیوٹی آفیسر کی زبانی یہ تمام کہانی سن کر میں نے انتہائی تعجب سے کہا تھا۔ ”لیکن آپ کو یہ سب اتنی جلدی کیسے معلوم ہو گیا؟ یہ واقعہ کل رات ہی تو پیش آیا ہے؟“

خواب نگر

ہم بھی
رت جگوں کی رُت میں
ترے خواب نگر
میں گھوما کرتے تھے
اور جن منظروں سے
آنکھیں زخمی ہوتی تھیں'
ہم وہ منظر
پلکوں سے چوما کرتے تھے

اشعر جواد..... کراچی

”کل رات پیش آیا ہے؟ آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہے؟ جو واقعات آپ نے سنائے ہیں' ان کو گزرے ہوئے تو بارہ سال ہو گئے ہیں؟“

•.....•.....•

آج میں اپنی بیوی اور شادی شدہ بچوں کے ساتھ ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوں لیکن برسہابرس پہلے پیش آنے والے اس واقعے کو آج تک نہیں بھولا ہوں اور یہ بات بھی اپنی جگہ طے شدہ حقیقت ہے کہ وہ واقعہ میرا کوئی خواب یا خیال نہیں تھا کیونکہ میرے پاس وہ چائے کا خالی کپ آج بھی موجود ہے اور محفوظ ہے جس میں اس لڑکی شہناز نے چائے پی تھی اور اس پر موجود نارنجی لپ اسٹک کا نشان تو کسی پانی' صابن یا کیمیکل سے دھونے کے باوجود صاف نہیں ہوا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

نسرین رانا

چالیس دن بعد

رسا چغتائی کا خیال

جسے سمجھا نہیں شاید کسی نے
میں اپنے عہد کا وہ سانحہ ہوں

چلہ کاٹنے والے ایک شخص کے ساتھ پیش آنے والا عبرت اثر قصہ عجب



یہ اُن دنوں کی کہانی ہے جب میں بہت چھوٹی تھی اور اکثر نانی کے گھر جایا کرتی تھی۔ نانی کے گھر میں مجھے بہت مزہ آتا تھا کیونکہ وہاں خالائیں بھی ہوتی تھیں، ماموں بھی تھے اور نانا بھی۔ وہ سب مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ نانی کا گھر بلال کالونی، کراچی میں تھا۔ اُن دنوں اس علاقے میں نہ تو بجلی تھی اور نہ ہی گیس۔

نانی کے گھر کے سامنے بہت بڑی کھلی جگہ تھی جہاں باڑھ لگا کر نانی نے سبزیاں وغیرہ لگائی ہوئی تھیں۔ اسی میں ایک طرف درخت پر جھولا بھی ڈالا ہوا تھا۔ نانی نے کچھ بکریاں بھی پالی ہوئی تھیں اُن کا ٹھکانہ بھی یہی کھلی جگہ تھی۔ دن بھر یہ بکریاں باہر اس کھلی جگہ میں ٹہلتی رہتیں اور رات میں انہیں گھر میں ایک طرف باندھ دیا جاتا تھا۔ اس کھلی ہوئی جگہ کے بالکل سامنے ایک قبرستان بھی تھا۔

مجھے جھولا جھولنے کا بہت شوق تھا میں جب بھی نانی کے گھر جاتی زیادہ تر وقت جھولا جھولتی تھی۔ نانی ویسے تو کسی بات میں روک ٹوک نہیں کرتی تھیں، بس دوپہر کے وقت جھولا جھولنے کو منع کرتی تھیں۔

اگر میں دوپہر کے وقت باہر ہوتی تو کہتیں۔ ”جلال کا وقت ہے گھر میں آجاؤ سامنے قبرستان ہے۔“

ایک روز میں معمول کے مطابق تنہا جھولا جھولنے میں مگن تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ جھولتے جھولتے اچانک مجھے لگا جیسے میرے پیچھے کوئی آ کھڑا ہوا ہو اور مجھے جھولا جھولنے میں مدد دے رہا ہو۔ آہستہ آہستہ میرے جھولے کی رفتار تیز ہونے لگی تو میں چیخی۔ ”کون ہے؟“ مگر پیچھے سے کوئی جواب نہ آیا بلکہ جھولے کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی کہ میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے جھولے کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ اگر میں رسی چھوڑ دیتی تو بہت بری طرح زمین پر گرتی۔ اب میں نے باقاعدہ تیز آواز میں رونا اور چلانا شروع کر دیا تھا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے جھولا تھام لیا اور جھولا یکدم رک گیا۔

”کیا ہوا ہے بی؟“ ماموں کی آواز کانوں میں آئی۔ میں فوراً جھولے سے اتر گئی۔ ماموں مجھے اندر لے گئے۔ اُس وقت میری حالت ایسی تھی کہ خوف کے مارے بولا نہیں جا رہا تھا۔ نانی نے میری حالت دیکھی تو پریشان ہو گئیں۔

”ارے..... کیا ہوا میری بچی کو؟“

”کچھ نہیں اماں.....! یہ باہر جھولا جھولتے ہوئے چلا رہی تھی اور جھولا بھی بہت تیز تیز ہل رہا تھا۔ اگر میں فوراً نہیں جاتا تو یہ جھولے سے گر کر زخمی ہو جاتی۔“ ماموں نے بتایا۔

”ہزار دفعہ کہا ہے دوپہر میں اکیلی باہر نہیں جایا کر؟“ نانی نے مجھے آغوش میں لیتے ہوئے ڈانٹا تھا۔ میں دو دن تک بخار میں تپتی رہی تھی اور اس دوران نانی نے کتنے ہی مولویوں سے مجھ پر دَم کروایا تھا اور اس دن کے بعد میں نے دوپہر کے وقت باہر نکلنے سے توبہ کر لی تھی۔ ان ہی دنوں جبکہ میں اس حادثے سے تازہ تازہ سنبھلی تھی تو ایک رات نانی نے اسی علاقے میں ہونے والے ایک پراسرار واقعہ کے بارے میں بتایا تھا۔ اس وقت نانی کے گھر میری امی اور میری خالائیں بھی موجود تھیں۔ دراصل ان دنوں میری چھوٹی خالہ کو وظیفے پڑھنے کا شوق چرایا تھا۔ وہ پنج وقتہ نمازی تو تھیں۔ نانی نے انہیں ایسا کرنے سے منع کرتے ہوئے کہا تھا۔

”ایسے وظیفے نہیں کرتے ہیں۔ صحیح نہیں ہوتا۔“ نانی نے چھوٹی خالہ سے کہا تھا۔ اس وقت میں نانی کے پاس ہی بیٹھی تھی۔

”جانتی ہو، مسجد کے پاس والے گھر میں جو عورت رہتی ہے اس کے شوہر نے چلہ کاٹا تھا؟

www.pdfbooksfree.pk

چالیس دن تک وہ اپنے گھر میں بنے تہ خانے میں رہا تھا۔ اکیلا رات دن وہ وہیں رہتا تھا۔ بیوی کو بھی تہ خانے میں آنے سے منع کر دیا تھا۔ بیوی بس کھانا دینے جاتی تھی مگر تہ خانے میں اندر نہیں جا سکتی تھی۔ دروازے کے نیچے سے کھانا آگے کر دیتی تھی۔ وہ معلوم نہیں، کس وقت اٹھاتا تھا؟ چالیس دن تک وہ شخص نہ کسی سے ملا اور نہ ہی بات کی، بس تنہا تہ خانے میں چلہ کاٹنے میں مصروف رہتا تھا۔" اتنا کہہ کر نانی خاموش ہو گئیں۔

"پھر کیا ہوا اماں؟" تھوڑی دیر بعد امی نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا، اس کے چلے میں کوئی غلطی ہو گئی اور پھر وہ تہ خانے سے باہر نہیں آیا....."

"اچھا؟" چھوٹی خالہ کے منہ سے حیرت کے مارے نکلا۔

"کیوں باہر نہیں آیا؟" بڑی خالہ نے بھی تجسس سے پوچھا۔

"وہ یوں کہ اس نے چلہ شروع کرتے وقت اپنی بیوی سے کہا تھا کہ چالیس دن بعد میں خود باہر آؤں گا۔ اس وقت تک مؤکل میرے قبضے میں آ جائیں گے مگر چالیس دن سے زیادہ گزر گئے اور وہ باہر نہیں نکلا تو اس کی بیوی پریشان ہو گئی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ تہ خانے میں جا کر دیکھے مگر پھر اسے شوہر کی ہدایت یاد آ گئی کہ چلے کے دوران تہ خانے میں نہیں آنا، سو اس خیال کے تحت کہ کہیں چلہ خراب نہ ہو جائے، وہ تہ خانے میں نہیں گئی مگر کب تک؟ دن گزرتے رہے تو فکر بڑھنے لگی۔ آخر شوہر تھا اور ایک دن وہ کچھ سوچ کر تہ خانے کے پاس گئی تو اسے شدید بو محسوس ہوئی، ایسا لگ رہا تھا جیسے گوشت سڑ گیا ہو..... وہ پریشان ہو گئی، کیا کرے پھر بدبو آہستہ آہستہ پورے گھر میں پھیلنے لگی۔ آخر مجبور ہو کر اس نے محلے والوں کو بلوایا۔ جب لوگوں نے تہ خانہ کھولا تو ایک دلدوز منظر سامنے تھا۔ تہ خانہ بدبو سے بھک رہا تھا۔ جو لوگ اندر داخل ہوئے انہوں نے فوراً اپنی ناک پر کپڑے رکھ لیے۔ تہ خانے میں وہ شخص موجود نہیں تھا بلکہ ایک طرف ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ اسی شخص کا ڈھانچہ ہے جو نہ جانے کب کا مر چکا تھا۔ اسی وقت پولیس کو خبر کر دی گئی۔ پولیس آئی تو تفتیش شروع ہوئی۔ بیوی سے پوچھ گچھ ہوئی تو اس نے ساری بات صاف صاف بتا دی کہ اس کا شوہر مؤکل قبضے میں کرنا چاہتا تھا مگر جب وہ باہر نہ آیا تو مجھے فکر لگ گئی اور آج جب تہ خانہ کھولا گیا تو یہ ڈھانچہ نکلا ہے..... اس وقت محلے کے مولوی صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس شخص سے چلے میں کوئی غلطی ہو گئی تھی، اسی لیے مؤکل نے اس کا گوشت کھا لیا اور ڈھانچہ چھوڑ دیا۔ پولیس کی ضروری کارروائی کے بعد اس شخص کے ڈھانچے کو دفن کر دیا گیا۔ ڈھانچہ دفنانے کے بعد تہ خانے کی صفائی کروائی گئی، تب کہیں جا کر بدبو ختم ہوئی تھی....."

نانی تو یہ قصہ سنا کر خاموش ہو گئیں اور ہم سب کے چہروں پر خوف نمایاں تھا۔ میرا دل تو ڈر کے مارے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ نانی کی زبانی یہ قصہ سننے کے بعد خالہ نے پھر بھی کوئی وظیفہ پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی البتہ نانی کہتی تھیں۔ "اگر کوئی حاجت ہو تو درود شریف کا وظیفہ بغیر کسی ڈر خوف کے کر لینا چاہیے کہ درود پاک کا ہر عمل صرف اور صرف فائدہ مند ہوتا ہے۔ اس سے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔" نانی کی زبانی بچپن میں سنے ہوئے اس واقعے نے میرے ذہن پر ایسے اثرات چھوڑے ہیں کہ میں نے آج تک بھی کوئی وظیفہ پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ سے بھی عرض ہے کہ بغیر کسی کی رہنمائی میں کسی بھی قسم کا کوئی عمل نہ کریں کیونکہ اس میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے

میرے شہر کی کہانی
شہر کراچی میں جنم لینے والی کہانیوں کا نیا خاص سلسلہ



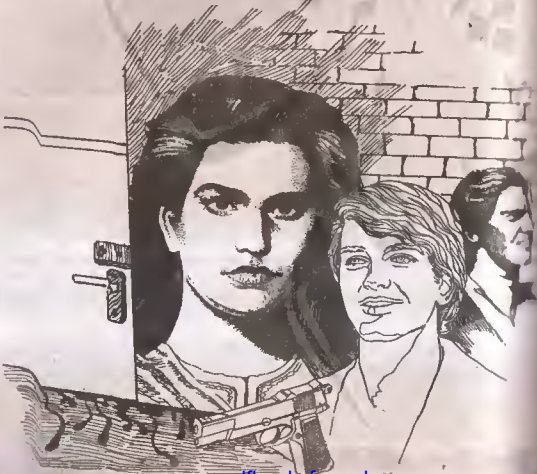
ارم زہرا

انوکھے چہرے لوگ

یاسمین مسیحا کا خیال

عجب ہے یہ تماشہ گاہ عالم
کہ اپنا بھی یہاں اپنا نہیں ہے

ایک فنکار عورت اور ایک نوجوان کی کہانی، ایسے واقعات اب معاشرے کا حصہ بن گئے ہیں



www.pdfbooksfree.pk

"واہ واہ کیا خوبصورت جھمکے ہیں' کتنے کے ہیں؟" شوکیس میں سجے مختلف زیورات میں سے فرحانہ کی نظر سونے کے جھمکوں پر ٹک گئی۔

"بی بی' یہ جڑاؤ ہیں۔" دکاندار نے فرحانہ کی حالت پر نظر دوڑاتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ میلی سی چادر اور ملگجے شلوار قمیص میں وہ پیچی چپل پیر میں پھنسائے گھر میں کام کرنے والی ماسی لگ رہی تھی۔

"عقل کے اندھے..... یہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے کہ یہ جڑاؤ ہیں' پر ہیں کتنے کے؟" فرحانہ نے دانت پیستے ہوئے سامنے بیٹھے قدرے خوش شکل لڑکے کو مخاطب کیا۔

"تیس ہزار کے۔" دکاندار نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

"اتنے مہنگے؟" فرحانہ نے دانتوں میں انگلی دبائی۔

"سونے کا ریٹ آسمان سے باتیں کر رہا ہے بی بی.....!" وہ سخت کوفت کے عالم میں واپس کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

"ارے' ارے دکھا تو دو' لے کر نہیں بھاگ جاؤں گی۔" فرحانہ نے اسے پلٹتے دیکھا تو بے اختیار چیخی۔

"پہلے خریدنے والی تو ہو پھر دکھا بھی دوں گا۔ اب جاؤ بھئی' زیادہ دماغ نہیں خراب کرو۔"

"آ کر تو کہیں کا..... کہہ تو ایسے رہا ہے جیسے دیکھنے کے بھی پیسے لگتے ہوں۔ ایسے جان چھڑا رہا ہے مجھ سے جیسے نظر لگا دوں گی اس کی دکان کو۔" فرحانہ نے ایک قہر آلود نظر دکاندار پر ڈالی اور باہر نکل آئی۔

"کم بخت' اسی کی دکان پر اچھے ڈیزائن نظر آتے ہیں۔ کسی نے صحیح ہی کہا ہے جسے مسکرانا نہیں آتا' اُسے دکان نہیں کھولنی چاہیے۔" وہ رکشے کی طرف بڑھتی ہوئی خود سے محوِ گفتگو تھی۔

"ہاں بھائی' کہاں جانا ہے؟"

"ڈیڑھ سو روپے ہوں گے۔" رکشے والے نے سائیڈ گلاس میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"نیو کراچی سے سرجانی ٹاؤن ڈیڑھ سو روپے؟ کیا سمجھا گیے ہو؟"

"ایک سو تیس میں چلنا ہے تو بیٹھ جاؤ ورنہ اپنی راہ لو۔" رکشے والے نے سگریٹ لبوں میں دباتے ہوئے بے زاری سے کہا۔

"سوئی گورنمنٹ کا بیڑہ غرق ہو' ہر چیز کے دام اتنے بڑھ گئے ہیں کہ بس اب تو اپنا دم نکلنے کی نوبت آ گئی ہے۔" ہاتھ میں پکڑا سبزی کا تھیلا سیٹ پر رکھتی اب وہ خود بھی بیٹھ چکی تھی۔

"بھیا' ذرا تیز چلانا' پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔" رکشا اسٹارٹ ہوتے ہی فرحانہ نے کہا اور پھر اچانک ہی وہ کسی خیال کے تحت چونکی اور موبائل بیگ سے نکال کر نمبر ملانے لگی۔

•.....•.....•

فرحانہ بیگ کو مضبوطی سے بازو کے نیچے دبائے اسی سنار کی دکان پر داخل ہوئی۔ آج اس کے ساتھ ایک سات سال لڑکا بھی تھا۔

"لو یہ آج پھر آ گئی؟" زوہیب نے نعمان کی توجہ فرحانہ کی طرف دلائی۔

"ارے..... تم.....؟" فرحانہ' نعمان کو دیکھتے ہی بے ساختہ بولی۔ "یہ تمہاری دکان ہے؟" اُس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"نہیں' یہ میرے دوست زوہیب کی دکان ہے' میں فیکٹری سے فارغ ہو کے اکثر یہاں اس کے پاس وقت گزارنے کے لیے بیٹھ جاتا ہوں۔"

"اوہ' اچھا....." فرحانہ نے طنزیہ نظر زوہیب کے سراپے پر ڈالی مگر آج وہ خود بھی ٹھیک ٹھاک تیار ہو کر آئی تھی۔ صاف ستھرے لباس پر نفاست سے کیا میک اپ اس کی شخصیت کو نکھار رہا تھا۔

"تم جانتے ہو اسے؟" زوہیب نے نعمان سے آہستگی سے پوچھا۔

"ہاں' یہ میرے ساتھ فیکٹری میں کام کرتی ہیں۔ ہمارے ڈپارٹمنٹ الگ ہیں لیکن میں ان کو آتے جاتے ہوئے اکثر دیکھتا ہوں۔" نعمان نے وضاحت کی۔

"اوہ' اچھا....." زوہیب نے بھرپور نظروں سے فرحانہ کا سراپا جائزہ لیا جو ابھی تک جھمکوں میں ہی گم نظر آ رہی تھی۔

"یہاں جو پسند آئے' آپ مجھے بتا دیں' یہ اپنا یار ہے' آپ سے زیادہ پرافٹ نہیں لے گا۔" نعمان نے فرحانہ کو مخاطب کیا۔

"نہیں بھئی' یہ جھمکے تو واقعی میری رینج سے باہر ہیں۔ آپ مجھے وہ سونے کی بالیاں دکھا دیں۔" وہ دوسری طرف شوکیس میں سجی بالیوں میں سے ایک پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔ زوہیب نے فوراً ہی بالیاں نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیں۔

"ارے' یہ تو بہت ہلکی ہیں۔" فرحانہ خفیف سی ہو گئی۔

"ساڑھے پانچ ہزار کی ہیں یہ محترمہ.....!" زوہیب نے ہنسی لبوں میں دبائی۔

"یہ..... کاغذ جیسی بالیاں..... ساڑھے پانچ ہزار کی؟" وہ ہونق سی اب نعمان کا چہرہ تک رہی تھی۔

"ارے یار' یہ اپنی جاننے والی ہیں' کچھ ڈسکاؤنٹ تو کرو۔" نعمان نے زوہیب کو آنکھ مارتے ہوئے پیار سے سمجھایا۔

"دیکھتا ہوں۔" زوہیب نے بالیاں اپنے سامنے رکھی ویٹ مشین پر رکھ دیں اور پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ "ٹھیک ہے آپ اس کے پانچ ہزار دے دیجیے گا۔"

"پانچ ہزار بھی زیادہ ہیں۔" فرحانہ منہ بناتی ہوئی بولی۔

"جائز لے رہا ہوں آپ سے' یہ تو نعمان کی وجہ سے پانچ سو میں نے چھوڑ دیئے ورنہ یقین کریں اس میں میرا کوئی پرافٹ نہیں ہو رہا۔" زوہیب اب اسٹول پر بیٹھا فرحانہ کے فیصلے کا منتظر تھا۔ "ارے' آپ اچھی طرح سوچ لیجیے' جب تک میں آپ کے لیے کولڈ ڈرنک منگواتا ہوں۔" نعمان کولڈ ڈرنک کا کہنے کے لیے شاپ سے نکل گیا جبکہ فرحانہ کی نظریں گھوم پھر کر انہی گولڈ کے جھمکوں پر جا رہی تھیں۔

"چلیے ٹھیک ہے' یہ بالیاں ہی دے دیجیے۔" فرحانہ نے بادل نا خواستہ جواب دیا۔ اتنی دیر میں کولڈ ڈرنک بھی آ گئی۔

"یہ لیجیے آپ کی بالیاں۔" چھوٹے سے سرخ مخملی ڈبے میں زوہیب بالیاں سیٹ کرتا اب فرحانہ کی طرف بڑھا چکا تھا۔

"احتیاط سے رکھیے گا' آج کل کچھ پتا نہیں۔" نعمان نے کولڈ ڈرنک فرحانہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے بچے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں' یہ تو ہے۔" فرحانہ نے بیگ کی اندرونی جیب سے پیسے نکال کر زوہیب کے حوالے کیے اور بالیوں کو احتیاط سے بیگ میں رکھنے لگی۔

•.....•.....•

"ارے' آپ کہاں غائب ہیں؟ کیسے ہیں؟ میں کافی دن سے آپ کی تلاش میں ہوں۔" گارمنٹس فیکٹری کے مین گیٹ پر فرحانہ نے نعمان کو دیکھتے ہی ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں' آپ سنایئے' سب خیریت تو ہے ناں؟" نعمان متعجب سا بولا۔

"وہ..... اصل میں مجھے جیولری کی دکان والے زوہیب کا نمبر چاہیے۔" فرحانہ نے جلدی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

www.pdfbooksfree.pk

"خیریت' زوہیب کا نمبر کیوں؟" نعمان کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"اُفوہ' دو دفعہ موصوف کی دکان پر گئی ہوں مگر دونوں دفعہ ہی بند ملی۔ سوچا' اب فون کر کے جاؤں تو بہتر رہے گا۔" فرحانہ نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"دکان جمعے کے علاوہ تو کھلی رہتی ہے۔ خیر' میں دیتا ہوں نمبر۔" نعمان نے موبائل جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں' پلیز..... آپ کی مہربانی ہوگی ورنہ سرجانی ٹاؤن سے ٹیکسی کا پی جانا سخت کوفت میں مبتلا کر دیتا ہے۔"

"یہ لیجیے' نوٹ کیجیے۔" نعمان نمبر بتانے لگا اور فرحانہ تیزی سے وہ نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کرنے لگی۔

"ویسے آپ کا دوست بڑا اکڑو قسم کا ہے۔" فرحانہ منہ بناتے ہوئے موبائل بیگ میں رکھتے ہوئے بولی۔

"شادی نہیں ہوئی نا' اس کی جبھی اتنی اکڑ ہے۔" نعمان ہنستے ہوئے بولا۔

"اکڑ تو اس کی اب میں نکالوں گی....." فرحانہ نے آہستگی سے کہا اور شوخی سے مسکرادی۔ نعمان اپنے راستے پر چل دیا جبکہ فرحانہ تو کسی اور ہی دنیا کی سیر کے لیے نکل چکی تھی۔

.....•.....•.....

"اللہ..... موبائل سیٹنگ سسٹم بنانے والوں کو سلامت رکھے۔" فرحانہ نے زوہیب کا نمبر 'فرینڈز اینڈ فیملی لسٹ' میں فیڈ کرتے ہوئے کہا اور فوراً ہی زوہیب کے نمبر پر کال ملائی۔ دوسری طرف سے زوہیب نے فوراً ہی کال ریسیو کرلی۔

"کیسے مزاج ہیں آپ کے؟" فرحانہ نے بڑی ادا سے کہا۔

"جی' آپ کون؟" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"آپ کی عاشق....." ایک قہقہے کے ساتھ فرحانہ بولی۔

"آپ کی فضول باتوں کے لیے میرے پاس فالتو وقت نہیں....." زوہیب نے یہ کہہ کر لائن کاٹ دی۔

"اوئے ہوئے..... یہ تو پکا اخروٹ ہے..... تو پٹنے والا نہیں لگتا ہے' اس کے آگے اپنا ہی سر پھوڑنا پڑے گا۔" فرحانہ نے دانت پیستے ہوئے کہا مگر ہمت نہیں ہاری اور ایک بار پھر زوہیب کا نمبر ملا بیٹھی۔ کال ریسیو ہو چکی تھی۔

"زوہیب..... پلیز..... لائن نہیں کاٹیے گا۔" وہ رندھی ہوئی آواز بناتے ہوئے بولی۔

"آپ آخر ہیں کون؟" اپنا نام سنتے ہی زوہیب بات کرنے پر مجبور ہوگیا۔

"آپ جانتے ہیں مجھے لیکن بس....."

"لیکن بس کیا.....؟" زوہیب نے سوال کیا۔

"یہی کہ میرے دل کا حال نہیں جانتے؟" فرحانہ محبت بھرے لہجے میں بولی۔

"سنائیے اپنے دل کا حال....." زوہیب کے لہجے میں بے زاری تھی۔

"زوہیب' میں جب سے آپ سے ملی ہوں' آپ کو بھول نہیں پا رہی۔ آپ کی شخصیت میں جادو ہے' شاید میں اسی لیے بار بار آپ کی طرف کھنچ رہی ہوں۔" وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ دماغ سے سرک کر ہوا میں تحلیل ہوگیا ہو۔

"آپ کی مجھ سے کب ملاقات ہوئی تھی؟" زوہیب بے اختیار سوال کر بیٹھا۔

"جب میں آپ سے ملوں گی تو آپ جان جائیں گے۔" فرحانہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"آپ شاید کچھ غلط سمجھ رہی ہیں' میرا مطلب ہے' آپ جس سے ملی ہیں' وہ میں نہیں ہوں۔"

"آپ کا گول چہرہ ہے ناں؟ اور داڑھی مونچھیں بھی ہیں؟" فرحانہ نے بھی فوراً اپنی تسلی کرنا چاہی۔

"ارے..... یہ تو مردوں کی شان ہے' ہر دوسرا مرد داڑھی اور مونچھوں میں ہی نظر آتا ہے۔" زوہیب ہنستے ہوئے بولا۔

"بے وقوف....." فرحانہ آہستگی سے بولی۔

"شاید آپ خود ہی بے وقوف بن گئیں۔" زوہیب زور سے ہنسا۔

"آپ کی سندھی ہوٹل کے پاس سنار کی دکان ہے ناں؟" فرحانہ کا لہجہ خاصا مضبوط تھا۔

"جی ہاں....." زوہیب نے بے اختیار کہا۔

"پھر میں بے وقوف نہیں ہوں لیکن ہاں' آپ سے پہلی ہی نظر میں پیار کرنے کی بے وقوفی کر چکی ہوں....." یہ کہتے ہی فرحانہ نے لائن کاٹ دی اور زور زور سے قہقہے لگانے لگی۔ "مسٹر زوہیب..... اب تم پھنس گئے ہو' اس نمبر پر تمہاری کال خود ہی آئے گی۔" شوخی اور مسکراہٹ سے کھیلتے اس کے لب بے ساختہ موبائل کی اسکرین چومنے لگے۔

.....•.....•.....

دوسرے دن ٹھیک بارہ بجے فرحانہ کا موبائل بجا' زوہیب کا نام اسکرین پر بلنک کر رہا تھا۔

"اوہو..... ظاہری اکڑ تھی..... اب آیا نا' لائن پر....." فرحانہ نے تیزی سے کال ریسیو کرلی۔

"بہت ناراض ہوں آپ سے' کچھ نہیں سنوں گی اور ہاں' آیندہ مجھ بے وقوف کے نمبر پر کال کرنے کی ضرورت نہیں....." یہ کہہ کر فرحانہ نے لائن کاٹ دی۔ "بے وقوف تو اب میں تمہیں بناؤں گی....." فرحانہ نے ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ موبائل الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔ موبائل پھر بجنے لگا۔

"کیوں تنگ کر رہے ہیں آپ مجھے؟" فرحانہ ناراض سے لہجے میں بولی۔

"ارے..... آپ تو واقعی ناراض ہیں کہ کچھ بھی سنے بنا لائن کاٹ دیتی ہیں؟" دوسری طرف سے زوہیب کی آواز آئی۔

"ٹھیک ہے' اب لائن نہیں کاٹ رہی' کہیے' کیا کہنا چاہتے ہیں؟" فرحانہ اپنی ہنسی دباتے ہوئے گویا ہوئی۔

"آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟"

"آپ کے وزیٹنگ کارڈ سے....." ابھی وہ آگے کچھ بولتی کہ زوہیب بول اٹھا۔

"میرے وزیٹنگ کارڈ پر میرا سیل نمبر نہیں ہے' صرف شاپ کا پی ٹی سی ایل نمبر ہے۔"

"چلیے' اس سے کیا فرق پڑتا ہے' بس میں آپ تک پہنچ گئی' یہی میرے لیے باعثِ خوشی ہے مگر افسوس آپ خواتین کا احترام کرنا نہیں جانتے۔ اُن کے احساسات کی آپ کو بالکل قدر نہیں۔" وہ بگڑے لہجے میں بولی۔

"اچھا ناں' اگر میری وجہ سے آپ کا دل برا ہوا تو سوری..... سوری میں کبھی کسی سے نہیں کہتا لیکن آپ سے کہہ رہا ہوں۔" زوہیب نے برق رفتاری سے اپنی بات مکمل کی۔

"اچھا' ایک شرط پر آپ کا سوری منظور ہوگا۔"

"کون سی شرط؟"

"آپ کو مجھ سے ملنا ہوگا۔" فرحانہ اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"ہاں' ملنا تو میں بھی آپ سے چاہ رہا ہوں۔" زوہیب کے لہجے میں بھی جلد بازی تھی۔

"آپ نے میری شاپ تو دیکھی ہے ناں' بس

www.pdfbooksfree.pk

اسی لائن میں آگے ایک آئس کریم پارلر ہے' ہم وہیں کل ملتے ہیں۔" زوہیب نے کہا۔

"ٹھیک ہے' میں آجاؤں گی۔"

"مگر میں آپ کو پیسوں کا کیسے؟"

"میں گرین سوٹ میں آؤں گی۔" فرحانہ ہولے سے بولی۔

"ٹھیک ہے' باقی باتیں پھر میں آپ سے کل مل کر کروں گا لیکن یاد رہے' ٹھیک پانچ بجے۔"

"جی' ٹھیک ہے۔" فرحانہ کے ہامی بھرتے ہی زوہیب نے لائن کاٹ دی۔

"یہ ہوئی نا بات' زبردست فرحانہ.....! تم بالکل صحیح جارہی ہو۔"

.....•.....•.....

آئس کریم پارلر کے ماحول سے بے نیاز' زوہیب' فرحانہ کا منتظر تھا۔ پانچ سے چھ اور چھ سے سات بجنے کو آئے تھے مگر فرحانہ نہ تو کال ریسیو کررہی تھی اور نہ ہی خود آئی تھی۔ زوہیب آئس کریم پارلر میں بیٹھے جوڑوں کو دیکھتا رہا تو کبھی آنے والی لڑکیوں میں گرین رنگ کے کپڑوں میں ملبوس لڑکی کو کھوجتا رہا۔ بالآخر تنگ آکر وہ واپس دکان پر آگیا۔

"سب خیریت تو ہے ناں؟" نعمان نے اس کے لٹکے ہوئے منہ کو دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں یار' بس..... جس کام کے لیے گیا تھا' وہ ہوا نہیں۔" زوہیب نے اپنی کنپٹی دباتے ہوئے کہا۔

"چلو یار' ہوتا ہے کبھی کبھی' غم نہیں کرو پھر میں نکلوں؟ گھر پر سب میرا انہیں جانے کے لیے انتظار کررہے ہیں۔" نعمان کے جاتے ہی زوہیب کی انگلیاں مستقل موبائل کی key پر لیس کررہی تھیں کہ اچانک ہی کال ریسیو کرلی گئی۔

"آئیں کیوں نہیں؟ میں نے کتنا انتظار کیا؟" زوہیب خاصا برہم تھا۔

"سوری زوہیب' ایک ایمرجنسی ہوگئی تھی' میری پڑوس والی آنٹی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ سچ' میں تو بالکل ڈر گئی تھی۔" فرحانہ بے ساختہ رونے لگی۔

"ارے پلیز' اب رونا بند کرو۔" زوہیب یکدم نرم پڑ گیا۔

"شکر ہے' میری آنٹی بچ گئیں' مجھے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔"

"اچھا....." زوہیب نے اسی پر اکتفا کیا۔

"بالکل اتنی ہی عزیز جیسے آپ۔" فرحانہ کی سرسراتی آواز زوہیب کی سماعت سے ٹکرائی۔

"آپ سچ کہہ رہی ہیں؟" زوہیب کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"آپ مجھے فرحانہ کہہ کر بلائیں' کیا آپ آپ لگا رکھی ہے؟ اور میں جھوٹ نہیں بولتی۔"

"اب کیسی ہیں آپ کی آنٹی؟" زوہیب اب قدرے پرسکون تھا۔

"اب کافی بہتر ہیں۔ اچھا' میں آپ سے لیٹ نائٹ بات کروں گی' ابھی تھوڑا مصروف ہوں۔" فرحانہ نے کمال مہارت سے بہانہ بنایا اور لائن کاٹ دی۔

"ہا.....ہا.....ہا.....زوہیب' تم میرے انتظار میں صرف میرے بارے میں ہی سوچ رہے ہو گے۔ میں یہی تو چاہ رہی تھی' اب تمہاری مجھ سے ملنے کی تڑپ ہی مجھے مزہ دے گی۔ ایکسیڈنٹ تو بہانہ تھا زوہیب' اب تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے....." فرحانہ کے چہرے پر انوکھی خوشی کی حدت تھی۔

.....•.....•.....

"یار زوہیب' سب خیریت تو ہے ناں؟ میں دو تین دن سے تمہیں پریشان دیکھ رہا ہوں؟" نعمان

نے زوہیب کو کریدنا چاہا۔

"کچھ خاص نہیں' بس ایسے ہی ایک پرسنل مسئلہ ہے۔ انشاء اللہ' جلدی حل ہوجائے گا۔" زوہیب نے آہستگی سے کہا۔

"اچھا پھر میں نکلتا ہوں' تم فون پر مجھ سے رابطہ رکھنا' ویسے بھی سونے کی بڑھتی قیمت کے باعث کوئی گاہک تو ہے نہیں۔"

"ارے' یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے' یار زندہ' صحبت باقی۔ میں ہوں ناں' تیرے ساتھ' دیکھ لوں گا۔" نعمان نے زوہیب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

نعمان کی روانگی کے ذرا دیر بعد ہی موبائل پر فرحانہ کی کال آئی تھی۔ زوہیب نے فوراً کال ریسیو کی تھی۔

"کیا بات ہے' آج آواز میں وہ جوش نہیں؟" فرحانہ نے زوہیب کی آواز سنتے ہی کہا تھا۔

"بس طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے' سر میں درد ہے میرے۔" زوہیب کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"میرے پاس آجائیں' میں آپ کا سر دبا دوں۔"

"جی نہیں' میں ٹھیک ہوں' ابھی پونسان لوں گا تو بالکل فٹ ہوجاؤں گا۔" زوہیب کے بوکھلائے جواب پر فرحانہ زور سے ہنس دی۔

"زوہیب' آپ کا دل نہیں چاہتا جب آپ کی ایسی کیفیت ہو تو کوئی آپ کا سر دبائے؟ پیار سے آپ کا سر اپنے کاندھے پر رکھ کر آپ کے بال سہلائے؟"

"ہوں....." زوہیب ہوں پر اکتفا کیے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو سن رہا تھا۔

"اف زوہیب' میرا تو دل کرتا ہے....." وہ اتنا ہی کہہ کر خاموش ہوگئی۔

"تمہارا دل کیا کرتا ہے؟" زوہیب بے چین ہوچکا تھا۔

"کچھ نہیں' رہنے دیں' مجھے شرم آرہی ہے۔"

"پھر بھی کہو تو....." زوہیب اصرار کررہا تھا۔

"مجھے آپ سے ملنا ہے زوہیب' کتنے دن ہوگئے آپ کو دیکھا ہی نہیں؟" فرحانہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

"ملو نا مجھ سے؟ مجھے خود تمہیں دیکھنا ہے۔ عجیب آگ میں جل رہا ہوں۔ تمہاری باتوں نے مجھے امیر کیا ہوا ہے' ایسا لگتا ہے' تم سے جنم جنم کا رشتہ ہے۔" زوہیب مدہوشی کی سی کیفیت میں بولتا چلا جارہا تھا جبکہ فرحانہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ خوشی سے چلانیں لگائی۔

"مجھے فائیو اسٹار ہوٹل دیکھنے کا شوق ہے' آپ کبھی گئے ہیں وہاں؟" فرحانہ بے ساختہ دل کی بات زبان تک لے آئی۔

"ہاں' جا چکا ہوں' چلنا ہے وہاں میرے ساتھ؟"

"ہوں....." فرحانہ نے آہستگی سے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے' کل چلتے ہیں۔"

"کیا سچ؟" فرحانہ کی آواز میں خوشی اور شوخی آگئی۔

"ہاں بھئی' تم میری دکان تک پہنچو پھر وہاں سے ٹیکسی کرلیں گے۔" زوہیب نے دوسرے دن کا پروگرام بناتے ہوئے کہا۔

"اوہ' آئی لو یو سو مچ زوہیب.....!" فرحانہ نے اتنے زور سے کہا کہ زوہیب ایک پل کے لیے موبائل کان سے دور کرنے پر مجبور ہوگیا۔

"پاگل ہو بالکل....." زوہیب اُس وقت ہواؤں میں اڑ رہا تھا اور خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان تصور کررہا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

ٹیکسی جیسے ہی زوہیب کی دکان کے سامنے رکی' وہ بھی سنوری فرحانہ کو دیکھ کر بے ساختہ بولا۔ "اوہ ہو..... تو تم ہو؟"

"کیوں' میں اچھی نہیں ہوں کیا؟" فرحانہ نے خفگی سے سائیڈ ڈور کھولتے ہوئے کہا۔

"نہیں' اچھی ہو لیکن باتیں زیادہ اچھی کرتی ہو۔ یہ کون ہے؟" فرحانہ کے ساتھ ایک سات سالہ بچے کو دیکھتے ہوئے زوہیب نے پوچھا۔

"یہ میرا سب سے چھوٹا بھائی ہے' مجھ سے بہت پیار کرتا ہے بلکہ میرے بغیر نہیں رہتا اس لیے میں ہمیشہ اسے اپنے ساتھ ہی رکھتی ہوں۔" فرحانہ نے مفصل معلومات پہنچائیں۔

"اچھا جی....." زوہیب ٹیکسی ڈرائیور کو ہوٹل کا پتا بتاتے ہوئے فرحانہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"ویسے اگر تم ایک دفعہ یہ کہہ دیتیں کہ مجھے آپ کی دکان پر جھکے کپڑے پسند آئے تھے....."

"تو وہ آپ میرے لیے لے آتے؟" فرحانہ نے زوہیب کی بات کاٹتے ہوئے الٹا اسی سے سوال کیا۔

"جی نہیں' بس میں تمہیں پہچان جاتا' میرا یہ مطلب تھا۔" زوہیب نے بات مکمل کی۔

"خبیث....." فرحانہ نے منہ بناتے ہوئے کہا جبکہ زوہیب معنی خیز انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔

زوہیب نے رفتہ رفتہ آنکھیں بند کر کے فرحانہ کی تمام خواہشات پوری کرنا شروع کر دی تھیں۔ ہوٹل' شاپنگ مال' تفریحی مقامات غرض یہ کہ فرحانہ جو فرمائش کرتی' اُسے پوری کرنا زوہیب کے لیے فرض ہو جاتا۔

اُس روز فرحانہ' زوہیب کی شدید خواہش پر اُسے پہلی مرتبہ اپنے گھر لے آئی تھی۔

"ارے..... تم گھر پر اکیلی رہتی ہو؟ تمہارا بھائی کہاں ہے؟" زوہیب نے خالی گھر میں اکیلی فرحانہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"امی ابو تو ہیں نہیں میرے' ایک آنٹی ہیں رشتے کی' اُن کے ساتھ ہی رہتی ہوں۔ بھائی ابھی اُن کے ساتھ نکلا ہوا ہے۔ آپ آرام سے بیٹھیں جب تک وہ دونوں آ جائیں گے۔ میں ابھی ہی چائے بنا کر لاتی ہوں آپ کے لیے۔" فرحانہ نے شوخی سے چٹکی بجاتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں' تم یہاں میرے پاس بیٹھو۔" زوہیب نے فرحانہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اسے خود سے قریب کر لیا تھا اور پھر جب کب ہوں کا روپ اختیار کر گئی تھی اور کب دونوں اس آگ میں جلنے لگے تھے' دونوں کو پتا ہی نہیں چلا تھا۔ شیطان ان پر مکمل حاوی تھا اور پھر جب دونوں ہوش کی دنیا میں آئے تھے تو فرحانہ' زوہیب کا کالر پکڑے پوچھ رہی تھی۔

"تم نے یہ کیا کیا؟" آنسو تھے کہ بہے چلے جا رہے تھے۔ اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔

"سوری فرحانہ میں سخت شرمندہ ہوں' مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا....." اس سے آگے زوہیب کچھ نہیں کہہ سکا۔

"زوہیب..... یہ ہے تمہاری محبت؟ تم نے تو مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا....." وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

"فرحانہ..... میری بات سنو' ہم جلد ہی نکاح کر لیتے ہیں۔ میں گھر جاتے ہی امی سے بات کرتا ہوں پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" زوہیب نہایت جذباتی انداز میں بول رہا تھا۔

"ہاں زوہیب..... پلیز' جلدی کرو' ایسا نہ ہو کہ بہت دیر ہو جائے؟" فرحانہ نے آنسو پونچھتے ہوئے

کہا۔

اُسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ فرحانہ نے دروازہ کھولا تو اُس کا چھوٹا بھائی ساجد کھڑا تھا۔

"اب میں جا رہا ہوں۔" زوہیب حقیقتاً گھبرا گیا تھا اس لیے وہ زیادہ دیر رکا نہیں اور دروازے سے نکل گیا۔

"تجھ سے کہا تھا' گھنٹے' ڈیڑھ گھنٹے میں آنا پھر جلدی کیوں آ گیا؟" فرحانہ نے زوہیب کے جاتے ہی معصوم ساجد کے گال پر ایک تھپڑ رسید کیا تو وہ زور زور سے روتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

"شکر ہے' میرا پلان کامیاب ہو گیا..... اگر یہ اور جلدی آ جاتا تو ساری محنت رائیگاں چلی جاتی....."

"یار' تو فرحانہ کو جانتا ہے ناں؟ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ امی راضی ہیں تو بھی چل نا میرے ساتھ؟" زوہیب نے یہ خبر نعمان کو سنائی تو وہ حیرت سے گویا ہوا۔

"کون فرحانہ؟ کس سے شادی کرنے جا رہے ہو؟"

"ارے یار' وہی جو تمہارے ساتھ فیکٹری میں کام کرتی ہے۔ اس کا آگے پیچھے تو کوئی ہے نہیں' یوں کر و تم اس کے بھائی بن جاؤ تا کہ امی کو بھی تسلی ہو جائے۔" ایک ہی سانس میں زوہیب ساری بات کہہ گیا۔

"یار' تو پاگل ہو گیا ہے..... وہ فرحانہ شادی شدہ ہے۔"

"ابے..... تیرا دماغ تو ٹھیک ہے ناں؟" زوہیب نے نعمان کو غصے بھری نظروں سے دیکھا۔

"ہاں یار' وہ جو بچہ اُس کے ساتھ اُس دن آیا تھا' وہ فرحانہ کا بیٹا ہے بلکہ اُس کی تو ایک بیٹی بھی ہے جو اُس کے شوہر منیر احمد کے ساتھ ڈھاکہ میں رہتی ہے۔"

"تو صحیح کہہ رہا ہے؟" زوہیب کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں سما جائے۔

"ہاں میرے دوست..... بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں لیکن یہ نہیں جانتا کہ اُن کی علیحدگی ہوئی ہے یا پھر....."

نعمان اس سے بھی آگے کچھ بتاتا مگر زوہیب نے اسے روک دیا۔ اسے معصوم نظر آنے والی فرحانہ سے اتنے بڑے دھوکے کی امید نہیں تھی۔ وہ فرحانہ سے حقیقتاً سچی محبت کرنے لگا تھا۔

"سوری یار' مجھے اگر پہلے علم ہوتا کہ فرحانہ نے مجھ سے تیرا انبر اس بری نیت سے مانگا ہے تو میں کبھی نہیں دیتا اور تو اتنا آگے نکل گیا' مجھے اب بتا رہا ہے؟" نعمان' زوہیب کو گلے سے لگائے بولے چلے جا رہا تھا مگر وہ خاموشی سے بند آنکھیں کیے اپنے آنسو جذب کر رہا تھا۔

"کیوں شادی نہیں کر رہے تم مجھ سے؟" فرحانہ زور سے چیخی تھی۔

"کیوں کہ تم شادی شدہ ہو؟" زوہیب نے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ..... وہ..... شادی ختم ہو چکی ہے....." فرحانہ حقیقتاً سٹپٹا گئی تھی۔

"تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا فرحانہ.....؟ میں تم سے سچی محبت کرتا تھا؟" زوہیب رندھی آواز میں بول رہا تھا۔ "مگر اب تمہارے اور میرے راستے الگ ہیں' اب تمہارا مجھ سے کوئی تعلق نہیں....." زوہیب نے حتمی فیصلہ سنایا تھا۔

"اوہ..... اگر تم نے ایسا کیا تو میں سب کو خاص

www.pdfbooksfree.pk

کر تمہارے گھر والوں کو بتا دوں گی کہ تم میرے ساتھ زیادتی کرتے رہے ہو.....'' فرحانہ نے اپنے اندر کا زہر اگلا تھا۔

''اس کی ذمہ دار تم خود ہو.....'' زوہیب چیخا تھا۔

''تم بچے نہیں ہو زوہیب.....! اور تم جانتے ہو' میں ایسا کر بھی سکتی ہوں۔''

''تم چاہتی کیا ہو؟''

''تم میری خاموشی کی قیمت پانچ ہزار روپے ماہ وار مجھے دو گے اور.....''

''کیا.....؟ پانچ ہزار روپے ہر مہینے.....؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ تم مجھے بلیک میل کر رہی ہو.....'' زوہیب' فرحانہ کی بات کاٹتے ہوئے غصے سے چیخا تھا۔

''ہاں..... یہی سمجھ لو' دیتے ہو تو ٹھیک ورنہ میں کل ہی تمہارے گھر پہنچ رہی ہوں.....'' فرحانہ کی دھمکی کارآمد ثابت ہوئی اور زوہیب ہر مہینے پانچ ہزار روپے فرحانہ کو دینے پر رضامند ہو گیا۔

•.....•.....•

مارچ کا مہینہ تیزی سے اپنے دامن میں دنوں کو سمیٹ رہا تھا کہ ایک شام سرجانی ٹاؤن تھانے کی حدود میں زیر تعمیر کالج کے سامنے بوری بند لاش ملی جو مقتولہ فرحانہ کی تھی اور پھر پولیس نے اس قتل کا معمہ فرحانہ کے موبائل فون پر آنے والی کال ٹریس کر کے حل کر لیا تھا۔

فرحانہ ایک عرصے تک زوہیب کو بلیک میل کرتی رہی تھی اور وہ اُسے پانچ ہزار روپے ماہانہ ادا کرتا رہا تھا۔ اسی دوران زوہیب کی شادی ہو گئی تھی۔ شادی کے بعد فرحانہ نے زوہیب کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے اُسے دی جانے والی رقم میں اضافہ نہیں کیا تو وہ اُس کی بیوی کو جا کر بتا دے گی کہ زوہیب میرا آشنا ہے اور مجھ سے ناجائز تعلق استوار کر رکھا ہے۔ اس کے بعد زوہیب نے اسے آٹھ ہزار روپے ماہانہ دینا شروع کر دیئے تھے لیکن اب تقریباً ایک ہفتے قبل فرحانہ نے زوہیب کو فون کر کے کہا تھا کہ اُسے ہیپاٹائٹس سی ہو گیا ہے اور علاج کے لیے ہر ماہ دس ہزار کی ضرورت ہو گی۔ زوہیب فرحانہ کا یہ نیا مطالبہ سن کر چراغ پا ہو گیا تھا' اس نے ایک منصوبے کے تحت جس میں نعمان بھی شامل تھا' فرحانہ کو نیو سبزی منڈی بلایا تھا جہاں ایک گھر میں دونوں نے فرحانہ کو زیادتی کا نشانہ بنا کر پہلے اُس کے گلے میں تار سے پھندہ لگایا تو وہ بے ہوش ہو گئی اور پھر دوپٹے کی مدد سے اُس کے گلے میں پھندہ لگایا جس سے وہ واقعی ہلاک ہو گئی' اس کے بعد دونوں نے مل کر فرحانہ کو بوری میں بند کیا اور سرجانی تھانے کی حدود میں پھینک دیا۔

پولیس' فرحانہ کے موبائل فون پر کال ٹریس اور ڈیٹا کی مدد سے دونوں ملزمان نعمان اور زوہیب کو گرفتار کر چکی ہے۔

قارئین ''سچی کہانیاں''.....! نعمان اور زوہیب کی زندگیاں برباد ہو چکی ہیں جبکہ فرحانہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔ اس سارے قصے میں قصور کس کا کتنا ہے؟

فرحانہ کے شوہر منیر احمد کا..... جو اُسے یہاں اکیلا چھوڑ کر ڈھاکہ میں رہائش پذیر ہے؟ مہنگائی کا..... جس سے تنگ آ کر فرحانہ ایسے معاملات اور مطالبات پر مجبور ہو گئی اور زوہیب کو پیسے کمانے کا ذریعہ بنایا؟ موبائل پیکج سسٹم کا..... جو فاصلوں کو مٹاتا' پل پل کی خبریں دینے پر مصروف ہے یا پھر حالات کا؟ ہمارے ملک میں روز بروز ایسے واقعات اور حادثات بڑھتے جا رہے ہیں جو باعث فکر ہے۔

اقبال زمان

انسان نما درندے

محسن بھوپالی کا خیال

خوں رلائیں گے منظر، مت قریب آ محسن
آئینہ کدہ ہے دہر، ذرا دور سے تماشا کر

ایک قتل کی لرزہ خیز کہانی، سوچیے انسان پستی کی اس سطح پر بھی آ سکتا ہے؟

الامان الحفیظ..... ! یہ دنیا انسانوں کا جنگل بنتی جا رہی ہے۔ اب یہاں انسان درندوں کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یہ تبدیلی ظاہری نہیں' باطنی طور پر ہو رہی ہے۔ آپ کے سامنے بظاہر ایک انسان موجود ہے جسے اشرف المخلوقات قرار دیا گیا ہے لیکن یہ انسان کب درندے کی شکل اختیار کر لے' کچھ کہا اور سوچا نہیں جا سکتا۔ وہ کب آپ پر جھپٹ پڑے' کب چھری سے آپ کا گلا اڑا دے' بغدے سے آپ کے ٹکڑے کر دے اور وہ ٹکڑے شہر کے مختلف مقامات پر کتے اور بلیوں کے کھانے کے لیے پھینک دے..... جیسا کہ شہر کراچی کے ایک علاقے قائد آباد کی رہائشی خاتون نسرین کے ساتھ کیا گیا ہے۔


ایس ایچ او سوہر بازار اپنا خوشنود

قائد آباد کی رہائشی نسرین نے اپنے قتل سے ایک روز پہلے اپنے 14 سالہ بیٹے کے سامنے نامعلوم شخص سے موبائل فون پر بات چیت کے دوران کہا تھا۔ ''تم کل مزار قائد پر آ جانا.....'' اگلے روز وہ اپنے شوہر اور بڑے بیٹے کے کام پر جانے کے بعد گھر سے نکل گئی اور واپس نہیں آئی..... اور پھر نسرین کی لاش تین روز کے دوران سوہر بازار تھانے کی حدود میں چار مختلف مقامات سے ٹکڑوں کی صورت میں ملی تھی۔

نسرین کے قتل کی اطلاع دس مارچ کو لوگوں کو اس وقت ملی جب سوہر بازار تھانے کی حدود سے پولیس اہلکاروں کو بوری میں بند مقتولہ کی لاش کے ٹکڑے ملے..... اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ گارڈن کے ایک نجی اسپتال کے قریب واقع کچرہ کنڈی سے بوری میں بند خاتون کی لاش کے اعضا ملنے کی اطلاع پر پولیس نے انہیں اپنی تحویل میں لے کر سول اسپتال پہنچایا تھا۔ مقتولہ کی لاش کو نامعلوم ملزمان نے تیز دھار آلے کی مدد سے کاٹ کے ٹکڑے کیا تھا۔ گیارہ مارچ کو سوہر بازار تھانے کی حدود میں واقع پٹیل پاڑہ کی کچرہ کنڈی سے مقتولہ کا دھڑ ملا جبکہ سوہر بازار پھلی مارکیٹ کے

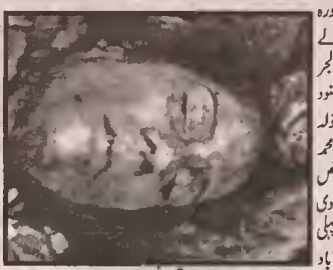
www.pdfbooksfree.pk

قریب سے مقتولہ کا سر ملا جو ایک تھیلی میں بند کیا گیا تھا۔ پولیس نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر مقتولہ کا سر اپنی تحویل میں لے کر سول اسپتال پہنچایا تھا۔ بارہ مارچ کو مقتولہ کے ہاتھ اور پاؤں گارڈن کے قریب واقع کچرہ کنڈی سے ملے تھے۔ انہیں بھی تھیلی میں بند کیا گیا تھا۔ اس لاش کو ٹکڑوں کی صورت میں ایدھی سرد خانے منتقل کیا گیا تھا اور پھر ایدھی سرد خانے میں سولہ مارچ کو مقتولہ کی شناخت 39 سالہ نسرین زوجہ محمد شریف کے نام سے ہوئی تھی۔

مقتولہ نسرین پانچ بچوں کی ماں اور قائد آباد کی رہائشی تھی۔ مذکورہ کیس کے حوالے سے SHO سولجر بازار انسپکٹر خوشنود نے بتایا کہ مقتولہ نسرین نے محمد شریف نامی شخص سے دوسری شادی کی تھی۔ اُس کی پہلی شادی فیصل آباد میں یونس نامی شخص سے ہوئی تھی اور پھر بیس برس قبل پہلے شوہر سے علیحدگی کے بعد مقتولہ نسرین فیصل آباد سے کراچی آگئی اور قائد آباد میں کرائے پر گھر لے کر رہائش اختیار کرلی۔ یہاں نسرین کی ملاقات محمد شریف سے ہوئی جو اُسے پسند آیا تھا اور وہ بھی اُسے پسند کرنے لگا تھا۔ بعدازاں دونوں نے شادی کرلی تھی۔

محمد شریف شاہ لطیف میں واقع ایک گیراج میں کام کرتا تھا۔ ان کے بچوں میں چار بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہے۔ دس مارچ کو گھر سے نکلنے کے بعد مقتولہ نسرین اپنے بچوں کے اسکول گئی تھی۔ اُس نے گھر کی چابیاں بچوں کے حوالے کی تھیں اور انہیں کہا تھا۔ ”میں ایئرپورٹ جا رہی ہوں شام تک واپس آجاؤں گی۔ تم لوگ تالہ کھول کر گھر چلے جانا۔ میں نے کھانا پکا کر کچن میں رکھ دیا ہے۔“

مقتولہ کے شوہر محمد شریف نے دورانِ تفتیش بتایا تھا۔ ”ایئرپورٹ کے علاقے میں نسرین کی ایک منہ بولی بہن رہتی ہے وہ اکثر اُس سے ملنے کے لیے وہاں جاتی رہتی تھی۔ میں نے کئی بار اپنی بیوی کو وہاں جانے سے منع کیا تھا لیکن اس نے میری بات نہیں مانی تھی۔ مورخہ دس مارچ کو میں گھر پہنچا تو بچوں نے بتایا کہ امی صبح سے اپنی بہن سے ملنے گئی ہیں لیکن ابھی تک واپس نہیں آئیں۔ یہ سن کر میں نے اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ مل کر اپنی بیوی کو ڈھونڈنا شروع کردیا۔ اس دوران سو بائل فون پر اپنی بیوی سے رابطے کی بھی کوشش کرتا رہا لیکن اس کا موبائل فون مسلسل بند جا رہا تھا۔“


مقتولہ نسرین

محمد شریف اور اس کے بیٹے کو مقتولہ کی منہ بولی بہن کے گھر کا پتہ معلوم نہیں تھا..... آخر کار محمد شریف نے قائد آباد تھانے میں جا کر اپنی بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی اور اپنے تمام رشتے داروں کو بھی اپنی بیوی کی گمشدگی کی اطلاع دی تھی۔ بعدازاں اس نے شہر کے تمام سرکاری و نجی اسپتالوں میں اپنی بیوی کی تلاش شروع کردی کہ کہیں وہ راستے میں کسی حادثے کا شکار نہ ہوگئی ہو اور پھر جب محمد شریف اپنی بیوی کی تلاش میں ایدھی سرد خانے گیا تو وہاں اس نے لاوارث لاشوں کے ریکارڈ میں اپنی بیوی کی تصویر دیکھی تھی۔ ایدھی انتظامیہ نے اُسے بتایا تھا کہ..... اِس خاتون کی لاش ٹکڑوں کی صورت میں ملی ہے۔ بعدازاں شناخت کے بعد نسرین کی لاش محمد شریف کے حوالے کردی گئی تھی جس کی تدفین علاقے کے قریبی قبرستان میں کی گئی۔

اس کیس کے تفتیشی افسر سرفراز کے مطابق اس واردات کا مقدمہ نمبر 12/76 زیردفعہ 302/34 کے تحت درج ہوا تھا اور مقتولہ کے شوہر محمد شریف کو حراست میں لے کر چند روز تک تفتیش کی گئی تھی لیکن یہ ثابت ہونے پر کہ وہ بے گناہ ہے پولیس نے رہا کر دیا تھا۔ مقتولہ کے موبائل فون کا ڈیٹا بھی نکلوایا گیا جس کے مطابق اُسے آخری تین کالیں ٹیکسلا سے کی گئی تھیں جو تین مختلف لوگوں نے کی تھیں۔ ان افراد کو کراچی بلایا گیا ہے جن سے تفتیش کے بعد کیس میں مزید پیشرفت ہوئی ہے۔ پولیس افسران اور لیڈی ایم ایل او نے پوسٹ مارٹم کے بعد بتایا تھا کہ..... مقتولہ سے ایک سے زائد افراد نے زیادتی کی تھی اور پھر گلہ دبا کر قتل کرنے کے بعد لاش کے ٹکڑے کیے گئے تھے۔

پولیس کی اس کیس کے سلسلے میں تفتیش جاری ہے اور امید تو یہی ہے کہ اس کیس کا مجرم یا مجرمان بہت جلد پکڑے جائیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کو سزا کیا ہوگی؟ ہمارا قانون تو انسان کو انسان کے قتل کرنے کی سزا دیتا ہے لیکن اگر انسان درندہ بن کر کسی انسان کو قتل کرے زندگی سے محروم کرے تو اس کی سزا کیا یہی عام انسانی سزا ہوگی؟؟؟

☆☆☆

غزل

سرِ مقتل اٹھایا جا رہا ہے
مرا لاشہ چھپایا جا رہا ہے

ہوا ساکت کھڑی ہے ڈر کے مارے
دیا پھر سے جلایا جا رہا ہے

الجھ کر پیچ و خم میں زندگی کے
تعلق کو نبھایا جا رہا ہے

بتا اے زندگی! میں کیا کروں اب؟
مجھے تم سے ڈرایا جا رہا ہے

کوئی تو درمیاں ہے تیرا جو
مجھے دل سے بھلایا جا رہا ہے

ہماشاہ آسماں سے دور بیٹھے
زمیں کو آزمایا جا رہا ہے

ہُما آشاہ

www.pdfbooksfree.pk

سفر کہانی جیتے جاگتے دوڑتے بھاگتے سچے مناظر کی آنکھوں دیکھی روداد

رخسانہ سہام مرزا

الحمد شریف پورے کی مدینہ

ارتضادارثی کا خیال

نہ زادِ راہ کی حاجت، نہ شمعِ منزل کی
ہے ذاتِ سرورِ کونین رہبری کے لیے

ایک سفر مقدس کا روح پرور آنکھوں دیکھا احوال، رخسانہ سہام کے قلم سے

اب ہمیں بھائی مسعود کے ساتھ جدہ روانہ ہونا تھا اور وہاں تقریباً بیس سال بعد اپنی پیاری خالہ بی بی سے ملنا تھا۔ ہمارا بچپن اور اُن کا لڑکپن ساتھ گزرا تھا۔ ہماری طرح وہ بھی مشتاق دید تھیں' سودن میں پانچ مرتبہ فون پر پوچھ چکی تھیں.....

''رخسانہ! تم کب آرہی ہو؟''

اُن کی بے تابی' اُن کی محبت کا پتہ دے رہی تھی کہ وہ سراپا انتظار تھیں۔

مکہ معظمہ سے جدہ کا راستہ ایک گھنٹے کا تھا۔ ہم مغرب کی نماز کے بعد روانہ ہوئے تھے۔ بہترین سڑکیں' صاف ستھرا ماحول' ایک گھنٹہ کب گزر گیا' پتہ ہی نہیں چلا۔ راستے میں پھر خالہ کا دوبار فون آیا تھا۔ اُن پر یہ گھنٹہ بہت بھاری گزر رہا تھا اور پھر جب ہم لوگ وہاں پہنچے تھے تو وہ سراپا انتظار نظر آئی تھیں۔ انہوں نے سب بچوں کو بھی بلا لیا تھا۔ خالہ بی بی تو مجھ سے والہانہ انداز میں لپٹ گئی تھیں۔ بار بار میرا چہرہ دیکھتیں اور پیار کرتیں۔ شاید اُن کو اب بھی میرے اندر وہ چھوٹی' شریر' بدتمیز رخسانہ نظر آرہی تھی۔

میں نے کہا تھا۔ ''خالہ بی بی! اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔''

''تم کتنی ہی بڑی ہو جاؤ' میرے لیے تو وہی.....''

میں نے درمیان سے بات اچک لی۔ ''ننھی جاسوسہ.....''

میرا کام صرف خالہ بی بی کی جاسوسی کرنا ہی تو تھا اور دوسری خالہ جنہیں میں گڈی خالہ کہتی تھی' کو رپورٹ دیتی تھی کہ میری جاسوسی کا اصل محرک وہی تھیں' جب خالہ بی بی گھر سے باہر اِدھر اُدھر' پاس پڑوس میں گھوم کر آتیں اور میں جو دروازے پر خوش اُن کا انتظار کر رہی ہوتی' دل ہی دل میں کہتی۔ اب آئیں خالہ بی بی کی بچی.....! اور پھر وہ جیسے ہی گھر کے اندر داخل ہوتیں تو میں گڈی خالہ کے سامنے اپنی جاسوسی کا پٹارہ کھولتی تھی اور پھر بس خالہ بی بی یہی کہتی رہتی تھیں۔

''چھوٹی آپا.....! میں نے ایسا نہیں کیا۔''

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے کبھی ایسا نہیں کہا تھا کہ رخسانہ جھوٹ بولتی ہے' بس وہ اپنی صفائی پیش کرتی رہتیں اور پھر جب اس کے باوجود اُن کو سزا مل جاتی یعنی گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگ جاتی تو وہ مجھ سے ناراض ہونے کی بجائے کہتیں۔

''چلو آؤ' کہانیاں سناتی ہوں۔''

رہا وہ جاسوسی والا معاملہ تو بس بات یہ تھی کہ خالہ بی بی کی ہم عمر لڑکیاں پاس پڑوس میں رہتی تھیں۔ وہ جب اُن کے پاس ملنے کے لیے جاتی تھیں' میں بھی اُن کے درمیان گھس جاتی۔ خالہ کی سہیلیاں کہتیں۔

''اسے ہٹاؤ۔''

جواباً خالہ بی بی ہمیشہ یہی کہتیں۔ ''اسے کچھ سمجھ نہیں آتا' رہنے دو۔''



منزہ سہام، مسجد نبوی ﷺ کے دروازے کے سامنے

اور پھر وہ مجھے شہزادی' شہزادے' جن' دیو اور پریوں کی کہانیاں سنا کر کہتیں۔

''دیکھو' یہ سب سچ نہیں' بس کہانی ہے۔''

تو میں غصے میں اُن کے کاندھے پر کاٹ لیتی۔

''نہیں..... نہیں..... سچ ہے۔''

وہ فوراً ہار مان کر کہتیں۔ ''اچھا' میرا کندھا تو چھوڑو۔''

میں کوئی خالہ بی بی کی اصل دشمن تھوڑی تھی اور مگر وہ مجھے ہٹا کر وہ یہ کیتیں' بس یہی میری دشمنی تھی۔ میں فوراً جا کر گڈی خالہ سے کہتی تھی۔

''خالہ بی بی اپنی دوستوں کے ساتھ پتا نہیں کیا باتیں کر رہی ہیں' مجھے وہاں نہیں بیٹھنے دے رہی ہیں۔'' بس یہی میری جاسوسی تھی۔

گڈی خالہ کہتیں۔ ''اچھا' آنے دو۔''

اور پھر خالہ بی بی آنے کے بعد لاکھ کہتیں۔

''چھوٹی آپا.....! میں نے ایسا نہیں کیا۔''

www.pdfbooksfree.pk

مگر وہ ایک نہ سنتیں اور سزا کا اعلان کر دیتیں کہ اب تم گھر سے قدم مت نکالنا اور خالہ بی بی خوشی خوشی سزا قبول کر کے گھر میں بیٹھ جاتیں اور مرے کی بات یہ ہوتی کہ پھر میں اُن کی پیغام بر بن جاتی اور وہ پیغام جو خالہ بی بی اپنی سہیلیوں کو دیتیں' میں لے جاتی اور اُس کی کسی کو خبر نہیں ہونے دیتی تھی۔ یہ تھی



میری پیاری خالہ اور میں

میری اور خالہ بی بی کی محبت!!

ملنے ملانے کا سلسلہ ختم ہوا تو خالہ بی بی کی میڈ (maid) نے قہوہ اور بہت سارے خشک میوے حلوے میز پر سجا دیئے تھے۔ ہم ٹھہرے چائے پینے والے' جب دودھ کی چائے مانگی تو اُس نے پوچھا۔

"حلیب قہوہ؟"

یوں ہمیں حلیب قہوہ کی صورت اپنی پسند کی چائے ملی تھی۔ اس کے بعد تو وہ ہم سے ہر گھنٹے بعد پوچھتی تھی۔

"حلیب قہوہ؟"

خالہ بی بی کے سب بچے ہماری ملاقات کے باعث ملنے والی اپنی ماں کی خوشی سے خوش تھے۔ میری خالہ زاد بہنوں نے بتایا تھا۔ "جب سے آپ نے پاکستان سے یہاں آنے کا فون کیا تھا' یہ ہم سے کہہ رہی تھیں' دیکھو' خسانہ آ رہی ہے۔ وہ 12 تاریخ کو مدینہ میں ہوگی پھر مکہ آئے گی اور مسعود کے گھر ٹھہرے گی پھر میرے پاس جدہ آئے گی۔"..... اور پھر ماضی اور حال سے جڑی باتیں کرتے بہت سا وقت ہمارے درمیان سے سرک گیا تھا۔

دوسرے دن خالہ بی بی کا چھوٹا بیٹا خالد ہمیں سمندر پہ لے گیا تھا۔ وہاں ہم نے بڑا لذیذ کھانا کھایا تھا پھر وہ زین کو یہ پیار بھرا حکم دیتے ہوئے



زین، احمد اور سعید مصطفیٰ کے ساتھ

Mall لے گیا تھا کہ تمہیں جو چیز بھی پسند آئے صرف اپنے لیے ہی نہیں' دانیال کے لیے بھی خرید لینا۔ وہ لوگ مال گئے تو منزہ اور خالد کی بیگم عائشہ بھی ساتھ چلی گئی تھیں' بس میں اور خالہ بی بی وہیں کافی شاپ میں بیٹھے رہ گئے تھے اور پھر بس وہ بولتی ہی گئیں' میں سنتی رہی تھی۔ درمیان میں' میں ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ صرف مجھ سے بولنا چاہتی ہیں۔

وقت بڑا ظالم ہے' پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ ابھی کل وہاں آمد پر میرا سامان گاڑی سے اتر رہا تھا اور اب ہمارا سامان روانگی کے لیے گاڑی میں رکھا جا رہا تھا۔ میری روانگی کے وقت خالہ بی بی کے چہرے پر ایک سرخی سی آ گئی تھی۔

"خالہ بی بی.....! کیا ہو رہا ہے؟" میں نے پوچھا تھا۔

"بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے کیونکہ تم جا رہی ہو۔" خالہ بی بی کے چہرے پر ایک بھیگی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمی سی تھی۔

"خالہ بی بی.....! میں تو جانے کے لیے آئی تھی۔"

"ہاں' مجھے معلوم ہے۔"

"تو پھر دکھ کیوں؟"

"دکھ تو ہوگا بس۔" خالہ بی بی نے بھیگی مسکراہٹ اور بھیگے لہجے میں کچھ ایسے کہا تھا کہ میں نے بے اختیار اُن کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا تھا اور میرے آنسو بہہ نکلے تھے۔ خالہ بی بی نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا۔

"پھر آنا' انشاءاللہ!"

میں' منزہ اور زین گاڑی میں بیٹھ گئے تھے اور

www.pdfbooksfree.pk

پھر جب گاڑی چلی تھی تو ہم نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ جدہ ایئرپورٹ پر کافی رش تھا۔ لوگ عمرہ کر کے آ رہے تھے لیکن وہاں ایک طوفانِ بدتمیزی تھا' وہاں کوئی کسی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا نہ بچوں کا خیال نہ عورتوں کا لحاظ' یہ سب لوگ عمرہ کر کے جا رہے تھے لیکن ادب' تہذیب اور لحاظ کے دامن سے عاری لوگوں نے کوئی سبق نہیں لیا تھا۔ سیکھا نہیں تھا جہاز پر سوار ہونے کے معاملے میں جلد بازی' بدتمیزی کا یہ عالم تھا کہ الاماں الحفیظ! ان ناسمجھ لوگوں کو کون سمجھاتا کہ جہاز انہیں کسی بس کی طرح چھوڑ کر نہیں جائے گا' خالی روانہ ہو کر اپنا پیٹرول نہیں جلائے گا مگر وہاں تو نہ زبان پر لگام تھی' نا ہی ہاتھ پیروں پر اختیار..... ایک وقت تو مجھے ایسا لگا تھا کہ اب مار پیٹ شروع ہو جائے گی' سو مجھ سے نہ رہا گیا تھا۔ میں نے کہا تھا۔

"اللہ کے واسطے خاموش ہو جایئے' یہاں ایک دوسرے کی پگڑیاں مت اچھالیے' تین چار گھنٹے کے بعد آپ پاکستان پہنچ جائیں گے' وہاں تو آپ مادر پدر آزاد ہیں' ساری بھڑاس نکال لیجیے گا۔"

مگر میری صدا تو وہاں نقار خانے میں طوطی کی آواز تھی' تھوڑی دیر میں کاؤنٹر کھل گئے تھے اور لوگ امیگریشن سے فارغ ہونے لگے اور بورڈنگ کارڈ بھی ملنے لگے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بورڈنگ کارڈ ملنے کے بعد بھی لوگ دھکم پیل میں لگے ہوئے تھے جبکہ بورڈنگ کارڈ ملنے کے بعد تو جہاز نے ان کو لے کر ہی جانا تھا۔

ایک کاؤنٹر پر ہماری دو خواتین پاگلوں کی طرح لڑ رہی تھیں اور سعودی امیگریشن افسر کاؤنٹر بند کر کے تماشہ دیکھ رہا تھا۔ عربوں کی خاصیت ہے کہ وہ بہت کم بولتے ہیں' بس خاموشی سے تماشہ دیکھتے ہیں۔

لڑنے والیاں انگریزی زبان میں ایک دوسرے کا تیا پانچا توڑ جملے کر رہی تھیں۔ انگریزی بولنا ہمارا قومی فریضہ ہے' دنیا کے ترقی یافتہ ممالک اپنی زبان بولتے ہیں اور اس وقت وہ ترقی کے لحاظ سے کہاں ہیں اور ہم..... بس جانے دیجیے۔

ایک خاتون کو بورڈنگ لاؤنج میں یاد آیا کہ اپنا پرس ہاتھ روم میں بھول آئی ہیں' وہ دوبارہ ہار روم جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بھاگیں' کے شوہر نے پوچھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"میں اپنا پرس بھول آئی ہوں۔" بیوی کا جواب سن کر شوہر صاحب نے ڈانٹنا شروع کر دیا تھا۔

"مت جاؤ' چھوڑو دفع کرو' لیں گے پکڑ لیں گے' ہاتھ نہ جھنجھڑیاں ڈال کر جیل بھیج دیں گے۔"

بیگم نہ مانیں اور پرس لینے چلی گئیں۔ شوہر فوراً ہی اپنے پاس کھڑی والدہ سے کہا تھا۔

"یہ کیسی عورت سے میری شادی کر دی تم نے ہی ملی تھی؟"

چند منٹوں بعد وہ خاتون اپنا پرس لے کر آ گئی تھیں' مجھ سمیت سارے لاؤنج کے مسافر اُن کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں تلاش کرنے لگے تھے لیکن..... تو اُن کے شوہر کی خواہش تھی مگر کوئی تماشہ نہ ہوا۔ بہرحال یہاں مجھے' میرے مزدور بھائی یاد آ گئے تھے۔ کیا سلیقہ' کیا قرینہ تھا' نہ جہاز میں سوار ہونے کی جلدی نہ اترنے میں بے صبری..... حق حلال کما اور کھانے والے ایسے ہی صابر ہوتے ہیں۔ میں اپنے اُن بھائیوں کو سلام کرتی ہوں۔ کوئی تو ہے جو اپنے ملک کی عزت کروانا ہے اور کرتا ہے۔ میں ساری نیک تمنائیں اُن کے ساتھ ہیں جہاں رہیں خوش رہیں۔

ہمارے جہاز نے کراچی لینڈ کیا' جہاز ٹرمینل



جدہ کا ساحل..... کچھ وقت سیر و تفریح کے لیے

جاب ریچنگ رہا تھا کہ اکثر مسافر کھڑے ہو گئے تھے۔ کپتان مستقل کہہ رہا تھا۔

"جب تک جہاز رک نہیں جاتا' سیٹ سے نہ اٹھیں۔"

مگر جناب..... وہ اللہ کی نہیں سنتے تو کپتان صاحب کی کیا سنیں گے۔ جہاز میں ایئر ہوسٹس تھیں۔ کپتان کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی ایئر ہوسٹس تھیں۔ کپتان کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی ہمارے آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ نہیں سمجھ پائے۔ خاتون نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ' بیٹھ جاؤ۔"

"ارے بی بی..... ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجیے۔" میں نے دل ہی دل میں مشورہ دیا تھا اور یہ اگر کرنے ہی لگی تھی کہ..... ہمارا ہینڈ لگیج کوئی دوسرا نہ لے جائے مگر اس سب کے باوجود ہماری ایک زم زم کی بوتل غائب تھی۔ اپنے وطن واپسی پر کوئی پاکستانی تو ملنا تھا' سو مل گیا۔ اُس بوتل پر زین کا نام اور پتہ لکھا تھا۔ ہم نے بوتل لے جانے والے کو معاف کیا مگر ہمارا زم زم پیتے وقت بوتل پر لکھے نام کو ضرور دعا دیجیے گا۔

کراچی پہنچ کر میں نے سب سے پہلے خالہ بی بی کو سعودیہ فون کیا تو وہ اُس وقت ڈاکٹر کے پاس بیٹھی تھیں۔ میں نے دل میں کہا۔ 'رخسانہ..... تم وہاں کیوں گئی تھیں؟'

پھر دوسرے دن میں نے فون کیا۔ طبیعت پوچھنے پر بولیں۔

"تمہارا چہرہ آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "خالہ بی بی! پھر آؤں گی' انشاء اللہ!"

وہ بولیں۔ "مکہ مت جانا۔ میرے پاس آنا۔"

میں نے کہا۔ "وہاں بھی جاؤں گی اور آپ کے پاس بھی رہوں گی۔"

یوں خوش ہو گئیں جیسے ابھی کل پھر میں اُن کے پاس پہنچ رہی ہوں۔

www.pdfbooksfree.pk

نعت

طیبہ کی ہواؤں کی تاثیر نرالی ہے
محبوبؐ کی گلیوں کی تنویر نرالی ہے
شاہانِ زمانہ بھی دیکھے ہیں گدا اُنؐ کے
طیبہ کے گداؤں کی تقدیر نرالی ہے
جنت بھی فدا اُنؐ پر، قربان ہے کعبہ بھی
محمد ﷺ کے روضے کی توقیر نرالی ہے
قرآن کی صورت میں الفاظ گئے ڈھلتے
سلطانِ مدینہؐ کی تقریر نرالی ہے
قیدی ہیں ملائکہ بھی مرسل بھی اسیران اُنؐ کے
محبوبؐ کی زلفوں کی زنجیر نرالی ہے
تکریمِ مصور کا عکاس ہے ہر پہلو
بے مثل مصور کی تصویر نرالی ہے
روضے پہ نگاہیں ہیں اور گلیاں مدینے کی
فرحانہ ترے خوابوں کی تعبیر نرالی ہے

مولانا شہید الاسلام المصری

اب یہاں واپسی کے بعد یادوں کی کتاب اور وہ چہرے جو میرے اپنے تھے۔ خالہ بی بی پاس پہنچنے کے بعد پہلے دن سے سفر کے آخری مرحلے تک میرے چھوٹے بھائی تحسین ہمارے ساتھ رہے اور پھر منزہ تمام وقت اُن کے ساتھ رہی۔ ہر لمحے ماموں کی پکار تھی۔

"ماموں.....! آئس کریم کھانی ماموں.....! مجھے تحفہ چاہیے۔ ماموں.....! یہ کیسے ہوگا؟ ماموں.....! ماموں.....! اور ماموں!"

واقعی محبت پر کسی کی اجارہ داری نہیں' محبت کرنے' وہی اپنا ہو جائے۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل چاہتا تھا کہ میرے ماموں بھی ساتھ آجائیں۔ وہ بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے تھے۔ میری ہر ہر بات پوری کرتے تھے۔ سلام کہتے تھے کہ "رخسانہ کے پاس ہر مرض کا علاج ماموں ہیں۔"

کل میں اپنے ماموں کے ساتھ جہاں تھی آج منزہ اپنے تحسین ماموں کے ساتھ وہاں تھی۔ تحسین تو اس سفر کے آغاز یعنی اس سفر کی "روداد کارروائی" سے لے کر ہمارے سعودیہ عرب خروج تک کبھی ٹیلی فونک مشوروں تو کبھی بذات خود ہمارے ساتھ ساتھ تھے اور لگ رہا ہے کہ جیسے اب بھی ساتھ ہی ہیں۔

تحسین کی طرح مسعود نے بھی کوئی کسر چھوڑی۔ مدینہ میں ہوٹل کی بکنگ سے لے کر جدہ تک' ہمارے جدہ جانے تک ہر ہر قدم پر سایہ رہے۔ مسعود بھی ایک رشتے سے میرے ماموں بھی ہیں اور بھائی بھی۔ ماموں.....! ماں کا منہ.....واقعی بہت پیارا رشتہ ہوتا ہے' بس یہی تھا' یہی حقیقت تھی۔

☆☆☆

میری کہانی میری زبانی | سچی کہانیاں لکھاری اور قارئین کی کہانی لفظوں کی زبانی

انور فرہاد

زندگی لکھ رہا ہوں میں

حامد علی سید کا خیال
زبان رکھتے ہیں پتھر بھی چٹانیں بولتی ہیں
جو چہروں پر لکھی ہیں داستانیں بولتی ہیں

ہمارے سینئر ترین لکھاری کی بھرپور زندگی کی کہانی کا آخری حصہ

"ٹھیک ہے' یہ کام میرے لیے مشکل نہیں ہوگا۔" اور اُسی دن سے میں نے کام شروع کر دیا۔

انہوں نے مجھے ملیر کے ایک ادارہ کا پتہ اور بس کا کرایہ دیا اور اچھی طرح سمجھا دیا کہ کس طرح جانا اور واپس آنا ہے اور میں ملیر روانہ ہو گیا۔

ایک دو روز بعد میں نے نگار کے دفتر جا کر حسین اعظمی صاحب کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ "تنخواہ کے بارے میں انہوں نے کچھ بتایا' کیا پیسے دیں گے؟"

"نہ انہوں نے بتایا نہ میں نے پوچھا۔"

اعظمی صاحب مسکرائے۔ "بڑے بھولے ہو یار' تم بھی۔ خیر وہ اچھے آدمی ہیں معقول پیسے دے دیں گے۔"

مگر وہاں سے تنخواہ لینے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی' ملازمت ابھی میں نے پندرہ روز ہی کی تھی کہ حسین اعظمی صاحب نے مجھ سے کہا تھا۔ "انور فرہاد.....! میں تو نگار چھوڑ کر جا رہا ہوں' میں نے بھائی الیاس سے بات کر لی ہے' تم میری جگہ کام شروع کر دو۔"

"مگر آپ کیوں نگار چھوڑ رہے ہیں؟" میں نے فکرمند ہو کر پوچھا۔ "کیا کوئی پریشانی ہو گئی ہے یہاں؟"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں' بات دراصل یہ ہے کہ فیض احمد فیض اور سید سبط حسن ایک سیاسی ہفت روزہ "لیل و نہار" نکال رہے ہیں۔ مجھے اس پرچے کی آفر آئی ہے۔ میری اپیل فیلڈ وہی ہے' یہاں تو میں بس وقت گزار رہا تھا۔"

اس طرح حسین اعظمی اپنی کرسی پر مجھے بٹھا کر خود "لیل و نہار" چلے گئے۔ میں نے نامہ نگار کی حیثیت سے "نگار" سے جو رشتہ جوڑا تھا' کوئی ایک عشرے کے بعد وہ میرے سب ایڈیٹر بن جانے کے بعد مزید پکا ہو گیا تھا۔ یہاں اس حیثیت میں' میں نے کم و بیش چار سال تک ملازمت کی پھر ایک

www.pdfbooksfree.pk

وقت آیا کہ اس ادارہ سے علیحدہ ہوگیا لیکن کسی ناراضگی یا تنازعے کے سبب نگار کی ملازمت نہیں چھوڑی تھی' بس زیادہ آمدنی کے لالچ میں یہ نوکری چھوڑی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ اس ملازمت کے دوران ''فلم اور فیشن'' نام کے ایک ہفت روزہ میگزین میں مجھے پارٹ ٹائم نوکری مل گئی تھی۔ میں نگار سے شام پانچ بجے چھٹی کرکے پریس چیمبر چلا جاتا جہاں ''فلم اور فیشن'' کا دفتر تھا۔ یہ جریدہ معروف فلم جرنلسٹ اقبال احمد خان کا تھا جو شادی کے بعد مستقل طور پر لندن سدھار گئے تھے تو جاتے وقت اپنا یہ میگزین فروخت کرگئے' خریدنے والے محمد انور خان اور طاہر رضوی (غالباً ان کے یہی نام تھے۔) تھے جو بنیادی طور پر کاروباری لوگ تھے اور کئی طرح کے کام کیا کرتے تھے۔ ان کا ایک پرنٹنگ پریس بھی ناظم آباد میں تھا۔ انہوں نے پرچے کی خریداری کے بعد اپنے طور پر ایک اسٹاف تو رکھ لیا تھا مگر انہیں ایک تجربہ کار شخص کی ضرورت تھی۔ یہاں چند مہینے میں نے جزوقتی طور پر کام کیا تو مالکان مجھ سے بہت متاثر ہوئے اور اصرار کرنے لگے کہ آپ ہمارے ہاں فل ٹائم ملازمت کرلیں' نگار کو چھوڑ کر ہمارے پاس آ جائیں۔ نگار والے آپ کو کیا دیتے ہیں؟

''ساڑھے تین سو روپے۔''

''ہم آپ کو چھ سو روپے دیں گے۔''

واضح رہے کہ وہ شام کے دو گھنٹے کے مجھے دو سو روپے تنخواہ دیتے تھے جو اُس وقت کے لحاظ سے خاصی معقول رقم تھی۔ میں نے بھائی الیاس رشیدی کے سامنے ساری صورت حال بیان کردی تھی۔

''اگر تم اپنے بہتر مستقبل کے لیے جانا چاہتے ہو تو میں تمہیں روکوں گا نہیں' ویسے مجھے نہ تم سے' نہ کسی کوئی شکایت رہی اور نہ ہی شاید مجھ سے تمہیں کوئی شکایت ہوگی۔'' انہوں نے میری بات سن کر کہا تھا۔ اس طرح میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نگار چھوڑ کر فلم اور فیشن چلا گیا تھا۔

میری بیگم میرے اس فیصلے پر خوش نہیں تھیں۔ ''میرا خیال ہے' آپ نے اچھا فیصلہ نہیں کیا۔ یہ نیا ادارہ ہے' نئے لوگ ہیں۔ نگار ایک مستحکم ادارہ ہے۔ بے شک وہاں تنخواہ یہاں سے کم تھی مگر ملازمت کی سیکورٹی تو تھی۔''

اُس وقت تو مجھے اپنی اہلیہ کی باتوں کی اہمیت سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر ایک سال کے بعد ہی جب 'فلم اور فیشن' کو چھوڑنا پڑا تھا تو مجھے بیوی کی بات شدت سے یاد آئی تھی۔ ''فلم اور فیشن'' میں مکمل طور پر ایڈیٹر تھا' میرے ساتھ جو اسٹاف تھا' اس کا مجھے مکمل تعاون حاصل تھا۔ پرچہ بڑے اچھے انداز میں پابندیٔ وقت کے ساتھ نکل رہا تھا۔ مالکان مجھ سے بہت خوش تھے' میری جوائننگ کے بعد دفتر پریس چیمبر سے شفٹ ہوکر ناظم آباد نمبر ایک آ گیا تھا جہاں اُن کا پرنٹنگ پریس بھی تھا۔ ان کے پریس کا کام بھی بہت ٹھیک ٹھاک طریقے پر چلتا تھا۔ ایک صاحب جو پریس کے مینیجر تھے انہیں بھی کچھ لکھنے لکھانے کا شوق تھا۔ ان کا ایک کالم بھی ''فلم اور فیشن'' میں چھپتا تھا۔ وہ مالکان کی گڈ بک میں شامل تھے۔ پریس چوبیس گھنٹے چلتا تھا یعنی کمرشل پوزیشن اس کی بہت اچھی تھی مگر جب دو تین مہینوں کے بعد پریس سے متعلق حساب کتاب ہوتا تو معلوم ہوتا' منافع کی بجائے گھاٹا ہو رہا ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ مینیجر اور پریس کا چیف آپریٹر دونوں مل کر مالکان کی آنکھوں میں دھول جھونکتے تھے۔ رات کی شفٹ میں جب دن کا کوئی عملہ نہیں ہوتا تھا' دونوں شراب اور شباب کے شوق میں بڑی بے دردی سے ادارہ کا پیسہ خرچ کرتے تھے۔

جب مالکان کو دورِ دن خانہ کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا تو شاطر مینیجر نے انہیں ''فلم اور فیشن'' کے مسئلے پر الجھانا اور پریشان کرنا شروع کردیا تھا۔ ماہانہ میٹنگ کے دوران مینیجر صاحب بھی شریک ہوتے اور پرچے کے بارے میں مختلف عنوانات سے اعتراض کرتے جن میں ناقص پرنٹنگ کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا اور کہا یہ جاتا کہ کتابت اتنی ہلکی تھی کہ پلیٹ پر اس کا نقش اُبھر کر سامنے آیا۔ ایڈیٹر صاحب نے اس طرف توجہ نہیں دی جس کی وجہ سے پرچے کی ساکھ پر ناخوشگوار اثر پڑ رہا ہے۔ میں اپنی مفاہمتی عادت سے مجبور ہو کر یہ بات آگے نہیں بڑھاتا کہ ''ٹھیک ہے' آیندہ میں ایسی باتوں پر مزید توجہ دوں گا اور کوشش کروں گا کہ ایسی غلطی دوبارہ نہ ہو۔''

میری اس مفاہمتی ڈپلومیسی سے میرا اسٹاف خوش نہیں تھا۔ ایک دن اُن سب نے میرا گھیراؤ کیا اور کہا۔ ''انور صاحب..... آپ کیوں اپنے ناکردہ گناہوں کا عذاب اپنے سر لے لیتے ہیں؟ آپ کھل کر بات کیوں نہیں کرتے؟''

''کیا بات کروں کھل کر؟ اس طرح معاملات بگڑ نہیں جائیں گے؟''

''معاملات بگڑتے ہیں تو بگڑنے دیں' مالکان سے کہیں' ہم پر غلط الزامات لگانا بند کریں۔ بصورتِ دیگر ہمارا استعفیٰ قبول کریں۔ آپ کے ساتھ ہم تمام لوگ بھی استعفیٰ دے دیں گے۔''

ایک وکیل صاحب تھے جو مالکان کے قانونی مشیر کی حیثیت سے کام کرتے تھے' انہوں نے بھی کہا۔ ''ہاں انور صاحب..... پریس والے اپنا ملبہ آپ پر اور آپ کے اسٹاف پر ڈال رہے ہیں' اس موقع پر خاموش رہ کر آپ نہ صرف اپنے آپ پر اور اپنے اسٹاف پر ظلم کریں گے بلکہ اصل جرم کو مزید کھل کھیلنے کا موقع دیں گے۔''

اس کے بعد ہم نے ایسا ہی کیا' اجتماعی طور پر اپنے استعفے مالکان کو تھما دیے جس کے بعد نہ صرف ''فلم اور فیشن'' بند ہوگیا بلکہ کچھ دنوں کے بعد وہ پریس بھی اپنا وجود قائم نہ رکھ سکا۔

''پورے کے لالچ میں آدھے سے بھی گئے نا؟'' بیوی نے اپنی بات یاد دلاتے ہوئے کہا۔

''جو ہونا ہوتا ہے' وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ اب میری دربدری اور پریشانی کا دور شروع ہوگیا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد سینئر سحابی منیر علوی نے روزنامہ ''صداقت'' نکالا تو وہاں ملازمت مل گئی۔ اس کے ایڈیٹوریل سیکشن میں میرا تقرر ہوا تھا مگر علوی صاحب ہر طرح کا کام مجھ سے لے لیتے تھے۔ اداریے لکھوانے کے ساتھ ساتھ رپورٹری بھی کروا لیتے تھے۔ اگرچہ وہ بڑے سینئر سحابی تھے لیکن مگر یاروں دستوں جیسا برتاؤ کرتے تھے۔ ان سے یاری دوستی کا سلسلہ کب اور کیسے شروع ہوا' یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے۔

جن دنوں میں ''نگار'' میں ایڈیٹری کیا کرتا تھا' ایک لڑکا اپنے فلمی مضامین لے کر میرے پاس آتا تھا۔ اس کا پورا نام تو یاد نہیں رہا البتہ اس کے نام کا ایک حصہ ''عروج'' یاد رہ گیا ہے۔ ایک بار اس کے ساتھ جن بھوتوں کا تذکرہ ہو رہا تھا تو میں نے کہا۔ ''مجھے بھی کراچی کے چند بھوتوں کا قصہ معلوم ہے۔''

یہ سننا تھا کہ وہ ایک دم میرے پیچھے پڑ گیا۔ ''انور صاحب..... ! پہلی فرصت میں یہ قصے مجھے لکھ کر دے دیجیے۔''

''ارے یار..... ! تم یہ قصے کیا کرو گے؟''

''میں تعویذ بنا کر انہیں اپنے گلے میں نہیں ڈالوں گا۔ میرے ایک کرم فرما ہیں منیر علوی' وہ

www.pdfbooksfree.pk

"مشعل" ڈائجسٹ کے نام سے ایک پرچہ نکالتے ہیں۔ میں اس پرچے میں ان کی معاونت کرتا ہوں' آپ کی کہانی ہم اسی "مشعل" ڈائجسٹ میں چھاپیں گے۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں لکھ دوں گا' دو چار دن بعد آ کر لے جانا۔" اور پھر میں نے دو چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھ دیں جو میں نے نگار ہی کے ایک قلم کار کی زبانی سنی تھی۔

عروج نے بتایا۔ "نیر علوی صاحب کو آپ کی کہانیاں بہت پسند آئی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اب ہر شمارہ کے لیے ان سے ایسی ہی کہانیاں لکھوائو۔"

"ارے یار..... تم نے تو مجھے اچھی مصیبت میں ڈال دیا' مجھے کہانیاں وغیرہ لکھنے کی فرصت کہاں ہے؟"

مگر وہ بعد کہ کہانیاں تو آپ کو لکھنی ہوں گی۔ اب جان چھڑانے کے لیے میں نے کہا۔ "بھئی یہ کام میں مفت میں نہیں کروں گا۔"

اگلی ملاقات میں عروج نے کہا۔ "علوی صاحب آپ کو معاوضہ دینے پر تیار ہو گئے ہیں۔ آپ کو ایک کہانی کے 35 روپے ملیں گے۔"

یہ 73-1972ء کا دور تھا' اُس زمانے میں یہ 35 روپے بھی بڑے غنیمت تھے۔ میں رضامند ہو گیا اور "کراچی کے بھوت" کے مستقل عنوان کے تحت ہر مہینے میری کہانیاں شائع ہونے لگیں۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ایک نئے عنوان "سہاگ رات" کے تحت بھی کہانیاں لکھوانے لگے۔ اس طرح ہر مہینے 35 روپے کہانیوں کے معاوضے ملنے لگے۔ اپنا سلسلہ مستقل ہونے کے بعد میں خود "مشعل" کے دفتر جانے آنے لگا اور نیر علوی صاحب سے بڑی اچھی انڈراسٹینڈنگ ہو گئی۔ اس پرچے کے مالک انقلاب ماتری تھے اور نیو نچالی کے علاقے میں واقع ان کے گجراتی اخبار کے دفتر سے ہی "مشعل" شائع ہوتا تھا۔ کوئی سال ڈیڑھ سال کے بعد بوجوہ یہ پرچہ بند ہو گیا لیکن نیر علوی سے میری دوستی برقرار رہی۔

"مشعل" کے بند ہونے کے بہت بعد انہوں نے "صداقت" نکالا تو اسی پرانے حوالے سے مجھے اُس ادارے میں رکھا۔ یہ اخبار بھی زیادہ دنوں تک چل نہ سکا۔ ایک بار پھر دربدری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد روزنامہ "انجام" کا بڑے دھوم دھڑکے کے ساتھ اجرا ہوا۔ اس کے فلم ایڈیشن کے انچارج کے طور پر میرا تقرر ہوا مگر ابتدائی اسٹاف میں ہی یہ غنچہ بن کھلے مرجھا گیا۔ انعام درانی المعروف ڈیڈی کے ہاتھوں میں اس اخبار کا نظم و نسق تھا۔ ہماری خوش حالی بھی بن کھلے بدحالی میں بدل گئی اور ایک بار پھر میں بے کاری کے شب و روز گزارنے لگا۔

ایک دن ہمارے ایک دیرینہ دوست ایم الیاس نے مجھ سے کہا۔ "میرے ایک دوست غلام محمد غوری ہیں' وہ "ست رنگ" ڈائجسٹ نکالتے ہیں۔ انہیں ایک بندے کی ضرورت ہے۔ چلو چل کر دیکھ لو کہ تم ان کا مطلوبہ کام کر سکتے ہو یا نہیں؟ ان کے ہاں بنیادی کام تو پروف ریڈنگ کا تھا مگر اس کے ساتھ وہ مجھ سے کہانیاں بھی لکھواتے اور انگریزی ناولوں کی تلخیص بھی کرواتے۔ یہ بھی پارٹ ٹائم جاب تھی' صبح دس سے ڈیڑھ بجے تک۔ اسی دوران منیر حسین صاحب کے فلمی ماہنامہ "فلم ایشیا" کے لیے بھی کبھی کبھی مضامین لکھ دیا کرتا تھا جس کے معاوضے وہ بڑی پابندی سے دیتے تھے۔ ایک دن منیر صاحب کہنے لگے۔ "آدھے دن کی نوکری ہمارے فلم ایشیا میں بھی کر لو۔" اس طرح میں "ست رنگ" کے دفتر سے نکل کر فلم ایشیا جانے لگا تھا۔

کچھ عرصہ گزرا تھا تو ایک روز منیر صاحب نے کہا تھا۔ "ہمارے پاس ہی فل ٹائم جاب کر لو۔" اور میں نے دو پارٹ ٹائم جابس کی جگہ ایک فل ٹائم ملازمت کر لی اور کوئی سولہ' سترہ سال ان کے ساتھ رہا۔ اس دوران میں نے فری لانسر کے طور پر مختلف پرچوں اور ڈائجسٹوں میں لکھا جن میں "ٹی وی ٹائمز" اور "سوہنی ڈائجسٹ" کے علاوہ سسپنس ڈائجسٹ اور جاسوسی دنیا بھی تھے۔

فلم ایشیا میں نے اس لیے چھوڑا تھا۔ ان دنوں میں سخت علیل تھا' جوڑوں کے درد کا عارضہ بڑا پرانا تھا جو ان دنوں اس قدر بڑھ گیا تھا کہ مجھے مکمل علاج اور آرام کی ضرورت تھی۔ چھ مہینے کے مکمل علاج کے بعد میں صحت یاب ہوا تو "لہریں" نام کے ایک ماہنامہ جریدے سے وابستہ ہو گیا۔ یہ سارا پرچہ مجھے اکیلے ایڈٹ کرنا پڑتا تھا۔ ایک سال تک اس پرچے سے وابستہ رہا پھر یہ پرچہ مالکان نے خود ہی بند کر دیا۔ ابھی "لہریں" بند نہیں ہوا تھا کہ میں نے ماہنامہ "سرگزشت" ڈائجسٹ کے لیے ایک فلمی مضمون سابق مشرقی پاکستان کے سابق اداکار رحمان پر لکھ کر دفتر بھجوایا۔ "سرگزشت"..... سسپنس ڈائجسٹ کے ادارے سے نکلنے والا نیا ڈائجسٹ تھا۔ اس کے ایڈیٹر انچارج انور فراز کو یہ تحریر بہت پسند آئی۔ انہوں نے مجھے دفتر بلوایا اور پوچھا۔

"آپ کیا کرتے ہیں؟"

"ایک غیر معروف پرچہ ہے "لہریں" اسے ایڈٹ کرتا ہوں۔"

"کیا پیسے دیتے ہیں وہ؟"

"تین ہزار روپے۔"

"اس پرچے کو گولی ماریں اور ہمارے ہاں مستقل لکھیں۔ آپ کو اس سے زیادہ پیسے ملیں گے۔" اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میرے گولی مارنے سے پہلے ہی "لہریں" کی طبعی موت واقع ہو گئی۔ میں نے "سرگزشت" اور اس ادارے کے لیے بہت لکھا اور بہت کمایا مگر 1992ء میں یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا جس کے بعد میں شہر سے نکلنے والے دیگر ڈائجسٹوں اور میگزینز کے لیے لکھنے لگا اور فری لانسنگ ہی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران میں "اسکرین ڈائجسٹ" کے نام سے ایک نئے فلمی ڈائجسٹ کی ادارت بھی کی۔ الف سے ی تک ساری تحریر میری ہی ہوتی تھی۔ بڑا خوبصورت جریدہ تھا مگر اس کے مالک اپنے دیگر کاروبار کی وجہ سے اس پرچے پر توجہ نہیں دیتے تھے' انجام کار کئی شماروں کے بعد ہی اسے بند کر دیا تھا۔

ایک دن میں روزنامہ ایکسپریس' کراچی کے دفتر محض اپنے کچھ صحافی دوستوں سے ملنے کی غرض سے گیا تھا جن میں سید محمد صوفی اور حیات عزیز نقوی وغیرہ سرفہرست تھے۔ میں ریسپشن میں بیٹھا ان لوگوں سے باتیں کر رہا تھا کہ "ایکسپریس" کے ایڈیٹر نیر علوی دفتر میں داخل ہوئے تو مجھ پر نظر پڑتے ہی میرے پاس آ گئے۔

"ارے یار تم کہاں ہو؟ ایکسپریس کے اجرا کے زمانے میں شہر بھر کے صحافی آ کر مجھ سے ملے مگر تم نہیں آئے؟"

میں نے ان کی محبت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "اس لیے نہیں آیا کہ مجھے ملازمت نہیں کرنی ہے۔ اب میں فری لانسنگ کر کے ہی دال روٹی کا بندوبست کر لیتا ہوں۔" اور پھر ان کے کہنے پر میں نے کچھ دنوں تک وہاں کسی کے بھرا لکھا پھر یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

ایک دن میں ہفت روزہ "نور جہاں" کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ میرے نوجوان صحافی دوست شہنشاہ حسین رضوی آئے' انہوں نے کہا۔ "ایک بری خبر لے کر آیا ہوں اور وہ خبر یہ ہے کہ نگار اور نگار ایوارڈ

www.pdfbooksfree.pk

کے بانی جناب الیاس رشیدی جنت آشیانی ہوگئے ہیں۔ میں یہاں سے سیدھے ان کی میت میں شرکت کے لیے جارہا ہوں۔"

"یار.....! میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ مجھ سے بھی تو ان کا بڑا پرانا رشتہ تھا۔" جب ہم دونوں پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کی رحمانیہ مسجد پہنچے تو میت آخری آرام گاہ پہنچانے کے لیے گاڑی پر رکھی جارہی تھی۔ ہم دونوں بھی اس گاڑی پر سوار ہوگئے جس میں شہر کے تمام ہی فلمی صحافی اور فلمی شخصیات موجود تھیں۔ تدفین کے بعد صلاح الدین پراچہ اور مرحوم کے صاحب زادے اسلم الیاس نے مجھ سے کہا تھا۔

"اچھا ہوا آپ آگئے نہیں آتے تو ہم آپ کے پاس آتے۔ آپ کل نگار کے دفتر ضرور آئیں۔"

میں اگلے روز وہاں پہنچا تو اسلم الیاس اور صلاح الدین پراچہ نے کہا۔ "اب آپ کو ایک ذمہ داری سنبھالنی ہوگی اور وہ ذمہ داری ہے اداریہ نویسی کی۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ دکھی پریم نگری کی وفات کے بعد الیاس صاحب خود اداریہ لکھتے تھے۔ اب یہ کام آپ کو کرنا ہوگا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر آپ لوگوں کو علم ہے کہ میں ہفت روزہ "نور جہاں" میں بھی اداریہ اور ایک مضمون عرصۂ دراز سے لکھ رہا ہوں۔"

"آپ وہاں بھی لکھتے رہیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ہفت روزہ "نور جہاں" بھی نگار کی طرح ایک پرانا فلمی اخبار تھا۔ اس کے بانی اور مالک ایس اے چاؤلہ تھے جن کی وفات کے بعد ان کے دو بیٹوں سعید چاؤلہ اور خالد چاؤلہ نے پرچے کو زندہ رکھا۔ سعید دفتری امور چلاتے، خالد باہر کے کام کرتے۔ سعید چاؤلہ نے اپنی معاونت کے لیے مجھے جز وقتی ملازم رکھ لیا تھا لیکن زیادہ دنوں میں ان کا ساتھ نہ دے سکا پھر خاصے دنوں کے بعد خالد چاؤلہ نے ایک دن فلم ایشیا کے دفتر میں مجھ سے کہا۔ "انور صاحب.....! سنتوش کمار پر ایک مضمون لکھ دیجیے۔"

سنتوش کمار کا انتقال کچھ عرصہ پہلے ہوا تھا۔ میں نے مرحوم کے بارے میں مضمون لکھ دیا تھا.....اور یوں اگلے ہفتہ خالد چاؤلہ پھر موجود تھے۔ "انور صاحب.....! آپ ہر ہفتہ نور جہاں کے لیے ایک مضمون لکھ دیا کریں۔"

"چاؤلہ صاحب! آپ تو جانتے ہیں کہ میں کوئی شوقیہ قلم کار نہیں، یہی لکھنا لکھانا میرا پیشہ ہے۔"

"ٹھیک ہے، آپ لکھیں تو.....میں اپنی استطاعت کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور دوں گا۔" مگر اُن کا یہ "کچھ نہ کچھ" یوں سمجھیے کہ کچھ نہ ہونے کے برابر تھا مگر میں نے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ سلسلہ اُن کے انتقال کے بعد نور جہاں بند ہونے کے بعد ہی ختم ہوا۔ ہاں تو بات نگار کی اداریہ نویسی سے شروع ہوئی تھی جس کے دوران "نور جہاں" کا قصہ بھی آ گیا۔ مرحوم الیاس رشیدی صاحب تو اب دنیا سے گئے تقریباً بارہ تیرہ برس ہو رہے ہیں، میں ان کے انتقال کے اگلے ہفتہ سے لے کر آج تک نگار کے اداریے لکھ رہا ہوں جبکہ درمیان میں کبھی کبھار کوئی مضمون بھی لکھ دیتا ہوں۔

اور اب بات ہو جائے ماہنامہ "سچی کہانیاں" سے میرے تعلق اور رشتے کی۔ جن دنوں نگار کا گولڈن جوبلی نمبر ایک ضخیم رسالے کی صورت میں نکلنے والا تھا، مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ میں ابنِ حسن نگار اور دانش دیروی صاحب سے مل کر نگار اور الیاس رشیدی کے بارے میں ان کے تاثرات لے کر آؤں۔ ابنِ حسن نگار کا تعلق نہ صرف الیاس بھائی سے بڑا پرانا تھا بلکہ نگار حقیقتاً انہی کا پرچہ تھا جسے بھائی الیاس نے خرید کر اخباری صورت میں جاری کیا تھا جبکہ دانش دیروی جس زمانے میں فلم رائٹر ہوا کرتے تھے اُن دنوں ایک عرصہ تک نگار کی ادارت سے وابستہ رہے تھے۔ ابنِ حسن نگار صاحب نے تو اپنا کام یہ کہہ کر میرے سر تھوپ دیا تھا کہ "یار.....! الیاس صاحب سے رفاقت طویل عرصے پر محیط ہے۔ ایسا کرو کہ میں تمہیں کچھ نوٹس لکھ کر دے دوں گا، تم انہیں مضمون کی شکل دے دو۔" مرحوم میرے ایسے سینئرز میں تھے جن کی محبت اور شفقت مجھے ہمیشہ حاصل رہی تھی۔ میں ان کی بات ٹال نہ سکا۔ ان کے دیئے ہوئے نوٹس پر میں نے ایک طویل مضمون "نگار کی کہانی، نگار کی زبانی" کی صورت میں لکھا جو گولڈن جوبلی نمبر میں شائع ہوا.....جبکہ دانش دیروی مرحوم سے ملنے کے لیے مجھے ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے دفتر جانا پڑا تھا۔ وہ بھی میرے سینئر تھے اور بڑی محبت اور شفقت سے پیش آنے والوں میں تھے۔ میں ان کے پاس جو کام لے کر گیا تھا، اس پر تو انہوں نے سرسری سی بات کی البتہ مجھ سے اس بات کی زبردست شکایت کی تھی کہ.....

"انور فرہاد.....! تم شہر بھر کے ڈائجسٹوں میں لکھتے ہو مگر کبھی ہمارے پرچے میں نہیں لکھتے؟"

"آپ لکھنے کو کہیں گے تو لکھوں گا۔"

"تو لکھو نا....." اس طرح ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے لیے بھی میں نے کہانیاں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے۔ اگرچہ دانش دیروی عرصہ ہوا ہم سب سے ناتہ توڑ کر یادوں کی دنیا میں جا بسے ہیں لیکن انہوں نے ماہنامہ "سچی کہانیاں" سے میرا جو رشتہ جوڑا تھا، وہ اب تک جڑا ہوا ہے۔ یہ سلسلہ جڑے کتنے سال گزر گئے، مجھے اس

غزل

تجھ کو شاید نہیں خبر سائیں
عشق کرنا ہے معتبر سائیں

تیرے قدموں میں رکھ دیا خود کو
اب جو چاہے سلوک کر سائیں

اپنے صدمے سے مار دیتا ہے
عشق ملتا نہیں اگر سائیں

تجھ کو چاہا نہیں، خدا کی قسم
تجھ کو پوجا ہے عمر بھر سائیں

بھول جاؤں میں کس طرح سب کچھ
زور چلتا ہے عشق پر سائیں

ساحلوں کی ہوا ہوں آج مجھے
اپنی مٹھی میں قید کر سائیں

عکاشہ سحر

www.pdfbooksfree.pk

کا حساب کتاب یاد نہیں۔ پہلے دانش دیروی' سہام مرزا' شمیم نوید مرحوم وغیرہ پھر سلیم فاروقی' پرویز بلگرامی اور اب منزہ سہام (جنہوں نے مرزا صاحب کی وفات کے بعد ادارہ سنبھال کر بیٹی ہونے کے باوجود بیٹے والا حق ادا کر دیا ہے۔) اور نامور رضا سے یہ رشتہ برقرار ہے۔

میں نے ماہنامہ "سچی کہانیاں" اور دیگر میگزینز اور ڈائجسٹوں کے لیے بھی بے شمار کہانیاں لکھی ہیں لیکن کتابی صورت میں اب تک نہ کہانیوں کا کوئی مجموعہ شائع ہوا ہے نہ کوئی شعری مجموعہ۔ اگرچہ میرے کچھ دوست اور بہی خواہ مسلسل اصرار کرتے ہیں کہ کم از کم شعری مجموعہ تو چھپوالو کہ تمہاری شاعری محفوظ رہ جائے مگر ہم جیسے لوگوں کے لیے بہت سی باتیں چاہنے کے باوجود ممکن نہیں ہوتیں..... میرے بچوں کو شکایت ہے کہ آپ نے ہمارے لیے کیا کیا؟ ایک گھر تک نہیں بنا سکے؟ ہم لوگ آخر کب تک کرائے کے مکان کا عذاب جھیلتے رہیں گے؟ بیوی کو بھی ہمیشہ شکوہ ہی رہا کہ تمہارے گھر میں مجھے کیا آرام ملا؟ میں اُن سے بس یہی کہتا ہوں کہ اللہ نے جس حال میں بھی رکھا ہے' اس کا بڑا احسان ہے۔

پرنٹ میڈیا جب سے بحران کا شکار ہے' اس سے وابستہ ہم جیسے لوگ پہلے سے زیادہ پریشان ہیں۔ میں جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ابتدا ہی سے میری طبیعت ذرا مختلف رہی ہے' وہ جو کچھ لوگ بھیڑ میں گھس کر اپنی جگہ بنا لیتے ہیں' اپنے آپ کو نمایاں کر لیتے ہیں' یہ "خوبی" مجھ میں نہیں جس کی وجہ سے میں دوسروں کی طرح اپنے آپ کو اضافی فائدہ نہ پہنچا سکا بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ نقصان ہی پہنچایا خود کو بھی اور اپنے لواحقین کو بھی۔

اب میری عمر کا آخری پہر ہے' متعدد بیماریاں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ لکھنے کا لا حقہ اگر نہیں ہوتا تو موجودہ زندگی مزید عذاب بن جاتی۔ رب کریم کا شکر ہے کہ لکھنے بیٹھتا ہوں تو سارے غم و آلام سے آزاد ہو جاتا ہوں۔ بنیادی طور پر میرا تعلق شعر و ادب سے تھا جو روزی روٹی کے چکر میں تقریباً ختم ہو گیا تھا لیکن پرانے دوستوں کے مجبور کرنے پر تھوڑی بہت اس جانب بھی توجہ دینی پڑی۔ ادبی نشستوں میں بھی وقتاً فوقتاً شرکت کرتا رہا' ان میں اپنی تحریریں پیش کرتا رہا اور ادبی جریدوں سہ ماہی "روشنائی" سہ ماہی "پیشرفت انٹرنیشنل" سہ ماہی "خیال" اور دیگر جرائد میں نظم و نثر کے حوالے سے چھپتا رہا۔ روزنامہ ایکسپریس میں اکثر غزلیں بھی چھپ جاتی ہیں۔

میں اپنے بچوں اور اُن کے بچوں سے اکثر کہتا ہوں کہ تم لوگ مجھ سے کہیں زیادہ خوش نصیب ہو کہ تمہیں "ماں' باپ اور نانا نانی' دادا دادی کی محبت نصیب ہے جبکہ میں بے چارہ تو لڑکپن میں ہی ماں کی محبت سے محروم ہو گیا تھا اور یہ دُکھ مجھے زندگی بھر تڑپاتا رہا۔ میری زندگی میں محرومیاں اُسی دن سے داخل ہو گئی تھیں جس دن ماں نے میرا ساتھ چھوڑا تھا۔ میرے بچے جب بھی اپنی ماں کے ساتھ بدتمیزی کرتے ہیں تو اُن سے کہتا ہوں۔

"ماں بڑی میٹھی شے ہے' اس کی قدر کرو۔ اس کی محبت ہی ہے جس نے تم لوگوں کو بہت سی محرومیوں سے محفوظ رکھا ہے۔"

اس رب کریم غفور الرحیم کا لاکھ شکر ہے کہ میں اپنی تمام ذمہ داریوں سے تقریباً عہدہ برآ ہو چکا ہوں اور امید تو یہی ہے کہ مجھے بڑے سکون کے ساتھ مٹی اوڑھ کر سونا نصیب ہو جائے گا.....

عائشہ عارف

آپ کی ڈائری کے لیے

ان منتخب شہ پاروں کو آپ اپنی ڈائری میں سجا سکتے ہیں

انتخاب

تقلید

انسان کی جبلت بھی عجب شئے ہے۔ نہ تین۔ میں خوش نہ تیرہ میں۔ قدرت نے ہمیں اشرف المخلوقات بنا کر جہاں دنیا کی تمام مخلوقات پر فضیلت بخشی ہے' وہیں کچھ ایسے جذبات بھی ہماری طبیعت میں شامل کر دیئے ہیں کہ ہم اکثر اوقات اپنے ہی خالق کی ناشکری کر جاتے ہیں۔ کبھی حالات و واقعات کی پریشانی پہ شکوے تو کبھی تقدیر کے ہاتھوں شکست کے گلے لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ سب ہمارا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔ بحیثیت قوم ہماری زندگیوں میں مادہ پرستی کا عنصر اس حد تک شامل ہو چکا ہے کہ اب ہمیں سوائے چمک دمک کے کوئی چیز بھاتی ہی نہیں۔ بڑے بزرگوں سے سنتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب اس معاشرے میں بسنے والے ایک دوسرے کے اتنا قریب تھے کہ ایک ہی خاندان کا گماں گزرتا تھا۔ ہماری اقدار' رسم و رواج اور روایات ہی ہماری پہچان تھیں' لیکن ترقی کے تیز رفتار پہیے نے ہمیں آسائشیں مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ جہاں زندگی کو سہل کر دیا ہے' وہیں اس نے ہماری اسلیت کو کچل کر اس کو بری طرح سے مسخ کر دیا ہے کہ خود اپنی پہچان بھی ممکن نہیں بلکہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم واقعی ایک قوم کی بجائے بے ہنگم ہجوم ہیں اور دوسروں کی تقلید کرتے کرتے ہماری حالت اس کوے جیسی ہو گئی ہے جو ہنس کی چال چلتے چلتے خود اپنی ہی چال بھول گیا تھا۔

ریاض جلیدی کی تصنیف "ہم زندہ قوم ہیں" سے اقتباس

انتخاب: عمران ہارون چھوٹانی' کراچی۔

سرخ شراب

عائمہ بن دربار کے لیے یہ حکم تھا کہ وہ زرتشی اور یہودی عورتوں سے شادیاں نہ کریں اور کنیزوں سے بھی نہیں کہ وہ تو خرید و فروخت کی شئے تھیں مگر رگوں میں خلط ملط خون سے کئی اور فتنے اٹھتے تھے۔ خلیفہ کی بات جداگانہ کہ وہ اپنے طاقت ور سرخ خون کی وجہ سے حاکم بن سکتے تھے اور ترکی کنیزوں نے قصر خلافت میں ہمیشہ حکم چلایا تھا۔ کم سن عباسی خلفاء اپنی ماؤں کے سائے میں تخت پر جلوہ افروز ہوتے تھے اور اس سے پہلے وہ ترک سرداروں کے بچوں کے ساتھ کھیلتے' دھکیلے جاتے اور پٹتے تھے۔ اس نے اس ہجوم بے پناہ کو جو یورش کر کے اس کے گرد جمع ہو رہا تھا' پیشانی پر ہاتھ پھیر کر جھکا اور سوچا۔ "آقا کے لیے اس مرد زنداں نے جو دوا کہی ہے' وہ سرخ

www.pdfbooksfree.pk

شراب ہونی چاہیے۔ خون سے کبھی کسی کا علاج کیا گیا ہے؟ یقیناً سرخ شراب ہی ٹھیک ہے مگر اس شدت اور قہر کی پیاس آخر کیوں؟ شکست اور ناکامی کا علاج خون کیوں؟' وہ لرز گیا۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ 'ہاں' مئے ارغوانی کو اگر نہایت ٹھنڈا کیا جائے' بالکل یخ بستہ تو وہ خون کی رنگ کی مئے ناب تسکین دے سکے گی۔' اس کے جی کے اندر کوئی کہہ رہا تھا۔ 'مرد اسیر کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔ یہ توجیہہ غلط ہے۔ یہ مطلب فضول ہے۔ یہ بات کذب ہے۔' شاید وہ خودکلامی میں اس حد تک منہمک اور اپنے ساتھ مباحثے میں الجھا ہوا تھا کہ اسے اپنی بات کا جواب اپنے عقب میں آتی ہوئی اندھیرے ہوئے کسی کی ایک صورت نے دیا۔ 'خون اور شراب دو الگ چیزیں ہیں اور جو پیاس خون سے بجھے گی' وہ خون ہی سے مٹے گی بشرطیکہ یہ خون' خونِ ناحق ہو کہ اس میں صدیوں تک پکارنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔'

جمیلہ ہاشمی کی تصنیف "دشتِ سوس" سے اقتباس

انتخاب: بابر محبوب۔ کراچی۔

نسوانی غرور

کشور ناہید پہلی نظر میں مجھے سخت بدتمیز لڑکی لگی تھی اور واقعی وہ بدتمیز ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسے اچھے آداب کا علم نہیں۔ وہ رُوحانی طور پر علامتی صوفیوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ بھری محفلوں میں ایسی حرکات کرے جن پر لوگ ملامت کریں۔ وہ کسی کی کوئی بات نہیں مانتی۔ وہ ہر ایک کو للکارتی ہے۔ وہ کوشش کرتی ہے کہ اس کے جانے کے بعد تمام عورتیں اور مرد جی بھر کر اس کی برائی کریں۔ اس سے خار کھائیں۔ اس کو نفرت سے یاد کریں مگر اس کو بھول نہ سکیں۔ اس نفرت سے جو وہ عورتوں کے دلوں میں اپنے لیے پیدا کرتی ہے' اس کا نسوانی غرور بھڑک اٹھتا ہے پر وہ چھلانگ مار کر ان کے دائرے سے نکل جاتی ہے اور کہتی ہے۔ "دیکھو' میں تم میں سے نہیں۔" وہ مردوں سے کہتی ہے۔ "میں ایک چیلنج ہوں۔ میں تمہارے مضبوط جسموں کو نہیں مانتی۔ میں تمہارے فہم و ادراک سے متاثر نہیں ہوں۔ تم محض کن کٹے بیج ہو۔ تم کیا جانتا کھا کر رونے اور افسانے لکھنے لگتے ہو۔ تم کچھ بھی نہیں ہو۔" اور مرد اپنا گال سہلاتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں یا اس کے گرد دھمال ناچنے لگتے ہیں۔ کشور ناہید اس طرح عورتوں اور مردوں کے درمیان پل پر کھڑی دونوں کو نچاتی ہے۔ وہ کسی ایک کے دائرے میں جانے کے لیے تیار نہیں۔ وہ جس سے دوستی کرنا چاہتی ہے' اس کو مختلف طریقوں سے اشتعال دلاتی ہے اور سوچتی کرتی ہے تاکہ وہ اس سے چڑ جائے۔ نفرت کرے اور گالیاں دے۔ اس میں کامیاب نہ ہو سکے تو وہ بے چین ہو جاتی ہے پھر دوسرے سے کرید کرید کر پوچھتی ہے۔ "میرے بعد کس نے کیا کہا تھا؟" وہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی محفل اس پر ملامت کیے بغیر اٹھ جائے۔

احمد بشیر کی تصنیف 'محبتیں چمبری' سے اقتباس

انتخاب: قرۃ العین نسیم۔ ملتان۔

فوائد ہی فوائد

ایک صاحب پرانی کار کے فوائد اور نئی کار کے نقصانات پر روشنی ڈالتے ہوئے بولے۔ "کار جب بھی خریدیں' پرانی خریدیں۔ اولڈ از گولڈ۔ پرانی کار کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ کیا اچھی شے ہوتی ہے۔ نہ کسی کا جی للچائے' نہ کوئی نظرِ بد ڈالے نہ کوئی ہاتھ لگائے۔ ایک شیشہ نہیں چڑھتا نہ چڑھے' کوئی بات نہیں۔ کوئی پتھر سے لکیر کھینچتا چلا گیا تو کیا ہوا' کسی نے کیل سے اپنا اسم گرامی بھی حروف میں لکھ ڈالا' اچھا کیا' برا نہ کیا۔ باہر کھڑی ہے' کھڑی رہے۔ کون لے جائے گا؟ کسی کی مت تو ماری نہیں گئی۔ جہاں جی چاہے' لے جاؤ جتنی دیر چاہے' کھڑی کرو۔ اطمینان سے اپنا کام کرو۔ جب بھی لوٹ کر آؤ' وہیں ملتی ہے جہاں کھڑا کرتے ہو۔ چور اچکے بھلا

کیوں لفٹ دینے لگے ایسی کار کو۔ باڈی اتنی مضبوط کہ برسوں سروس نہ کرائیں۔ نہ گلے سڑے۔ جتنا چاہیں' لوڈ اٹھائیں۔ سیمنٹ کی بوریاں' اینٹیں' کاٹھ کباڑ' جو چاہیں' ڈگی میں بھر کر لائیں' جتنی چاہیں' سواریاں بٹھائیں' کیا مجال سسپنشن چوں بھی کر جائیں۔ کھیے سے ٹکرا جائے' کھیا گر جائے گا' کار کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ ایک ذرا سا ڈینٹ پڑ گیا تو پڑ گیا۔ چھوٹی کار والے تو خود ہی احتراماً ایک طرف ہو جاتے ہیں جیسے کسی سرپرا ہ کی کار ہو۔ واللہ' بات ہی کچھ اور ہے پرانی کار کی۔ پریشان بھی زیادہ نہیں کرتی۔ پیٹرول بھی کم کھاتی ہے۔ اکثر دھکے جو ٹلواتی ہے۔ دھکے ٹلوانا کوئی عیب نہیں' اس میں کچھ فوائد مضمر ہیں۔ گھر کے بیشتر افراد کی صحت ٹھیک رہتی ہے۔ اسی بہانے ورزش ہو جاتی ہے ورنہ اس مشینی دور میں وقت کہاں ملتا ہے ان کاموں کے لیے؟ دل کے مریضوں کی تشخیص میں مدد دیتی ہے' انجائنا کا مریض ذرا دھکا لگا کر تو دیکھے' فوراً پکڑا جائے گا۔ کتنا خوش نصیب ہوتا ہے پرانی کار والا۔ کیسی پرسکون زندگی گزارتا ہے۔ کیسے مزے سے سوتا ہے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر۔ نہ گیراج کی ضرورت محسوس کرتا ہے نہ چوکیدار کی۔ گلی میں کھڑی کرتا ہے اور بے فکر ہو جاتا ہے۔ پرانی کار کم خرچ بالانشین' پائیدار' فائدے بے شمار۔

ڈاکٹر محمد محسن کی تصنیف "اے دوست!" سے انتخاب

انتخاب: نعیم احمد آکاش' حیدرآباد۔

نظرِ ثانی

جو شخص ہم سے لڑتا ہے' وہ ہمارے اعصاب کو مضبوط کرتا ہے اور ہماری استعداد کو تیز تر بناتا ہے' ہمارا مخالف ہمارا مددگار ہے۔ سوچنے کے دو انداز ہیں' ایک یہ کہ جو شخص آپ پر تنقید کرے یا آپ کی مخالفت کرے' آپ اس کو فوراً اپنا دشمن سمجھ لیں اور اس سے نفرت کرنے لگیں' دوسری صورت یہ ہے کہ تنقید اور مخالفت پیش آنے کے بعد آپ اپنے اوپر نظرِ ثانی کریں۔ آپ جھنجھلاہٹ کے بغیر اصل معاملے پر ٹھنڈے طریقے سے غور کریں۔ پہلی صورت میں تنقید اور مخالفت آپ کے لیے زہر ہے' دوسری صورت میں وہ آپ کے لیے آپ کی خوراک بن جاتی ہے۔

مولانا وحید الدین خان کی تصنیف "داعی" سے اقتباس

انتخاب: اشعر جواد۔ کراچی۔

انمول خزانہ

سنہری باتیں

☆غضب کبھی بھی نہایت قابل اور ذہین انسان کو بھی بے وقوفی والی حرکات پر مجبور کر دیتا ہے۔

☆علم ایسا بادل ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت برستی ہے۔

☆صبر اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہونے والا بہت بڑا تحفہ ہے۔

☆انسان کی سب سے بڑی دشمن حرص اور لالچ ہے۔

☆انسان بیماری کے ڈر سے کھانا چھوڑ دیتا ہے' عذاب کے ڈر سے گناہ بھی چھوڑ دینا چاہیے۔

☆دوست کو اپنی ساری محبت دو مگر راز نہیں۔ یہ عمل اُسے کل آپ کا سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا دشمن بھی بنا سکتا ہے۔

☆پاؤں پھسل جائے تو جسمانی چوٹ لگے گی مگر زبان کو نہ پھسلنے دو' یہ رُوحانی چوٹ کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔

مرسلہ: حنا خان۔ کراچی۔

انمول موتی

☆حکمت ایک درخت ہے جو دل میں اگتا ہے اور زبان سے پھل دیتا ہے۔

☆کامیاب ہے وہ انسان جو ضروریات زندگی سے وقت نکال کر خدا کا شکر اور عبادت کرے۔

☆تین چیزیں انسان کو تباہ کر دیتی ہیں۔ حرص'

www.pdfbooksfree.pk

حسد اور غم۔

☆غرور یہ بھی ہے کہ اپنے نیک کام اپنی نظر میں پسندیدہ اعمال دکھائی دیں۔

☆دنیا میں اُن لوگوں کی بہت عزت ہوتی ہے جنہوں نے اپنے استاد کا احترام کیا۔

☆کامیابی کا ایک بڑا راز خود اعتمادی بھی ہے۔

☆آخرت کا کام ہر صورت میں آج کر دینا چاہیے کیونکہ کل آپ کی زندگی کا بھروسا نہیں۔

مرسلہ: عائشہ اشعر جواد۔ کراچی۔

زندگی کیا ہے؟
بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆زندگی ایک مسافر ہے جس کا آغاز مہد اور انجام لحد ہے۔ (حضرت امام غزالیؒ)

☆زندگی نام ہے اپنے کمالات کے اظہار کا۔ اگر تمہارے اندر یہ قوت نہیں ہے تو تم زندہ نہیں ہو۔ (علامہ اقبالؒ)

☆زندگی ایک پینڈولم کی طرح ہے جو آنسوؤں اور قہقہوں کے درمیان جھولتا ہے۔

☆زندگی ایک شمع کی مانند ہے جسے ہوا میں رکھ دیا گیا ہے۔ (بطلیموس)

☆زندگی ہر شخص کو عزیز ہے لیکن بہادر انسان کے لیے عزت زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ (ولیم شیکسپیئر)

☆زندگی ایک ہیرا ہے جسے تراشنا انسان کا کام ہے۔ (جارج برنارڈ شا)

مرسلہ: بینی عمران حیدرآباد۔

آنسو

☆آنسو آنکھ کی سیپ میں چمکنے والے اور بہنے والے موتی ہیں۔

☆آنسو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلنے والا آبِ حیات کا چشمہ ہیں۔

☆آنسو آرزوؤں کے صحرا میں نخلستان کا مژدہ ہیں۔

☆آنسو تنہائیوں کے سب سے بہترین ساتھی اور رفیق ہیں۔

☆آنسو دُعاؤں کی قبولیت کی نوید بھی ہیں۔

☆آنسو ذہنی دوری کی منزل تک پہنچانے والا راستہ ہیں۔

☆آنسو انسان کی ایسی متاعِ بے بہا ہے جسے کوئی چرا نہیں سکتا۔

☆آنسو خوشی و غم دونوں صورتوں میں اظہار کا سب سے سچا ذریعہ ہیں۔

مرسلہ: رضوانہ کوثر۔ لاہور۔

اقوالِ روشن

☆مصنف کی وہ سطر جو اُسے زندۂ جاوید بنا دے اُس کی تمام تصانیف پر بھاری ہے۔ (وارث شاہؒ)

☆اگر دنیا کی تمام سلطنتوں کے تاج میری کتابوں اور میرے مطالعے کے شوق کے عوض میرے پاؤں پر رکھ دیئے جائیں تو میں اُن سب کو ٹھکرا دوں گا۔ (بائل)

☆آدمی مطالعے سے بیدار ہوتا ہے' مکالمے سے اُس میں تمیز آتی ہے اور لکھنے سے اُس کی شخصیت نکھر جاتی ہے۔ (ایمرسن)

☆کپڑے چاہے انسان پرانے ہی کیوں نہ پہنے' لیکن نئی نئی کتابیں ضرور خریدے۔ (آسٹن فلپس)

☆اکثر دیکھا گیا ہے کہ کتابوں کے مطالعے نے انسان کے مستقبل کو بنا دیا ہے۔ (ایمرسن)

مرسلہ: عارفہ مسعود لاہور۔

تلاشِ گم شدہ

☆رشوت کی گلی میں ہمارا ایمان کھو گیا ہے' کہاں ملے گا؟

☆گھر سے اخلاق گم ہو گیا ہے' کہاں ملے گا؟

☆دہشت گردی کی آگ بجھانے والا اسپرے گم ہو گیا ہے' کہاں سے ملے گا؟

☆بے حسی کی بیماری میں لگانے والا خلوص و محبت کا انجکشن گم ہو گیا ہے' کہاں سے ملے گا؟

☆شرافت ہمیں چھوڑ کر کہیں فرار ہو گئی ہے' کہاں سے ملے گی؟

مرسلہ: انور شیخ۔ حیدرآباد۔

عقل کی باتیں

☆ارادے کی طاقت' پیسے کی طاقت سے زیادہ ہے۔ پیسا اگر پادر ہے تو ارادہ سپر پاور ہے۔

☆جو پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے' وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

☆حسد کی بجائے رشک کرو۔

☆کچھ مانگنا ہو تو صرف خدا سے مانگو کیونکہ تمام دنیا کو وہی سب کچھ دیتا ہے۔

☆ہاتھ سے کمانے والا کبھی محتاج نہیں ہوتا۔

مرسلہ: حسین جونیجو۔ بورڈی۔

ذرا مسکرائیے

سوال

ایک امیدوار ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو کے لیے بورڈ کے سامنے پیش ہوا۔ بورڈ کے ممبر نے اُس سے پوچھا۔ "تم کسی جنگل میں ہو' اچانک تمہارے سامنے شیر آ جاتا ہے۔ بتاؤ' اُس وقت تم کیا کرو گے؟"

امیدوار نے کوئی جواب نہ دیا۔ ممبر نے اپنا سوال دہرایا' وہ پھر بھی خاموش رہا۔ اس پر وہ تلخی سے بولا۔ "جواب کیوں نہیں دیتے؟"

امیدوار نے جواب دیا۔ "میں بھلا کیا کروں گا' جو کچھ کرنا ہے' وہ تو شیر کرلے گا۔"

آمدنی

لندن میں ایک پلمبر نے اپنے بریف کیس میں سے چند اوزار نکال کر ذرا سی دیر میں وکیل صاحب کے گھر کا نلکی درست کیا اور اپنا بل انہیں تھما دیا۔ بل دیکھ کر وکیل صاحب چراغ پا ہوتے ہوئے بولے۔

"دو سو ڈالرز فی گھنٹہ؟ میں تو دن بھر میں بھی اتنی رقم نہیں کما پاتا؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" پلمبر نے پورے خلوص سے تائید کی۔ "وکالت کے پیشے میں میری آمدنی کا بھی یہی حال تھا۔"

مرسلہ۔ شازیہ۔ داؤد۔

برق چیز

جج نے شراب پینے کے الزام میں لائے جانے والے شخص سے کہا۔ "تمہیں پولیس یہاں یقیناً شراب نوشی کی وجہ سے لائی ہے؟"

"آپ کا اندازہ درست ہے جناب.....!" شرابی نے جواب دیا۔ "شراب انتہائی بری چیز ہے' نشے میں بہت سے نقصانات ہیں' آدمی بکنے جھکنے لگتا ہے' دوستوں سے بے وجہ الجھ جاتا ہے' یہاں تک کہ کوئی اپنی بیوی پر گولی چلائے تو نشانہ بھی خطا جاتا ہے۔ میں خود دس بار یہ کوشش کر چکا ہوں۔"

بحث

ایک گاؤں میں بڑوی رحیو سے گدھا مانگنے آیا۔ رحیو نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔ "گدھا تو صبح سے تھو لے گیا ہے۔"

اسی دوران اندر سے گدھے کی آواز آئی۔ ہمسائے نے کہا۔ "رحیو' تم یہ کیا کہہ رہے ہو جبکہ تمہارا گدھا تو اندر سے بول رہا ہے؟"

رحیو نے نہایت غصے سے جواب دیا۔ "میں ایسے شخص سے ہرگز بحث نہیں کرنا چاہتا جو میری بات کی بجائے گدھے کی بات پر یقین کرتا ہو۔"

www.pdfbooksfree.pk

بیویاں

امریکا کے ایک شہر کے میئر کو پتا چلا کہ اس کے علاقے میں رہنے والا ریڈانڈین جتنے عدد بیویوں کا شوہر ہے تو فوراً وہ اس کے گھر پہنچا۔

"دیکھو مسٹر.....!" میئر نے ریڈانڈین سے کہا۔ "ہمارا قانون ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی مرد کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں۔ قانون کا احترام کرو' سیدھے گھر جاؤ اور اپنی پانچوں بیویوں کو بتاؤ کہ آج سے وہ تمہاری بیویاں نہیں رہیں۔"

ریڈانڈین نے چند لمحوں تک میئر کے مشورے پر غور کیا' اور اچانک وہ اس طرح کانپنے لگا جیسے اس پر جاڑا چڑھ گیا ہو پھر وہ ہاتھ جوڑ کر لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"میری بیویوں کو یہ بات آپ ہی بتائیں' دوسری صورت میں صبح کے اخبار میں میری تصویر شائع ہوگی اور نیچے لکھا ہوگا۔

"وہ ریڈانڈین جو پانچ بیویوں کے ہاتھوں مارا گیا۔"

مرسلہ۔ شرجیل القدس۔ جیکب آباد۔

سرکاری ملازم

ایک سرکاری افسر سے ملاقات کے لیے ایک صاحب وقفے وقفے سے فون کررہے تھے۔ صبح سے دوپہر تک انہیں مندرجہ ذیل جوابات سننے کو ملے۔ "صاحب تو ابھی آئے ہی نہیں۔ صاحب بس آنے ہی والے ہیں۔ کچھ دیر پہلے صاحب کا فون آیا تھا کہ انہیں آنے میں کچھ دیر ہوجائے گی۔ جی ہاں' وہ آئے تھے لیکن ابھی ابھی بڑے صاحب نے انہیں میٹنگ کے لیے بلالیا ہے۔ جی' وہ ابھی میٹنگ سے نہیں آئے۔ اب تو وہ لنچ کے لیے چلے گئے ہیں۔"

دوپہر دو بجے کے بعد ان صاحب کو مندرجہ ذیل جوابات سننے کو ملے۔ "بس وہ پہنچنے ہی والے ہوں گے' نہیں' وہ ابھی تک نہیں آئے' آپ پیغام دے دیجیے۔ وہ بلڈنگ میں ہی کہیں ہیں۔ ان کی واسکٹ کرسی پر لگی ہوئی ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں' مجھے پکا پتا نہیں ہے کہ وہ واپس آئیں گے یا نہیں؟ جی ہاں' ان کا موبائل آف ہے۔ ارے جناب' وہ آئے تھے لیکن بس دو منٹ پہلے ہی چھٹی کر گئے ہیں۔ اب تو وہ بچے بھی آفس بند ہی ہورہا ہے۔ میرے ہاتھوں میں تالا ہے۔"

سلام

بیٹے نے باپ کے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا حال ہے ڈیڈی' میں ادھر سے گزر رہا تھا' میں نے سوچا' ڈیڈی کو سلام کرتا چلوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں بیٹا۔" باپ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے تمہاری امی بھی ادھر سے گزری تھیں' انہوں نے بھی سوچا کہ مجھے سلام کرتی چلیں' جیب میں موجود سارے پیسے وہ لے گئی ہیں۔"

مرسلہ۔ نوین نقوی۔ جھنگ۔

بزم آرائی

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے
کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے
خطاوار سمجھے گی دنیا تجھے
اب اتنی زیادہ صفائی نہ دے
ہنسو آج اتنا کہ اس شور میں
صدا سسکیوں کی سنائی نہ دے
غلامی کی برکت سمجھنے لگیں
اسیروں کو ایسی رہائی نہ دے
مجھے ایسی جنت نہیں چاہیے
جہاں سے مدینہ دکھائی نہ دے
خدا ایسے احساس کا نام ہو
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

(بشیر بدر)

حسنِ انتخاب: روبینہ سید' کراچی۔

☆

دکھ فسانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
دل بھی مانا نہیں کہ تجھ سے کہیں
آج تک اپنی بے کلی کا سبب
خود بھی جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں
بے طرح حالِ دل ہے اور تجھ سے
دوستانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
ایک تو حرف آشنا تھا مگر
اب زمانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
قاصدا ہم فقیر لوگوں کا
اک ٹھکانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
اب تو اپنا بھی اس گلی میں فراز
آنا جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں
آنا جانا بھی اس گلی میں فراز
اب تو اپنا نہیں کہ تجھ سے کہیں

(احمد فراز)

حسنِ انتخاب: رابعہ مظفر' کراچی۔

☆

دکھوں کی شدتیں' زخموں کی گہرائی مجھے دے دو
مسیحا تم ہو' اذنِ مسیحائی مجھے دے دو
تم اپنی ذات میں خود انجمن ہو' تم کو کیا غم ہے
میں تنہا ہوں' یہ ذوقِ بزم آرائی مجھے دے دو
تم اپنے دل کے دروازے مقفل شوق سے کرلو
بس اپنی ذات سے اذنِ شناسائی مجھے دے دو
تمہارے بعد ہر منظر مجھے بے رنگ لگتا ہے
یہ آنکھیں چھین لو یا اپنی بینائی مجھے دے دو
میں سانسوں میں سمولوں گا تمہاری ہر امانت کو
یہ وحشت ناک سناٹے' یہ تنہائی مجھے دے دو

(اعتبار ساجد)

حسنِ انتخاب: شمیا قیوم' کراچی۔

☆

میری ساری زندگی کو بے ثمر اُس نے کیا
عمر میری تھی' مگر اس کو بسر اُس نے کیا
میں بہت کمزور تھا اس ملک میں ہجرت کے بعد
پر مجھے اس ملک میں کمزور تر اس نے کیا
راہبر میرا بنا گمراہ کرنے کے لیے
مجھ کو سیدھے راستے سے دربدر اس نے کیا
شہر میں وہ معتبر میری گواہی سے ہوا
پھر مجھے اس شہر میں نامعتبر اس نے کیا
شہر کو برباد کرکے رکھ دیا اس نے منیر
شہر پر یہ ظلم میرے نام پر اس نے کیا

(منیر نیازی)

حسنِ انتخاب: شعیب محی الدین فریدی۔ لاہور۔

☆

ستارے بانٹتا ہے وہ' ضیا تقسیم کرتا ہے
سنا ہے جس موسم میں ہوا تقسیم کرتا ہے
تمہاری یاد کچھ ایسے میرے دل پر اترتی ہے
کہ جیسے روشنی شب میں دیا تقسیم کرتا ہے
اسے رد کو کہ باز آئے سراسر ہے پاگل پن
جو ہیروں کے محلوں میں صدا تقسیم کرتا ہے
اسی سے مانگ تو عرفان چھوڑ دے سب کو
جو پتھر میں بھی کیڑوں کو غذا تقسیم کرتا ہے

(عرفان صادق)

حسنِ انتخاب: بیٹا علی۔ اسلام آباد۔

☆

شاید نکل ہی آئیں خزاں کے حصار سے
اب کے ہمیں امید بہت ہے بہار سے
جگنو ہی کردے آ کے مدد ائے تیرگی
گھبرا گیا ہوں طولِ شبِ انتظار سے
معصومیت کی حد ہے کہ ہم اہلِ کارواں
منزل کی راہ پوچھ رہے ہیں غبار سے
خودساختہ محافظِ گلشن سے ہوشیار
محروم کر نہ دیں شجر سایہ دار سے

(رشی عظیم آبادی)

حسنِ انتخاب: اقبال حسین' کراچی۔

www.pdfbooksfree.pk

☆

غبار بن کے میرے راستوں میں رہتا ہے
وہ ایک خواب ہے رت جگوں میں رہتا ہے
کبھی جو ذکر تیرا محفلوں میں چھڑ جائے
تو دل بھی دیر تلک دشتوں میں رہتا ہے
میرے حواس کے ہر کینوس پر ایستادہ
خیال بن کے سبھی منظروں میں رہتا ہے
ہوا بھی اس کا سراپا چُرا کے لائی ہے
وہ آہٹوں کی طرح دشتوں میں رہتا ہے
وہ بن گیا ہے کنارہ کسی سمندر کا
ہے میرا عکس مگر فاصلوں میں رہتا ہے

(سیّد نجیم الدین)

حسنِ انتخاب: فرحان درکی، کراچی۔

☆

جب رونا آئے مُسکائیں
جب دل ٹوٹے، دیپ جلائیں
یہ کم کتھا کا انت نہ کوئی
کتنی بار اسے دہرائیں
پریت کی ریت انوکھی ساجن
کچھ نہیں مانگیں، سب کچھ پائیں
فیض اُن سے کیا بات چھپی ہے
ہم کچھ کہہ کر کیوں پچھتائیں

(فیض احمد فیض)

حسنِ انتخاب: عالیہ، لاہور۔

لوٹ کے آئوں گا

وہ بیتا ماضی تھا
اور یہ آنے والا مستقبل
کتنا فرق ہے دونوں میں
تم نے کبھی سوچا؟
ماضی کی وہ یادیں
مستقبل کی امید میں
کیوں مدہم پڑ رہی ہیں؟
مگر یقین ہے پھر سے
اپنے ماضی کو دہراؤں گا
چھوڑ کر مستقبل کے خواب
اس ماضی میں لوٹ آؤں گا

(امجد اسلام امجد)

حسنِ انتخاب: بنتِ عمران، حیدرآباد۔

شدتیں

بے تحاشا ہے تجھے یاد کیا
اور بھلایا بھی بہت ہے تجھ کو
ساری رونق ہی ترے دم سے ہے
اور ترے بکھرے ہوئے غم سے ہے
جس قدر
میں نے تعلق تراشوں کیا
اتنی گہرائی تو روحوں میں ہوا کرتی ہے
جس قدر
میں نے تری ذات کو خود میں پایا
اتنی یکتائی کہاں ملتی ہے
فاصلے وقتیں کھو بیٹھے ہیں
دوریاں بھیگی پڑیں
اتنی شدت سے تجھے سوچا ہے
اتنی شدت سے تجھے چاہا ہے
شدتیں عشق کی معراج ہوا کرتی ہیں

(فرحت عباس شاہ)

حسنِ انتخاب: ماریہ قیوم، کراچی۔

پیام

میری نگاہیں بھی منتظر ہیں
اسی سحر کی
کہ جس کی کرنیں پیام دیں گی
بلوا ب سے دنیا میں امن ہوگا
کچھ اپنی خوشیوں کا منتظر ہوں
جو گولہ بارود دفن کر کے
محبتوں کو دوام دیں

(عامر سہ علی)

حسنِ انتخاب: ماہ نور، نواب شاہ۔

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' ایک مفید معلوماتی اور مستقل سلسلہ ہے۔ یہ کالم خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے ساتھ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اولین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے استفادہ کیا اور ہزاروں لوگوں نے اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ حاصل ہوتا رہا، اسی تناسب سے ہر ماہ وصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ گزشتہ کئی برسوں میں ان خطوط کی تعداد اتنی تجاوز کر گئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں جواب دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے اپنے جواب کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا کیونکہ پرچے کے صفحات بہرحال محدود ہیں۔ مجھے اس بات کا بھی احساس رہا ہے کہ لوگوں کے مسائل اور مشکلات بہت زیادہ اور فوری حل طلب ہوتی ہیں۔ ان کے لیے طویل انتظار ایک اذیت ناک کام ہے۔ انہی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جواب براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، ان کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں پیسہ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے اور بھلے ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں ہے۔ میری دوسری مصروفیات بھی ہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے اور بس۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور اس سے زیادہ قیمتی تحفہ کوئی کسی کو نہ دے سکتا ہے۔ بہ صد احترام حضرات و خواتین سے درخواست ہے کہ وہ کم سے کم =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ اپنی بساط کے مطابق اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ملک کے دور دراز علاقوں میں بسنے والی اُن خواتین کے جوابات بھی پیسہ ڈاک ہو جائیں گے جو کسی مجبوری کی بنا پر ڈاک خانے تک نہیں جا سکتیں اور =/300 روپے کا منی آرڈر نہیں کر سکتیں۔ یہ ایسی تنگی ہوگی جس کا اجراس دنیا میں بھی ہے کا اور آخرت میں بھی۔ اب تک صرف ممالکِ غیر میں مقیم حضرات نے ازخود تعاون کیا ہے۔ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر اور بے گوناگوں اسباب رکھنا پڑا ہے جو قارئین کے خطوط اور میرے جوابات کو فوری پیسہ ڈاک کرنے کا ریکارڈ مرتب کرنے اور دیگر متعلقہ امور کو سرانجام دینے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری حل چاہتے ہیں تو براہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا پیکٹ ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ لفافے میں بھیجے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ کا نمبر ضرور تحریر کریں۔ وہ تمام خطوط جو =/300 روپے فل منی اور جوابی لفافے کے بغیر موصول ہوں گے، ان کے جوابات حسبِ سابق پرچے میں شائع ہوتے رہیں گے۔ خط ارسال کرنے سے پہلے درج ذیل ہدایات نوٹ فرمالیں۔

(۱) براہِ راست جواب درکار ہو یا کالم کے ذریعے دونوں صورتوں میں اپنا اور اپنی والدہ کا اصل نام تحریر کریں۔ کالم میں اصل نام کی اشاعت مقصود ہو تو اصل نام کے ساتھ کوئی فرضی نام بھی تحریر کریں تاکہ مسئلہ اسی نام سے شائع کیا جائے۔ جان بوجھ کر کوئی فرضی نام اور فرضی پتوں کے خطوط نہ بھیجے جائیں۔ اپنے مسائل پوری سچائی کے ساتھ پیش کریں۔ غلط بیانی سے ہرگز کام نہ لیں۔ اس سے فائدے کی بجائے نقصان کا زیادہ احتمال ہے۔ (۲) منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ صرف ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام سے ارسال کریں۔ (۳) اپنا مسئلہ مختصر، واضح اور کاغذ کی ایک جانب لکھیں۔ ایک خط میں دو سے زائد مسائل تحریر نہ کریں۔ (۴) کوئی عمل یا وظیفہ کرنے میں تو ثمر یا کسی کی پابندی کا عہد کریں اور اپنے لیے دُعا کرنے سے پہلے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے دُعائے خیر کریں۔ (۵) صرف مخصوص وظائف کی اجازت درکار ہو تو لفافے کو بند کرنے کے لیے زیادہ گوند نہ لگائیں، اس طرح خط پھٹ جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عام ڈاک سے بھیجے جانے والے خطوط ہم تک نہیں پہنچتے لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ خط رجسٹری ڈاک سے بھیجے جائیں۔ جوابی لفافے پر مکمل پتا واضح اور خوشخط لکھا جائے۔ فوری جواب کے لیے اپنی ڈاک اس پتے پر روانہ کریں۔

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110۔ آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ۔ کراچی۔

www.pdfbooksfree.pk

ماہِ جمادی الثانی

عزیزو.....!

ماہِ جمادی الآخر کا مہینہ کئی معنوں میں اہم ہے خصوصاً اُن حضرات کے لیے جو عملیات میں دخل رکھتے ہیں۔ اِس ماہ کا شمار ''آتشی'' ہے۔ ایسے تعویذات اور دُعائیں جو آتشی صفتی ہیں اُن کی تیاری اِس ماہ میں سریع الاثر سمجھی جاتی ہے لیکن اس کے لیے کسی کی رہبری اشد ضروری ہے۔ ''آبی'' صفت تعویذات میں نقصان کا احتمال نہیں۔

اِس ماہ کی بیسویں تاریخ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ بزرگوں کے مطابق اِسی تاریخ کو حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ کے زندہ ہونے کی خبر ملی۔ اِسی تاریخ کو گویہ ایوبؑ کا اختتام ہوا۔ اِسی تاریخ کو آنحضرت ﷺ کی صاحب زادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ دنیا میں تشریف لائیں۔ اِس روز روزہ رکھنا' صدقہ دینا' اعمالِ خیر بجالانا بزرگانِ پشت کا دیرہ رہا۔ اِس روز خداوندِ عالم سے مغفرت طلب کرنا حد درجہ افضل ہے۔ طلبِ حاجت کے لیے مندرجہ ذیل دُعا کا پڑھنا افضل ہے لیکن اِس کے پہلے دو رکعت نماز بجالائیں اور بعد سلام مندرجہ ذیل دُعا کو پڑھیں۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّي اَسئَلُکَ بِاَنَّکَ مَلِکٌ وَاَنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیءٍ قَدِیرٌ مُقتَدِرٌ وَبِاَنَّکَ مَاتَشَآءُ مِن اَمرٍ یَکُونُ اَللّٰھُمَّ اِنِّي اَتَوَجَّهُ اِلَیکَ بِنَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحمَتِهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیهِ وَاٰلِهٖ یَامُحَمَّدُ یَارَسُولَ اللّٰهِ اِنِّي اَتَوَجَّهُ بِکَ اِلَی اللّٰهِ رَبِّکَ وَرَبِّي لِیُنجِحَ لِي بِکَ طَلَبَتِي اَللّٰھُمَّ بِنَبِیِّکَ اَنجِح لِي طَلَبَتِي بِمُحَمَّدٍ

پھر اپنی حاجت طلب کرے جو انشاء اللہ پوری ہوگی۔

☐ ز۔ز۔ پنڈی۔

☆ بیٹی! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ جو ہوا' برا ہوا مگر یاد رکھو زیادتی کرنے والا بہت دکھ اٹھاتا ہے۔ زندگی اللہ کی امانت ہے' تم نے اس بارے میں پوچھا جائے گا لہٰذا جو بیت گیا وہ ختم ہوگیا۔ خوب اچھی سی زندگی گزارو۔ اللہ سے بہت دُعائیں کیا کرو۔ بے شک وہ نہایت مہربان آقا ہے۔ بیٹی! نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 7-7 بار سورۃ توبہ آخری آیت فعلی حسبی اللہ سے لے کر عرش العظیم تک ضرور پڑھا کرو۔ سب اچھا ہوگا۔ لاحول ولاقوۃ کا بہت ورد کرو۔

☐ شاہدہ پروین۔ لاہور۔

☆ بیٹی شاہدہ! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ سب سے اہم نماز کی پابندی ہے۔ ہر مسئلے کا حل قرآن میں موجود ہے۔ تمہارا اللہ اور اس کی کتاب پر اعتقاد ہی کامیابی دلائے گا۔ نمازِ فجر کے بعد 1000 بار یا رشیدُ کا ورد کیا کرو اول و آخر دُرود شریف۔ اس کے علاوہ دن میں پانچ بار سورۃ الناس' سورۃ فلق اور آیت الکرسی پڑھ کر گھر کے تمام افراد پر تصور میں دَم کرو۔ کچھ نہ کچھ صدقہ خیرات ضرور کیا کرو چاہے مٹھی بھر جو ہی کیوں نہ ہوں۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے آگاہ کرو۔

☐ طاہر خان۔ خوشاب۔

○ بابا جی! میں آپ کا بہت پرانا مداح ہوں۔ جب بھی کوئی مشکل درپیش آتی ہے' میں آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔ بابا جی! میری بیٹی بہت نافرمان ہوتی جا رہی ہے' اپنی ماں سے بہت بدتمیزی کرتی ہے۔ مجھ سے کافی ڈری سہمی رہتی ہے۔ کوشش کرتی ہے کہ کم از کم سامنے آئے مگر اس کی ماں بہت عاجز آ چکی ہے۔ بچی اب بڑی ہوگئی ہے مار پیٹ بھی نہیں کی جا سکتی۔ آپ مجھے اس کے لیے تعویذ ارسال کر دیجیے۔ لڑکی کی ذات ہے' ضد اور ہٹ دھرمی نقصان کا باعث ہوگی۔ میں خود دبئی میں ہوتا ہوں۔ بچی ماں اور دادی کے ساتھ رہتی ہے۔

☆ بیٹے طاہر! یقیناً تمہارا مسئلہ بہت اہم ہے مگر بیٹے! تھوڑا غور و فکر کرو' کوشش کرو یہ جاننے کی کہ وہ ایسی کیوں ہوگئی ہے؟ تعویذ دینے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر تم مٹکے کی جڑ کو تو جانو۔ تم تھوڑے دنوں کے لیے چھٹیوں پر آتے ہو' تمہاری موجودگی میں حالات ٹھیک رہتے ہیں مگر یہ جاننے کی کوشش کرو کہ تمہاری بیوی اور والدہ کا رویہ آپس میں کیسا ہے؟ یہ بہت اہم ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہاری غیر موجودگی میں گھر میں لڑائی جھگڑا رہتا ہو جس کا اثر بچی پر ہو رہا ہے؟ گھر والوں سے بات کر کے پھر مجھے حالات سے آگاہ کرو۔

☐ شاہینہ سلطان۔ لاہور۔

○ بابا جی! اللہ آپ کو بہت اچھا رکھے۔ میرا اصل مسئلہ میری شادی کا ہے۔ میری عمر 33 سال ہے۔ تمام چھوٹی کزنز کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ میں نے خاندان میں آنا جانا ہی چھوڑ دیا ہے۔ ہر شخص میرے والدین سے صرف میری شادی کے بارے ہی میں پوچھتا رہتا ہے۔ مجھ میں اب لوگوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں۔ میری دونوں بڑی بہنیں اور تینوں بھائی شادی شدہ ہیں۔ بابا جی! آپ سمجھ سکتے ہوں گے کہ بھابیوں کے ساتھ رہنا کتنا مشکل ہے؟ مجھے ایسا وظیفہ دیں جس کی برکت سے جلد از جلد میری بھی شادی ہو جائے۔

○ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ○

بیٹی شاہینہ! مندرجہ بالا آیت ہر نماز کے بعد 33

www.pdfbooksfree.pk

بار پڑھو اور دُعا کرو۔ مایوس ہونے کے بجائے پورے یقین اور اعتقاد کے ساتھ دُعا کرو۔ لوگوں کے رویئے سے کبھی بھی دلبرداشتہ مت ہونا۔ اللہ بھی انہی کی مدد کرتا ہے جو اس کی رضا میں راضی رہتے ہیں۔ وظیفہ کی مدت ایک ماہ ہے۔

☐ شمیم زرین۔ چکوال۔

☆ بیٹی شمیم! وزن کم کرنے کی دوا آج کل تیار نہیں کر رہا ہوں۔ اشیاء دستیاب نہیں۔ جیسے ہی دستیاب ہوں گی مطلع کیا جائے گا۔

☐ فاطمہ سلیمان۔ لاہور۔

o بابا جان! السلام علیکم! میں اپنی صحت کو لے کر بہت پریشان ہوں' چہ ماہ ہوگئے ہیں' کھانسی ٹھیک نہیں ہوتی' کم ہو جاتی ہے مگر ختم نہیں ہوتی۔ ڈاکٹروں کی دوا کھا کھا کر تنگ آ چکی ہوں۔ کھانسی رات میں بہت زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے پوری رات سو بھی نہیں پاتی۔ آنکھوں کے نیچے بہت گہرے حلقے پڑ گئے ہیں۔ میں دیکھنے میں مریضہ لگتی ہوں حالانکہ بابا جی! میری خوراک ابھی اچھی ہے اور ٹھنڈا یا کھٹا میں پہلے بھی نہیں کھاتی تھی۔ مجھے کوئی دوا بتادیں' میں بہت تنگ آ چکی ہوں۔

☆ بیٹی فاطمہ! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بہت سہل طریقہ بتا رہا ہوں' پابندی سے استعمال کرو انشاء اللہ' ضرور شفا ہوگی۔ اور رک کو قاشوں کی صورت میں باریک باریک کاٹ لو پھر اُن پر ہلکا سا نمک چھڑک کر توے پر بھون لو۔ نہار منہ 4-5 قاشیں بسم اللہ پڑھ کر کھا لیا کرو۔ یہ اشافعی کا بہت ورد کرو۔ اللہ ضرور کرم فرمائے گا۔

☐ کلثوم نذیر۔ شیخوپورہ۔

o بابا جی! اللہ آپ کو صحت دے۔ میں شادی سے پہلے سے آپ کے رابطے میں ہوں۔ ہمیشہ آپ سے ہی رہنمائی کی درخواست کی اور اللہ کا احسان ہے' بڑا کرم رہا۔ بابا جی! آپ کی یہ بیٹی اب بڑی دکھی ہے۔ میری شادی کو پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر میری اولاد نہیں ہے۔ بڑا طویل عرصہ صبر کر کے گزارا مگر اب لوگ نہیں جینے دیتے۔ میرے شوہر بھی اکلوتے بیٹے ہیں لہٰذا سسرال میں سب کو بہت آرزو ہے۔ میری ساس تو بہت اچھی ہیں مگر پھوپھی ساس بہت تکلیف دہ باتیں کرتی ہیں حالانکہ وہ خود غیر شادی شدہ ہیں اور ساری زندگی ان کی اپنے بھائی کے ساتھ ہی گزر گئی پھر بھی مجھے طعنے دیتی ہیں۔ سسر بھی بہن کی باتوں میں آ جاتے ہیں لیکن بابا جی! سچ تو یہ ہے کہ بہت وقت گزر گیا ہے اب تو میرے گھر والے بھی پریشان ہوتے ہیں۔ آپ اکثر تعویذ کا ذکر کرتے ہیں مجھے بھی ارسال کر دیں۔

☆ بیٹی مسکین! خوش نہ ہو۔ آباد رہو۔ تعویذ میں ضرور تیار کر دوں گا مگر اس کے لئے مجھے تفصیل درکار ہے۔ اپنا اور اپنی والدہ کا نام' شوہر اور شوہر کی والدہ کا نام ہمراہ تاریخ پیدائش ارسال کرو۔ جوابی لفافے پر واضح اور صاف پتہ لکھو تا کہ جواب تمہیں بھیجا جا سکے۔

☐ رُباب۔ کراچی۔

o بابا جی! میں نے پہلے بھی آپ کو کئی بار اس مسئلے کے لیے خط لکھا' اب پھر لکھ رہی ہوں۔ میں ایک لڑکے کو بہت چاہتی ہوں' وہ بھی مجھے بہت چاہتا ہے مگر شادی نہیں کرتا۔ ہماری محبت کو 5 سال ہو چکے ہیں' دونوں خاندانوں میں تقریباً تمام بڑے یہ بات جانتے ہیں۔ بابا جی! اگر میری اس سے شادی نہیں ہوئی تو میں مر جاؤں گی..... پلیز' آپ اللہ والے ہیں' کچھ کریں۔

☆ بیٹی رُباب..... ایک شخص تم سے محبت کرتا ہے مگر اپنانا نہیں چاہتا' یہ کیسی محبت ہے؟ تمہیں اس

بات کا احساس ہی نہیں کہ وہ تمہیں صرف بدنام کر رہا ہے' مخلص بالکل نہیں ہے۔ اب بھی وقت ہے' اپنا راستہ بدل لو۔ اپنے والدین سے محبت کرو' بہن بھائیوں سے محبت کرو' اللہ اور اس کے نبیؐ سے محبت کرو۔ کامیاب رہو گی۔ نماز پابندی سے پڑھا کرو اور آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر ضرور دم کرو تا کہ شیطان سے محفوظ رہ سکو۔ تم پر صرف شیطان حاوی ہے اور کچھ نہیں۔ اللہ تمہیں محفوظ رکھے۔

☐ تنزیلہ ابراہیم۔ خانیوال۔

o بابا جان! میں سیکنڈ ایئر میں پڑھتی ہوں' پچھلے 3 سال سے امتحان پاس نہیں کر پا رہی ہوں' چاہے کتنی محنت کر لوں' انگریزی کے پیپر میں فیل ہو جاتی ہوں۔ آپ مجھے تعویذ دے دیں تا کہ میں پاس ہو جاؤں۔ سب لوگ بہت مذاق اڑاتے ہیں۔

☆ بیٹی تنزیلہ! تعویذ کے بجائے تم کسی اچھے استاد سے پڑھو۔ تمہیں درست سمت میں محنت کی ضرورت ہے۔ خوب دل لگا کر محنت کرو گی تو ضرور کامیاب ہو جاؤ گی۔ بکثرت رب زدنی علماً پڑھا کرو۔ باوضو رہا کرو اور اللہ سے کامیابی کی دُعا کرو۔ انشاء اللہ ضرور کامیابی عطا ہوگی۔

☐ مجاہد میمن۔ لاڑکانہ۔

o بابا سائیں! میں صرف آپ کے کالم کی وجہ سے ''سچی کہانیاں'' خریدتا ہوں حالانکہ یہ ادھر ہمارے شہر میں بہت مشکل سے ملتا ہے۔ بابا سائیں! میرا مسئلہ بڑا سنگین ہے' کاروباری معاملات بہت خراب ہو رہے ہیں' بہت نقصان اٹھا چکا ہوں۔ جس شخص کے ساتھ کاروبار کرتا ہوں' وہ دھوکہ دیتا ہے۔ سوچ سوچ کر پریشان ہو گیا ہوں' بتایئے کیا کروں؟

☆ بیٹے مجاہد! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ پریشان مت ہو' اللہ سب بہتر کرے گا۔ جب رزق میں بندش محسوس ہونے لگے تو اللہ کے بندوں کو اپنے ساتھ کھانے میں شامل کر لیا کرو' رزق وافر ہو جائے گا۔ یہ انتہائی سہل طریقہ ہے اور اللہ کی نظر میں بہت محبوب بھی۔ تم کوشش کیا کرو کہ بکثرت یَا وَالِیُّ کا ورد کیا کرو۔ مدت 21 روز ہے۔

☐ شازیہ زمان۔ پنڈی۔

o بابا جی! میں بہت پریشان ہوں' مجھے کسی نے آپ کا بتایا تو آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ اللہ کرے یہ آپ کو مل جائے۔ بابا جی! میں اپنی شادی کے 2 ماہ بعد ہی بیوہ ہو گئی۔ میرا خاوند کراچی میں گارڈ کا کام کرتا تھا' کسی نے اس کو گولی مار دی۔ ہمیں 6 ماہ بعد بہت تلاش کرنے کے بعد پتہ چلا کہ اس کو لاوارث جان کر دفن بھی کر دیا۔ آپ سمجھ سکتے ہوں گے کہ مجھ پر کیا گزری؟ میرے ساس سسر بہت بوڑھے ہیں۔ اس سے پہلے ان کا داماد بھی کراچی میں مارا جا چکا تھا۔ یہ وہ بچی اپنے 4 بچوں کے ساتھ رہ رہ کر اب بہو بیوہ ہو گئی' کوئی کمانے والا بھی نہیں۔ جب تک شوہر کا پتہ تھا' ایک امید تھی کہ شاید واپس آ جائے مگر اب تو وہ بھی ختم ہو گئی۔ بابا جی! کچھ ایسا پڑھ کر دیں جس کے پڑھنے سے بھوک نہ لگے۔ ہم کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے اور اب تو لوگ جب تک جتا نہ دیں' مدد بھی نہیں کرتے۔ میرے ساس سسر بہت بیمار ہیں۔ میں انہی کے ساتھ رہتی ہوں۔ چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتی۔ میرے شوہر کے والدین ہیں' کیسے چھوڑ دوں؟ آپ بہت نیک انسان ہیں' میرے لکھے کو کم جانیں اور میرے حال پر رحم فرمائیں۔

☆ بیٹی شائستہ! تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تمہارے شوہر کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ بیٹی!

www.pdfbooksfree.pk

اللہ سے مدد مانگو' وہ ہی اسباب پیدا کرتا ہے۔ یقین رکھو سب اچھا ہوگا' بس ہمت اور مستقل مزاجی رکھو۔ نماز کی پابندی رکھو اور آیت کریمہ کا بہت ورد کیا کرو اول و آخر دُرود شریف کے ساتھ۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ رانا کامران۔ جھنگ۔

☆ بیٹے رانا! تم بہت جلد بازی کا مظاہرہ کر رہے ہو' نقصان اٹھاؤ گے۔ بحث برائے بحث نقصان دہ ہوتی ہے۔ تم بڑے بیٹے ہو' تمہیں مصلحت سے کام لینا ہوگا۔ اپنے اندر بردباری پیدا کرو۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات بہت کیا کرو۔ استغفار بہت پڑھو۔ ضرور کرم ہوگا۔

□ فضا۔ اسلام آباد۔

○ بابا جی! میری شادی کو 4 سال ہو گئے ہیں۔ ایک دفعہ بھی امید نہیں بندھی۔ سسرال والوں نے میرا جینا مشکل کر دیا ہے' میرے شوہر تو سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتے۔ بابا جی! میں بہت پریشان ہوں۔ ندوں کے بچے جب آتے ہیں تو میں منہ چھپائے پھرتی ہوں۔ زندگی بہت مشکل ہو رہی ہے۔ میری ہر اچھائی اس کمی کی وجہ سے صفر ہو رہی ہے۔ میں ہر وقت سوچتی رہتی ہوں' صحت بھی خراب ہو رہی ہے۔ اپنے گھر والوں کو سسرال والوں کے رویئے کے بارے میں بتا بھی نہیں سکتی۔ پلیز' مجھے تعویذ دے دیں' میں بہت پریشان ہوں۔

☆ بیٹی فضا! اللہ پر بھروسہ رکھو' وہ نہایت مہربان آقا ہے۔ میں تمہیں ضرور تعویذ دے دوں گا۔ مجھے تفصیل ارسال کرو۔ صرف ایک بات کہوں گا کہ جب اللہ پاک تمہیں اولاد سے نوازے تب اُن تمام لوگوں کو معاف کر دینا جنہوں نے مشکل وقت میں تنہا کر دیا تھا۔

□ ریحان سید۔ کرک۔

☆ بیٹے ریحان! مجھے تفصیل سے خط لکھو اور لال روشنائی سے مت لکھا کرو' مجھے پڑھنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔

□ سلمٰی رضوان۔ بہاول پور۔

○ بابا جان! میری عمر اس وقت 44 سال ہے' ساری زندگی والدین کے گھر پر رہی' ان کی خدمت کی' ان کی ہر بات مانی' چھوٹے بہن بھائیوں کا بہت خیال رکھا' اپنی حیثیت کے مطابق ان کی شادیوں میں بھی ساتھ دیا۔ میں سرکاری اسکول میں پڑھاتی ہوں لہٰذا جب جب گھر کو ضرورت ہوئی تو میں نے مالی مدد بھی کی لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ جب سے گھر میں داماد اور بہویں آئی ہیں' میری حیثیت میں بہت فرق آ گیا ہے۔ والدین بھی انہی کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ بعض اوقات زیادتی بھی کر جاتے ہیں۔ میں اب بہت افسردہ رہتی ہوں' مجھے اپنا آپ بہت بے کار محسوس ہوتا ہے۔ دل ہر وقت رونے کو چاہتا ہے' میں کیا کروں؟

☆ بیٹی سلمٰی! اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے۔ والدین کی خدمت کی تو اس کا صلہ تمہیں اللہ دے گا۔ بندوں سے کیوں صلہ چاہتی ہو؟ بہن بھائیوں سے شفقت کا رویہ رکھا' اس کا اجر بھی اللہ سے مانگو۔ دکھی مت ہو' تم تو گھر کی بیٹی ہو مگر داماد اور بہوویں باہر سے آتے ہیں' اُن کا بہت خیال رکھنا ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ بھی گھر کے فرد بن جاتے ہیں۔ ہر چیز کو وقت دینا چاہیے۔ تم نماز کی پابندی رکھو۔ دُرود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ بیٹی۔ کراچی۔

☆ بیٹی! تمہارے حالات ایک عرصے سے دیکھ رہا ہوں۔ دُعا گو ہوں کہ اللہ سب پر رحم کرے۔ پتہ نہیں' لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ان لئے سیدھے عملیات کر کے دوسروں کو وہ دنیا میں تو تکلیف اور دکھ دے سکتے ہیں لیکن آخرت میں وہ کیا کریں گے' کیا حشر ہوگا؟ بہرحال تم سورۃ ناس اور سورۃ فلق بہت پڑھا کرو۔ کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کیا کرو۔ دُعا کیا کرو کہ اللہ تم سب کو شیطان اور شیطان جیسے لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ (آمین!)

□ راحت جہاں۔ ساہیوال۔

○ بابا جی! بڑی مشکل سے آپ کو خط لکھتے ہیں پھر بے چینی سے پرچے کا انتظار کرتے ہیں اور اس وقت بڑا دکھ ہوتا ہے جب رسالے میں جواب نہیں ہوتا۔ بابا جی! ہم غریب لوگ ہیں اس لیے آپ بھی ہماری پروا نہیں کرتے۔ حالات اتنے خراب ہیں کہ بتا بھی نہیں سکتی۔ ایک وقت روکھی روٹی کھاتے ہیں۔ بچے ترستے رہتے ہیں۔ میرے شوہر کا ہاتھ آرا مشین میں آ کر کٹ گیا' اب وہ بے روزگار ہے۔ بچے چھوٹے ہیں' سمجھ نہیں آتا' کیا کروں؟ میری بڑی بہن چوری چوری کچھ مدد کر دیتی ہے۔ اس کا شوہر بڑا خراب ہے' ہم سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتا۔ غریب سے کوئی بھی ملنا پسند نہیں کرتا۔ بتائیں' میں کیا کروں؟

☆ بیٹی راحت! تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں جواب دینا نہیں چاہتا؟ بیٹی! خط بعض اوقات مجھ تک پہنچتے ہی نہیں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ خطوط کے جواب دے دوں۔ بہرحال ہمت رکھو' اللہ سے مدد کی طلب گار رہو' وہ نہایت مہربان آقا ہے۔ لوگوں سے کبھی امید مت رکھنا' وہ اللہ کے بہت پسندیدہ بندے ہوتے ہیں جو خلق کی مدد کرتے ہیں اور اس طرح کہ کسی کو بھی پتہ نہ چلے۔ تم نماز پابندی سے ادا کیا کرو۔ ہر نماز کے بعد یَاحمیدُ کا بہت ورد کیا کرو۔ کوشش کرو کہ چڑیوں کو باجرہ ضرور ڈال دیا کرو۔ میں بھی خصوصی دُعا کروں گا۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔ بچوں اور شوہر سے کہو وضو نماز ذاتی کا ورد کیا کریں' کرم ہوگا۔

□ فرزانہ۔ لاہور۔

○ بابا جی! کافی عرصے پہلے آپ سے رابطہ ہوا تھا' کچھ گھریلو مسائل تھے۔ اللہ کا شکر ہے' وہ حل ہو گئے پھر میں اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عرب چلی گئی۔ دو سال پہلے میں بچوں کے ساتھ واپس آ گئی۔ بچے یہاں پڑھائی کر رہے ہیں۔ چھٹیوں میں ہم لوگ سعودی عرب چلے جاتے ہیں۔ بابا جی! مسئلہ یہ ہے کہ یہاں میرے گھر میں میرے ساتھ میری والدہ رہتی ہیں۔ مہمانوں کا آنا جانا رہتا ہے۔ مہمان کیا' سب رشتے دار ہی ہیں۔ کچھ دن قبل میرے کمرے کی الماری سے میرا کافی بھاری سونے کا سیٹ غائب ہو گیا۔ بہت تلاش کیا۔ جہاں سے زیور غائب ہوا' وہاں پیسے بھی رکھے تھے' وہ ویسے ہی تھے' بس سیٹ غائب تھا۔ میں بہت پریشان ہوں' شور مچاؤں گی تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔ بابا جی! مجھے معلوم کر کے بتائیں کہ زیور کس نے غائب کیا ہے؟ ماسی سے میں اپنے سامنے کام ختم کرواتی ہوں' کسی پر بھی شک نہیں' بہت پریشان ہوں۔

☆ بیٹی فرزانہ! پہلے تو اچھی طرح تلاش کر لو۔ اگر زیور بینک میں رکھتی ہو تو وہاں جا کر بھی دیکھ لو۔ بعض اوقات انسان بھول جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے بچوں کی عمریں اور نام تحریر کر دو۔ تم نے یہ بھی نہیں بتایا کہ زیور کتنے روز پہلے غائب ہوا تھا؟ بکثرت پڑھو انا للہ وَاِنا اِلیہ رَاجعون۔ انشاءاللہ ضرور کرم ہوگا۔

□ صوفیہ فرحان۔ Hyd۔

○ بابا سائیں! اللہ آپ کو خوش رکھے۔ میرا مسئلہ بہت سنگین ہے۔ میں ایک لڑکے سے پیار کرتی

www.pdfbooksfree.pk

ہوں' وہ ہماری برادری کا ہی ہے۔ میرے والدین اور بھائی اور لڑکے کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں۔ وہ رسم کرنا چاہتے ہیں مگر میرے بہنوئی اس رشتے کے خلاف ہیں حالانکہ وہ اس لڑکے کے اچھے دوستوں میں ہیں لیکن بہن کے ذریعے میرے والدین کو کہلوایا ہے کہ اگر شادی کی تو میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں گا۔ ہم سب لوگ بہت پریشان ہیں۔

☆بیٹی صوفیہ!

○ قُلْ لَّا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِیْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

مندرجہ بالا آیت نماز فجر اور عشاء کے بعد 101-101 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ معاملات کو تمہارے بڑوں کو سمجھنا چاہیے۔ ماں باپ کو دور اندیشی سے حالات کو سنبھالنا ہوگا۔

□ ندیم احمد۔ کراچی۔

☆بیٹے ندیم! تمہیں براہ راست بھی جواب دیا ہے اور کالم کے ذریعے بھی جواب دے رہا ہوں۔ یقیناً تمہارے حالات بہت تکلیف دہ ہیں۔ ماں باپ کے سامنے اولاد مم توڑ دے' صرف اِس لیے کہ علاج نہ ہو سکے کہ پیسا نہ ہو' بہت تکلیف دہ بات ہے۔ جہاں لوگ روزانہ ہزاروں روپے ضائع کر دیتے ہیں' وہاں ایسے بھی لوگ ہیں جو اولاد کا علاج ہی نہیں کروا سکتے۔ بہرحال بیٹے! دنیا میں ابھی اچھے لوگ باقی ہیں۔ تم اللہ سے مدد مانگتے رہو۔ بیٹے! میں جو بھی ہو سکا' وہ ضرور کروں گا۔

□ نعیم خان۔ نواب شاہ۔

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ جیسے اچھے لوگوں کا سایہ اللہ پاک ہمارے سر پر بہت دیر تک رکھے۔ بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں پڑھائی میں بہت کمزور ہوں۔ مجھے کوئی آسان وظیفہ دیں کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکوں۔ پیارے بابا! میرے لیے دُعا کرنا۔

☆بیٹے نعیم.....! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا کی پڑھو اور دُعا کرو۔ نہار منہ چھے سات بادام ضرور کھایا کرو۔ مدت 41 روز ہے۔

□ جمن۔ دادو۔

○ بابا جی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ میرا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے' وہ یہ کہ میری بس ایک بیٹی کے سوا کوئی اولاد نہیں۔ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں اور یہ خط میں کسی دوسرے سے لکھوا رہا ہوں جب سنا کہ آپ ''سچی کہانیاں'' میں لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں تو سوچا' میں بھی اپنا مسئلہ آپ کو بتا دوں۔ میری شادی کو بہت عرصہ ہو چکا ہے۔ آپ ہم پر احسان کر کے تعویذ دیں کہ بیٹا ہو جائے اور ہم کو یہ بھی بتائیں کہ آپ سے تعویذ کیسے حاصل کریں؟ ہم کو تو آپ کا ایڈریس بھی معلوم نہیں۔ بس آپ اپنے کرم سے ہمیں کوئی آسان وظیفہ بتائیں اور ایک تعویذ بھی دیں کہ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے' بس آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں آپ کو ہمیشہ دُعائیں دیتا رہوں گا۔

☆بیٹے جمن.....! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ تم مجھے جوابی لفافے پر واضح پتا لکھ کر خط اِرسال کرو تاکہ میں تمہیں تعویذ لینے کا طریقہ بتا سکوں۔ خط میں اپنا نام مع والدہ اور بیوی کا بھی مکمل نام لکھو۔

سچی کہانیاں کے قارئین اور لکھاریوں کی سچی اور خیال پر مبنی تحریر

اللہ جانے

ملیحہ سید

رات کے تقریباً 10 بج رہے تھے۔ میں اگلے دن ہونے والے پیپر کی تیاری میں مصروف تھی کہ اچانک میرے موبائل کی ٹیچ ٹون بجی۔ ملیحہ جلدی سے نیوز چینل لگاؤ۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ٹی وی کھولا تو دیکھا' وہی مار دھاڑ' جلاؤ گھیراؤ اور فائرنگ کی خبریں چل رہی تھیں جو میرا اگلا پیپر ملتوی ہونے کا عندیہ دے رہی تھیں۔ یہ آج کل روز کا تماشہ بنا ہوا ہے۔ گزشتہ ایک ہفتے سے کراچی میں معمولاتِ زندگی معطل رہے۔ ان ہی حادثات و واقعات کی بنا پر اب تک میرے دو پرچے ملتوی ہو گئے ہیں اور اب یہ ہی سوچ میری پریشانی میں اضافہ کر رہی تھی کہ ہم لوگ کس سمت جا رہے ہیں؟ ہمارا ملک ایک اسلامی ملک ہے جسے ہم نے اسلام کے نام پہ حاصل کیا ہے جہاں ہمیں نہ صرف مذہبی آزادی حاصل ہو بلکہ اپنی تقدیر اور قسمت کا فیصلہ کرنے کا بھی اختیار ہو۔ ہم پرسکون ماحول میں تعلیم حاصل کر سکیں۔ ہمیں حسبِ منشا معاش حاصل ہو اور ہم مرضی کا طرزِ زندگی بسر کر سکیں مگر یہاں کیا ہے؟ پاکستان اپنے قیام کے وقت سے بلکہ اس سے پہلے ہی انتہائی گمبھیر مسائل کا شکار رہا ہے۔ آج 64 برس کا پاکستان اپنے بیٹوں پر لڑکھڑا رہا ہے اور کسی سہارے کا منتظر ہے۔ کبھی یہ امریکہ کی طرف دیکھتا ہے تو کبھی چین کی طرف..... بس اللہ کی طرف نہیں کہتا جس کے نام پہ بنا ہے۔ شروع سے لے کر آج تک پاکستان کے تمام حکمران مصلحت اور سمجھوتوں کا شکار ہے۔ یہی وہ سمجھوتے ہیں جو قوم کے وسیع تر مفاد کے نام پر قوم کا گلہ گھونٹے جا رہے ہیں۔ کراچی صلحتوں اور سمجھوتوں اور قوم کے وسیع تر مفاد کا سب سے بڑا شکار ہے۔ یہاں بسنے والی مختلف قومیتیں اپنے آپ کو مضبوط بنانا چاہتی ہیں اور یہی سیاسی مفادات عوام کی بہتری کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اب علموں کے تعلیمی سال تباہ ہو رہے ہیں۔ آئے دن کے ملتوی امتحانات طلبا کو ان کے مستقبل سے مایوس کر رہے ہیں۔ اللہ جانے' ہم اس بھنور سے کب نکلیں گے؟ کیا کبھی ہم پاکستانی ہم آہنگی سے رہ سکیں گے؟ اللہ جانے.....!

یقین اور امید

ملک صفدر عباس اعوان' خانیوال

جس طرح موسم بدلنے کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے' اسی طرح وقت کے بدلنے کا بھی ایک موسم ہوتا ہے۔ حالات بدلتے رہتے ہیں' حالات کے ساتھ حالت بھی بدل جاتی ہے۔ رات آجائے تو نیند بھی کہیں سے آ ہی جاتی ہے۔ وہ انسان کامیاب ہوتا ہے جس نے ابتلا کی تاریکیوں میں امید کا چراغ روشن رکھا اور امید اسی خوشی کا نام ہے جس کے انتظار میں غم کے ایام بھی کٹ جاتے ہیں۔ امید کسی واقعہ کا نام نہیں' یہ تو صرف مزاج کی ایک حالت ہے۔ قدرت کے مہربان ہونے پر یقین کا نام امید ہے۔ بقول ناصر کاظمی

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

www.pdfbooksfree.pk

ماں روشنی، باپ چراغ

سید مظر امام بلخی

اس دنیا اور اس معاشرے میں کوئی بچہ شرارت کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں۔ ”کیسے ماں باپ ہیں جو بچہ پر قابو ہی نہیں کر سکتے۔“ ماں کا نام پہلے آتا ہے یا بالکل اسی طرح کوئی بچہ اگر اچھا کام کر جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں۔ ”یہ ہوتے ہیں ماں باپ کی اولاد ہو گی۔“ ماں کا نام پہلے اور باپ کا نام بعد میں آتا ہے۔ میں نے اس بات پہ بہت سوچا اور غور کیا کہ کیا بات ہے اولاد کی پرورش میں ماں اور باپ شانہ بہ شانہ ہوتے ہیں، دونوں مل کر اولاد کو پروان چڑھاتے ہیں لیکن جب ثمر دینے کی باری آتی ہے تو ماں کو ترجیح دی جاتی ہے اور بے چارے باپ کو دوسرے نمبر پر کھڑا کر دیا جاتا ہے؟ دیکھا جائے تو ماں کی عظمت کے مقابلے میں باپ کبھی کچھ کم رتبہ نہیں رکھتا۔ بچوں کی پرورش میں باپ ماں سے زیادہ محنت و مشقت کرتا ہے۔ صبح بچوں کے لیے گھر سے نکلتا ہے روزی کمانے کے لیے جاتے سر میں درد ہو یا جسم ٹوٹ رہا ہو، بخار یا شہر کے حالات خراب ہوں بارش ہو، غرضیکہ کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں اسے کام کرنا ہے۔ مزدوری کے لیے نکلنا ہے۔ وہ سارا دن کام ڈھونڈتا ہے اور دل میں دعائیں کرتا ہے کہ کوئی کام مل جائے تاکہ میرے بچے بھوکے نہ سوئیں۔ صرف یہ ہی نہیں بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے چوری کرتا ہے، رشوت لیتا ہے، کرپشن کرتا ہے، ہیرا پھیری کرتا ہے، غرضیکہ ہر اچھا برا کام اپنی پیاری اولاد کے لیے کرتا ہے۔ اے معلوم ہے کہ وہ جو برا کام کر رہا ہے، وہ غلط اور گناہ ہے لیکن اولاد کی محبت میں یہ پاگل باپ گناہ کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی محنت اور محبت سے پروان چڑھنے والے بچے وقت پڑنے پر ماں کا ہی ساتھ دیتے ہیں۔ شوہر کی وجہ سے اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو اس وقت بچے ماں کا ساتھ دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر بیوی طلع لیتی ہے تو بھی بچے ماں کا ہی ساتھ دیتے ہیں۔ باپ اگر دوسری شادی کر لیتا ہے تو بھی اولاد ماں کا ہی ساتھ دیتی ہے۔ اگر شوہر اور بیوی میں لڑائی ہو جائے اور بچوں کو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں غلطی اُن کی ماں کی ہے پھر بھی ماں کی ہی حمایت لیتے ہیں۔ ایسے تمام مواقع پر باپ کی شفقت کو بھول جاتے ہیں۔ کیا مقصد ہے یہ کہ باپ کا بھی بہت ہی اہم رول ہوتا ہے۔ رب ذوالجلال نے فرمایا کہ ماں میری طرف سے تحفہ ہے۔ ماں کے قدموں تلے جنت ہے لیکن اللہ پاک یہ بھی فرما رہا ہے کہ باپ کی ناراضگی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے۔ باپ کو احترام کا رتبہ عطا کیا گیا ہے۔ اگر ماں اولاد کی خاطر اپنی راتوں کی نیند برباد کرتی ہے تو باپ اپنا چین اور سکون غارت کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ماں گھر کی روشنی ہے تو اس گھر کا چراغ باپ ہے۔ کسی نے کہ ماں گلشن کا دلکش پھول ہے تو میں کہتا ہوں پھول جس شاخ پر ہے وہ درخت باپ ہے۔ ماں کی تخلیق میں محبت اور مہربانی کا خمیر شامل ہے تو باپ ہمت، شفقت اور محنت کا مجموعہ ہے۔ ماں کا دل اتنا وسیع ہے کہ اس میں کائنات سما جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ باپ کا دل اتنا بڑا ہے کہ وہ کائنات کا ہر دکھ اور غم اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ میرے ان چند الفاظ کا مقصد یہ ہے کہ میں آج بتا سکوں کہ والد کی کیا اہمیت ہے۔

زندگی بے بندگی شرمندگی

ملک عاشق حسین ساجد

کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ ہمارا دامنِ سکون اور حقیقی خوشیاں کیوں دور چلی گئی ہیں؟ ہمارے رزق میں برکت کیوں نہیں رہی؟ کیونکہ ہم نماز سے گریزاں ہیں۔ بہت مصروف زندگی ہے ہماری، تعجب ہے ہمارے پاس نماز کے لیے وقت نہیں؟ تلاوتِ قرآن مجید کرنا ہم نے ترک کر دیا ہے۔ فضول قسم کے لٹریچر تو سارا دن پڑھتے رہتے

ں مگر قرآنِ مجید سے دور بھاگتے ہیں۔ والدین کا احترام نہیں کرتے۔ انہیں بوجھ سمجھتے ہیں۔ نافرمانی کو ہم نے معمول بنا لیا ہے۔ رزق میں ملاوٹ یا پھر بے ایمانی کرتے ہیں۔ دوسرے مسلمان بھائی کو دھوکہ دینے کا سوچتے رہتے ہیں اور اولین فرصت میں یہ کام فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔ اسلام سے دوری، اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمان سے روگردانی کریں گے تو ہم کس کس مصیبت اور پریشانی میں مبتلا نہ ہوں گے؟ آیئے سچے دل سے خدا کے حضور گڑگڑا کے سجدے سر سے ایمان داری اور فرض شناسی سے زندگی گزارنے کا عہد کریں۔ مذکورہ برائیوں کو چھوڑ کر راہِ راست پر چلیں تاکہ اللہ کی رحمت اور خلقِ خدا کی دُعاؤں سے فیض یاب ہوں پھر ہمارے پاس دائمی خوشیاں اور بے سکون کی زندگی کے لمحات نصیب ہوں گے۔

دوست

علی انصاری مچھن آباد

اگر چہ ”دوست“ چار حرفوں کا مجموعہ ہے پر اس کی وسعت اور گہرائی کو جاننا ناممکن ہے کیونکہ اس کی گہرائی سمندر سے زیادہ اور اس کی عظمت آسمان سے بھی بلند و بالا ہے۔ رشتے تو سارے ہی عظیم ہوتے ہیں لیکن دوستی کا رشتہ عظیم نے کے ساتھ ساتھ انتہائی نازک بھی ہوتا ہے جو ہلکی سی چوٹ سے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے تو ٹوٹتے وقت اس رشتے کا احساس نہیں ہوتا لیکن جب احساس ہوتا ہے اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے ساری زندگی کا پچھتاوا بن جاتا ہے اور پھر آئے پہلے کی طرح جوڑنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی بہت سے دوست بنائے جنھیں اس کہ دوستوں کے بغیر زندگی ادھوری، بے لطف و بے مزہ ہوتی ہے۔ کچھ دوست بہت ہی خاص اور پیارے تھے پھر ان کے ساتھ ساتھ ہم بچھڑ گئے جدائی کے شب و روز گزرتے گئے۔ کچھ دوستوں کو وقت نے بدل دیا، کچھ نے منہ لیا اور کچھ دوستوں نے میری انا نے ملنے نہ دیا۔ اب میں سوچتا ہوں جو میں نے دوستوں کے ساتھ وقت گزارا وہ خوبصورت تھا، وہ پرمسرت باتیں یاد آتی ہیں۔ اگر چہ آج ہم دور ہیں لیکن ایک دوسرے کی یادیں تو ہمارے پاس فطرت کا یہ قانون ہے کہ کوئی چیز بھی ہمیشہ قائم نہیں رہتی جدائی ہر ایک کے مقدر میں ہوتی ہے۔

کتابِ ہدایت

کرن محمد فاروق حیدر آباد

زندگی کی مثال سفر کی طرح ہے۔ اس زمین پر ہر انسان ایک مسافر ہے، یہ مسافر باشعور اور آزاد ہے۔ ہر ایک اپنے اختیار میں ہے کہ وہ زندگی کے اصول سفر کے لیے کوئی بھی راہ اختیار کرے فلاح کی وہ راہ جو رب العالمین نے دکھائی، اس راہ پر سفر کرنے والے مسافروں کی آسانی کے لیے روشن کتاب عطا فرمائی، وہ واحد کتاب جس کی حفاظت اس ذات پاک کے ہاتھوں میں ہے جس سے بڑا محافظ کوئی نہیں۔ مسافروں کی مزید فلاح کے لیے اس رحمٰن و رحیم رب نے اپنی کتاب کا عملی نمونہ نبی آخر الزماں ﷺ کی صورت میں دنیا کے لیے بنا کر بھیجا تاکہ فلاح کی راہ اختیار کرنے والے یہ مسافر سفر کے مشکل مرحلے میں آپ سے رہنمائی حاصل کریں اور اپنے سفر کی تمام منازل خوش اسلوبی سے طے کر کے اصل منزل پر کامران پہنچیں۔ آج سفر کرتے یہ لوگ اپنی منزل کو فراموش کر بیٹھے ہیں، اس عارضی مسافر گاہ کو مستقل سمجھنے والے نادان مسافر گہری تاریکی میں ہیں کیونکہ اس کے لیے آج بے سکونی اور افراتفری ہے یقیناً یہ ان فطری قوانین سے دوری کی وجہ سے ہے جو اللہ کی کتاب کے وجود ہیں۔ رب کائنات کی یہ مقدس کتاب ہمارے اس سفر کی آسانی اور کامیابی کے لیے نازل کی گئی بدقسمتی سے ہم یہ کتاب پڑھتے ضرور ہیں پر جانتے ہی نہیں، ہم نے کیا پڑھا؟ کتاب نے کیا بتایا؟ بے شک

www.pdfbooksfree.pk

یہ کتاب پڑھنا سعادت ہے لیکن اس کے معنی اور مفہوم سمجھ کر نہ پڑھنا اس سے مستفید نہ ہونے کے برابر ہے۔ زندگی کے کامیاب سفر کے لیے لازم ہے کہ ہم اس کتاب کا مطالعہ کریں۔ اسے سمجھیں تاکہ اپنی منزل پا سکیں وعدہ ہے اس رب کا جو کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

سمندر کی لہریں

کرن شبیر کراچی

سمندر کی لہریں تیزی سے آگے بڑھتی ہیں اور ہم ان کے بڑھنے کا بڑی دلچسپی اور محویت سے نظارہ کرتے ہیں جوں جوں وہ آگے بڑھتی ہیں ہمارے دلوں میں جذبات کی ایک لہر سی اٹھتی ہے۔ ان کے قریب آنے کا جوش بڑھ چلا جاتا ہے۔ ان لہروں کا جوش ہماری توجہ اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ ان لہروں کی کشش ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کچھ یہ ایک عجیب سی کشش ہوتی ہے کہ جوں جوں یہ لہریں ہمارے قریب آتی ہیں ہمارے دل سہم جاتے ہیں غیر ارادی طور پر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہماری آنکھوں میں جو ذیرائی تھی اب تو اور خوف کے ملے جلے تاثرات کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے اور پھر ہم ان سے کتنا ہی دور بھاگیں یہ دور تک ہمارا پیچھا کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہیں اور جب یہ ہمارے پیروں کو چھو کر واپس لوٹتی ہیں تو ہمارا خوف ایک عجیب لطف میں بدل جاتا ہے۔ یہ اپنی واپسی کے نقش کچھ اس خوبصورتی سے چھوڑ کر جاتی ہیں کہ گویا ہمیں اپنی طرف بلا کا ایک بہانہ نہ آس لگی ہوں۔ واقعی کتنی بے خوف کتنی نڈر اور بے باک ہوتی ہیں سمندر کی یہ لہریں۔

کیا یہ ہے پاکستان؟

عبدالعزیز جی ٹی چکوال

میرے وطن کے پیارے لوگو.....! کبھی آپ نے سنجیدگی کے ساتھ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم و ناانصافی کے بارے میں سوچا ہے کہ ہم کیا تھے اور ہمیں کیا بنا دیا گیا ہے؟ بہت پریشان حال ٹینشن زدہ فرسٹریشن کے مارے ہوئے چلتے پھرتے انسانی ڈھانچے..... کام کچھ ہوتا ہے کرتے کچھ ہیں، جانا دائیں طرف ہوتا ہے مڑ بائیں طرف جاتے ہیں، کہنا کچھ ہوتا ہے کہہ کچھ رہے ہوتے ہیں۔ سوچتا ہوں، کیا ہم اپنی حالت بدل پائیں گے؟ حقیقت ہے جو قومیں اپنی حالت خود نہیں بدلتیں، خدا بھی اُن کی حالت نہیں بدلتا۔ بے شک اللہ ہم سے ناراض ہے۔ جیسے ہمارے اعمال ایسے ہم پر حکمران مسلط..... میں بحیثیت پاکستانی اپنے حکمرانوں سے پوچھتا ہوں کہ ہمارا قصور کیا ہے؟ بجلی کے بل ہم ادا کرتے ہیں مگر بجلی غائب پانی کے بل بھی ہم ادا کریں مگر پانی غائب گیس کے بل پابندی سے ادا کریں مگر گیس غائب اور پھر عوام احتجاج نہ کرے تو کیا کرے؟ مہنگائی اس قدر زیادہ ہو چکی ہے کہ ہر چیز قوت خرید سے باہر ہوتی جارہی ہے حالانکہ ہر چیز ہمارے وطن میں پیدا ہوتی ہے پھل اور سبزیوں کی مثال لے لو۔ انسان بھاؤ پوچھ کر شرمندہ ہو جاتا ہے۔ پڑھے لکھے نوجوان ڈگریاں اٹھائے مارے مارے پھر رہے ہیں انہیں جاب نہیں ملتی وہ کیا کریں، کہاں جائیں؟ حکومت آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے قرضے پہ قرضہ لینے جارہی ہے صرف اپنی تجوریاں بھرنے کے لیے۔ آج ہر پاکستانی پر =/66,500 روپے خواہ مخواہ قرض ہے جو روپیہ حکمرانوں کی جیبوں میں چلا گیا اور ان کی عیاشیوں کی نذر ہو گیا وہ ان سے کون وصول کرے گا؟ دوسرا ہر چیز پر ٹیکس اگم ٹیکس سیلز ٹیکس، ویلتھ ٹیکس، صوبائی ٹیکس، صفائی ٹیکس آہ..... ٹیکس ہی ٹیکس..... مر گیا آج کا انسان..... میرے عظیم ہم وطنو.....! اپنے حقوق پہچانو اور حق مانگنے کی اپنے اندر جرأت پیدا کرو۔ اگر آج بھی پاکستانی قوم اپنے حقوق ان حکمرانوں سے وصول نہ کر سکی تو ہماری آئندہ نسلیں ہمارا گریبان پکڑ کر سوال کریں گی۔ ''کیا یہ ہے پاکستان؟''



نئے امکانات کا شاعر

کاشی چوہان

عکاشہ سحر

اُردو شاعری کے کلاسیکی عہد تک شاعر کا ایک شاعر ہونا قادر الکلام شاعر کے لیے معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مصطفےٰ خاں شیفتہ صرف غزل کہتے تھے اُردو اور فارسی میں جبکہ میر، سودا، غالب، مومن اور ذوق ایسے شعراء ہیں جنہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ میر غزل میں بے مثال ٹھہرے، سودا قصیدے کے شہسوار قرار پائے، غالب اور مومن نے غزل میں نام کمایا اور ذوق کی پہچان بھی قصیدہ ہی ہے گو کہ ذوق نے غزل کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔

عہد بدلتا ہے تو اُس کے ساتھ تناظر بھی بدل جاتا ہے۔ طرز احساس میں تبدیلی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ زندگی کے کینوس پر نئے طرز احساس سے پرانے ہی رنگوں کو اس کمال اور ہنرمندی سے استعمال کیا جاتا ہے کہ زندگی اپنے تمام تر رنگوں اور جہات کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ کاشی چوہان بھی ایک ایسا ہی تخلیق کار ہے جس کے پاس زندگی کی بھی نئی ہے اور اُس زندگی کا تناظر بھی نیا ہے۔

کاشی نئے امکانات کا ایسا اور مجبل شاعر ہے جو خیال اور ڈکشن دونوں سطحوں پر ایک نئے محاورے کی تلاش میں ہے۔ اُس کی متاع فکر نئے موضوع، تازہ احساس اور خوبصورت لب و لہجہ سے عبارت ہے۔ فن سے بے لوث وابستگی نے اُسے ایسی دلکشی اور رعنائی عطا کی ہے کہ حمد، نعت، غزل، نظم، نثر ہر صنف میں وہ سہولت سے اپنی بات کہہ جاتا ہے۔ ''اور تم'' اس کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ ویسے تو کاشی کا نام اور کام ''دوشیزہ'' اور ''سچی کہانیاں'' کے قارئین کے لیے نیا نہیں۔ اُس نے جن جن اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اُس سے بھی آپ سب بخوبی واقف ہیں اس لیے ہم یہاں ''اور تم'' کی غزلیات پر ہی بات کریں گے۔

•.....•.....•.....•

تم نے سونا بنا کے مٹی سے
مجھ کو مٹی کے بھاؤ بیچ دیا

کاشی کو چاہتوں میں عذاب اور رتجگوں میں

www.pdfbooksfree.pk

خواب کی موجودگی کا پورا یقین ہے اُس کے یہاں کسی میلان یا رجحان کی کارفرمائی نظر نہیں آتی لیکن غزل اپنے آداب و انداز اور اسلوب کے ساتھ ملتی ہے۔

•.....•.....•

یہ ہمیں خواب دیکھنے کا ہنر
مستقل جاگنے سے آیا ہے

واردات حسن و عشق، ہجر و وصال کا دلگداز بیان اُس کی غزل میں جابجا نظر آتا ہے۔

•.....•.....•

تری آواز سن کر سوچتے ہیں
کبھی ہوتا تھا یہ لہجہ ہمارا

سادہ الفاظ، دلکش تشبیہات، مانوس استعاروں میں زندگی سے جڑے تمام تر مسائل کو کاشی نے تاثیر اور تاثر کی فضا میں بیان کیا ہے۔ یہ فضا قاری کو دیر تک اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ سوز و گداز، سادگی و اثر آفرینی، تازہ کاری، فکری و نفسی میلانات کی نمائندہ اس کی غزل عہد موجود میں مٹتی ہوئی اقدار کی نوحہ گری کی خواہش کے تقطوں پر مرتکز نظر آتی ہے۔ عصری حسیاتی شعور نے اُسے ایک اور غم کدے سے وابستہ کر دیا ہے جس میں آنسو بہانے کے ساتھ ساتھ اقدار کے موتی رلنے کی زیاں کاری کا احساس، اُس کی نازک خیالی کے آئینے کو چمکنا چور کرتا ہے۔

•.....•.....•

سڑکوں پہ جس کی عمر کٹی، وہ بکھر گیا
اچھا وہی رہا جو سرِ شام گھر گیا
اس زخم کے طفیل ہی بھرتا ہے اپنا پیٹ
بھوکے ہی مر رہیں گے جو یہ زخم بھر گیا

•.....•.....•

کاشی کی غزلیات میں فن، تغزل اور ہیئت باقاعدگی کے ساتھ فکر اور فکر کاشی اظہار موجود ہے۔ روحانی کیفیات کے اظہار میں جو اشعار اس مجموعہ کلام میں ملتے ہیں، اُن میں سلاست، برجستگی، روانی اور تازگی ہے۔

•.....•.....•

ترے اطراف آوازیں ہیں تیری
مرے اطراف سناٹا ہے مرا

•.....•.....•

حال کیا پوچھتے ہو حال مرا
میرے چہرے پہ ہی رقم ہے میاں

•.....•.....•

تم کسی بھول میں نہیں رہنا
یہ کبھی زخم میرے اپنے ہیں

•.....•.....•

روشن حسین صبح سی اک شام ہونا چاہیے
کچھ اور اپنے عشق کا انجام ہونا چاہیے

"اور تم" کی غزلیات میں زندگی اور محبت سے جڑے مسائل اور ان مسائل سے پیدا ہونے والے جذبات اور احساسات موجزن ملتے ہیں۔ کاشی چوہان کی غزل ایک شفاف آئینہ کی مثل ہے جس میں معاشرے اور زندگی کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ اُس نے علمی شاعری نہیں کی بلکہ زندگی کو سمجھ کر اس کی تفسیر پیش کی ہے۔ ابہام سے اس کی شاعری کوسوں دور ہے۔

•.....•.....•

راستوں کا نصیب ہوتے ہیں
کچھ مسافر عجیب ہوتے ہیں
جن سے ملتا نہیں ہے دل اپنا
کیوں ہمارے قریب ہوتے ہیں؟
کاروبارِ حیات میں فرصتوں کے پل
کب کسی کو نصیب ہوتے ہیں

"اور تم" کے مطالعے سے ایک بات تو واضح ہوگئی کہ کاشی کی تمام شاعری پیچیدگی اور ابہام سے

پاک ہے، سادہ، سلیس اور عام فہم الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔

کاشی کی غزل میں داستانِ حسن و عشق کے ساتھ ساتھ آشوبِ زمانہ اور سیاسی و سماجی حالات کی شکست و ریخت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ گہرے مشاہدات اور ذاتی تجربات کا عکس اُس کی شاعری کا حسن ہے۔

•.....•.....•

اب اور کیا ہے مرے پاس جو تمہیں سونپوں
تمہارے نام تو کر دی ہے ہر خوشی میں نے
مری کتاب ہے کاشی، کتاب اہلِ نظر
ورق ورق پہ بکھیری ہے روشنی میں نے

کاشی کے اشعار میں تاثیر ہے اور یہ تاثیر سچائی کے اظہار سے پیدا ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری عام و خاص کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

•.....•.....•

سارے موسم اُسی کے موسم ہیں
دھوپ اُس کی، شجر اسی کا ہے
اب وہ دل میں رہے، رہے نہ رہے
یہ ٹھکانہ مگر اُسی کا ہے

•.....•.....•

خامشی توڑنا ضروری ہے
اب مرا بولنا ضروری ہے
منزلیں مل ہی جائیں گی کاشی
پر کوئی راستہ ضروری ہے

کاشی کے لوازمات شاعری عام فہم اور شاعرانہ حسن سے آراستہ ہیں۔ اُس کی شاعری میں زندگی متحرک نظر آتی ہے۔ اُس کی سوچیں عصرِ حاضر کی آب و ہوا میں پنپ رہی ہیں۔ وہ جس عہد میں سانس لے رہا ہے، وہ اُس کے آئینۂ شاعری میں بالکل واضح نظر آتا ہے۔ اُس کی شاعری وجدانی شاعری ہے اور پوری طرح شعریت کے آب و رنگ سے مزین ہے۔

•.....•.....•

کفر کے شہر میں ایمان کبھی
تم نے دیکھا بھی ہے انسان کبھی
اس میں اب جان بھی جا سکتی ہے
عشق ہوتا نہیں آسان کبھی

عصری زندگی کا نہایت ہی گہرا شعور، زندگی کی ٹوٹ پھوٹ ہزار ہا رنگوں کے باوجود بے رنگی ہستی بستی زندگی کے اجڑنے کے کئی شیڈز کاشی کی شاعری میں کثیر الجہات انداز میں دکھائی دیتے ہیں۔ آزاد فضا میں سانس لینے کا جذبہ و احساس بھی مختلف انداز میں دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔

•.....•.....•

مری بستی میں اب انصاف ہوگا
کہ ہاتھوں میں ترازو آ گیا ہے
اجالا سا یہاں دیکھا ہے ہم نے
نظر میں جب وہ جگنو آ گیا ہے

•.....•.....•

رہیں قید کب تک جو تتلیں نہ گھر سے
تو مر جائیں گھٹ کر زمانے کے ڈر سے

•.....•.....•

وہ پتے، وہ سایہ، وہ چڑیاں کہاں ہیں؟
ہوا پوچھتی ہے یہ سوکھے شجر سے

کاشی چوہان کے ہاں ایک نیا منظر نامہ، ایک خوبصورت شعری فضا اور ایک نئی قوتِ نمو شعری کائنات کو ترتیب دیتی ہے۔ اس پر اُس کا غنائی لب و لہجہ اُس کے خوبصورت خیالات کو depict کرتا ہے۔ کاشی کی غزل خوشنما حیرت کا آئینہ ہے۔

•.....•.....•

www.pdfbooksfree.pk

بات گر آدمی کی ہے یارو!
آدمی روز و شب بدلتا ہے

•.....•.....•.....•

اک اک پوچھتا ہے مرا حال شہر میں
بے کار ہے یہ حال مکرم کو اس سے کیا

•.....•.....•.....•

تو پھر کیسے میں گھر میں بیٹھ جاتا
مرے اندر کوئی بے گھر تھا ایسا

•.....•.....•.....•

رقص کرتا ہے درد یوں مجھ میں
جیسے جنگل میں مور ناچے ہے

•.....•.....•.....•

اپنے پھولوں کو بکھرتا دیکھوں
اس قدر تاب کہاں ہے مجھ میں

•.....•.....•.....•

عجیب شخص تھا جو منکشف ہوا مجھ پر
مری نگاہ کو اک روز آئینہ کر کے

•.....•.....•.....•

مجھ کو غم نے سنبھال رکھا تھا
خوش ہوا تو خوشی سے ٹوٹ گیا

کاشی چوہان صنفِ غزل کا فطری رمز آشنا اُس کی مخصوص مزاجی ہیئت اور اُس کے بنیادی داعیات سے پوری طرح باخبر ہے۔ اس کے کلام میں متعدد ایسے اشعار نظر سے گزرتے ہیں جو اس کے غزل شناس ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

آپ کو کیا دکھائی دیں صاحب
ہم تو خود کو نظر نہیں آتے

کاشی کے دل میں دکھ کا کھلا ہوا گلاب ہو یا پھر ہجر کا زخم اس کی شاعری ہر کیفیت اور ہر موسم کو سیراب کرتی ہے۔

•.....•.....•.....•

چڑھ گئی اس پہ بیل نفرت کی
وہ جو اک تھا شجر محبت کا

•.....•.....•.....•

دُعا اس نے بھیجی ہے کچھ اس ادا سے
سدا خوش رہو تم ہماری بلا سے

کاشی کے ہاں مضمون آفرینی، رفعتِ خیال، اسلوبِ بیان اور اُس پر بلا کی سادگی درجۂ کمال پر نظر آتی ہے۔ وہ نہ صرف بات کرنے کے ہنر سے آشنا ہے بلکہ اس کے پاس کہنے کے لیے باتیں اور مضامین تازہ موجود ہیں۔ وہ معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد اور حساس تخلیق کار ہے۔

گھروں میں بیٹھنے والوں کو کیا خبر اُن کی
وہ تجربے جو ہمیں رہگزر میں ہوتے ہیں

کاشی چوہان، میرے بھائی نے پورے چاند کی اِس مہکتی رات کی مقدس و پاکیزہ ساعتوں میں اپنی ہتھیلیوں پر دُعاؤں کے چراغ جلائے۔ خداوند کی بارگاہ میں درخواست گزار ہوں کہ وہ تمہارے قلم کو مزید روانی، سوچ کو وسعت اور تمہیں مزید علمی بصیرت سے نوازے۔ تم جیو، بہت جیو۔ (آمین!)

☆☆☆

کتاب تبصرہ

وہ شاعر حضرات جن کی خواہش ہے کہ اُن کی کتابوں پر بھی تبصرہ شائع کیا جائے، اُن سے گزارش ہے کہ اپنی مطبوعہ کتاب کی دو عدد جلدیں ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے پتے پر ارسال کر دیں۔

پسند اپنی اپنی

قارئین کے پسند کردہ اشعار، ادبی ذوق کے آئینہ دار

فیصل ہاشمی.....ردا نواب، سایہ وال
گر پڑے تو اٹھا کے چوم لیا
میں نے لفظوں کا احترام کیا

تہذیب حافی.....ارتقاء علی، جہلم
میری آنکھوں پہ دو مقدس ہاتھ
یہ اندھیرا بھی روشنی ہے مجھے

کاشف مجید.....نوید ہ خان، ملتان
گلاب جس کے لیے ہیں، اسے خبر کر دوں میں
وہ دن بھی آئے کہ اُس کی طرف سفر کر دوں میں

عمران نزی.....سبھی کل محمد، بھوربن
کچھ مکمل نہیں ہے دنیا میں
گویا یہ بات بھی ادھوری ہے

فرخ اظہار.....معاذ خان، اٹک
زندگی کچھ دنوں کی ہے اور میں
کچھ دنوں سے بہت پریشان ہوں

توقیر تقی.....فرزانہ بشیر، لورالائی
تو ذرا دل پہ ہاتھ رکھ کے بتا
کیا مری بات میں اثر نہیں کچھ

اکبر معصوم.....مقصود بلوچ، دادو
نیند میں جاگتا رہا ہوں میں
خواب کی دھن بنا رہا ہوں میں

انعام ندیم.....فریحہ پارکھ، جھنگ
دیے جلائے گئے یا دیے بجھائے گئے
ہر ایک رسم کا آغاز میرے گھر سے ہوا

وجیہہ عالی.....فاخرہ بتول، کراچی
یہ سوچ کر شکست ہم مسکرا دیئے
ناکامیوں نے جیت کے پیغام تو سکھا دیئے

صغیر بلال.....انجیلینا داود، ہالینڈ
لوگ اُس شہر کو خوشحال سمجھ لیتے ہیں
رات کے وقت بھی جو جاگ رہا ہوتا ہے

شاہین عباس.....غفران احمد، سرسٹہ
عشق میں دہری مشقت کی ہے
حالتِ ہجر میں ہجرت کی ہے

افضل گوہر.....ربینہ بیگم، گوجر خان
سوچا تھا اب کی بار کنارے پہ جاؤں گا
دریا بھی میرے ساتھ نئی ناؤ میں آ گیا

فہیم شناس کاظمی.....عادر شید، کراچی
یاد کیا اُس کی گلی کو رکھیے
دھیان سے اپنا مکان جاتا ہے

اجمل سراج.....رضوانہ کوثر، لاہور
اجمل سراج ہم اُسے بھولے ہوئے تو ہیں
کیا جانیے کیا کریں گے اگر یاد آ گیا

میر احمد نوید.....غیاث الدین، پشاور
اب تو کر لیجیے سماعت آپ قصہ عشق کا
آہ تک لے آئے ہیں ہم مختصر کرتے ہوئے

حسین جاوید.....علقہ، لصبیر، سوات
کسی بھی دل میں ہمارے لیے جگہ نہ بنی
زمین اپنے لیے خانۂ خدا نہ بنی

محسن اسرار.....شعبان کھوسہ، کوئٹہ
عجیب شخص تھا، لوٹا گیا میرا سب کچھ
معاوضہ نہ لیا دیکھ بھال کرنے کا

زرسا چغتائی.....سلمان عمرانی، سجاول
میں یونہی ہاتھ بڑھائے رکھوں
چاہے کچھ ہاتھ نہ آئے میرے

سید زاہد حیدر.....نواب علی، ٹھٹھہ
دفن ہیں جانے کتنے خواب
دل یا قبرستان ہے سائیں

سحر تاب رومانی.....راحمہ مغیر، ملتان
بات دل کی کھی، دل سے ہو جاتی
بیچ میں تم دماغ لے آئے

www.pdfbooksfree.pk

علی زبیر.....آئینہ مغل' خانیوال
ہے عجب عشق کا کیلنڈر بھی
مستقل ہجر کا سن آتا ہے

عباس تابش.....قیصرہ علی' کراچی
پانی آنکھ میں بھر کر لایا جا سکتا ہے
اب بھی جلتا شہر بچایا جا سکتا ہے

کاشف حسین غائر.....ایم سعید انور سعید' لاہور
خیال و خواب میں آئے ہوئے سے لگتے ہیں
ہمیں یہ دن بھی بتائے ہوئے سے لگتے ہیں
دیے ہوں' پھول ہوں' بادل ہوں یا پرندے ہوں
یہ سب ہوا کے ستائے ہوئے سے لگتے ہیں

ذوالفقار عادل.....فہد بیگ قادری' ہزارہ
ہمارے دل میں حوالے ہیں ساری یادو کے
ورق ورق اسی دفتر سے ہو کے جاتا ہے

حنا تیموری.....عاصم خان نیازی' میانوالی
کہتے ہیں تجھ کو لوگ مسیحا مگر یہاں
اک شخص مر گیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

کاشی چوہان.....تنویر فاطمہ' ایبٹ آباد
چاند سے عشق کر لیا ہم نے
رات میں رنگ بھر لیا ہم نے
اس طرح بھی تمہاری لاج رکھی
ہر گناہ اپنے سر لیا ہم نے

لیاقت علی عاصم.....ملکانی راشدہ' ٹنڈو محمد خان
بھری گلی سے گزرتے ہیں بے سروسامان
ہمیں تو شرم ہی آتی ہے گھر بدلتے ہوئے

شاہین عباس.....صفیہ کریم' چکوال
اک نقش ہو نہ پائے اِدھر سے مرا اُدھر
جیسا تمہیں ملا تھا میں' ویسا جدا کرو

اکبر معصوم.....انزلہ تاج' فیصل آباد
مجھ سے شکوہ تو ایسے کرتے ہو
جیسے میں زندگی بناتا ہوں

رومانہ روی.....عندلیب خان' پشاور
عشق نے ایک عجب حال میں رکھا دل کو
ہم کو اپنی بھی نہ تھی کوئی خبر صحرا میں
یہ تو احساس کی ہے بات' اسے کیسے کہوں؟
کس قدر ہونا پڑا خاک بسر صحرا میں

عباس تابش.....نائلہ اکبر' چیچہ وطنی
اسی لیے تو اندھیرے بھی کم نہیں ہوتے
کہ اپنے جسم چراغوں میں ضم نہیں ہوتے
اور اب ہے اس لیے افسوس اپنے ہونے کا
کسی کے ہو گئے ہوتے تو ہم نہیں ہوتے

اشرف جاوید.....زوہیب گل' ہزارہ
ہوگا یہیں کہیں یہ پرندہ پڑا ہوا
پتوں کے ساتھ پر ہے اسی کا پڑا ہوا
دریا کی موج موج میں صحرا ہے گامزن
صحرا کی لہر لہر میں دریا پڑا ہوا

شاکر کنڈان.....نرمین خٹک' جہلم
دیکھ' ظلمت میں بہت حد سے زیادہ نہ گزر
یہ نہ ہو گونج اٹھے صوتِ سرافیل ابھی

شاہدہ حسن.....صولت مرزا' واہ کینٹ
کٹھن گھڑی میں بھی کوئی نہ آس پاس ملا
صدائیں دے کے دل خوش گماں نے صبر کیا

رمزی آثم.....جہاں آراء' لالہ موسیٰ
ردائے خاک نہیں آسمان ہے یہ بھی
کبھی کبھار تو ہوتا گمان ہے یہ بھی
میں اپنی ذات کے اندر بھی جھانک لیتا ہوں
کہ حیرتوں سے بھرا اک جہان ہے یہ بھی

نینا عادل.....اقراء قمر' ملتان
وصل ہوتا ہے کیا' ہجر کا آئینہ
میں تجھے ڈھونڈتی ہوں ترے روبرو
ان نگاہوں میں سمیٹیں اگر دو جہاں
ایک میں ہوں اِدھر' ہے اُدھر ایک تُو

نوٹ: شعر کے ساتھ شاعر کا نام ضرور لکھیں۔ شاعر کے نام کے بغیر شعر شاملِ اشاعت نہیں کیا جائے گا۔ (انچارج) پسند اپنی اپنی

www.pdfbooksfree.pk

طویل کہانی "سچی کہانیاں" کی ایک مقبول و معروف لکھاری کی طویل کہانی، اقساط میں

فاطمہ بلگرامی

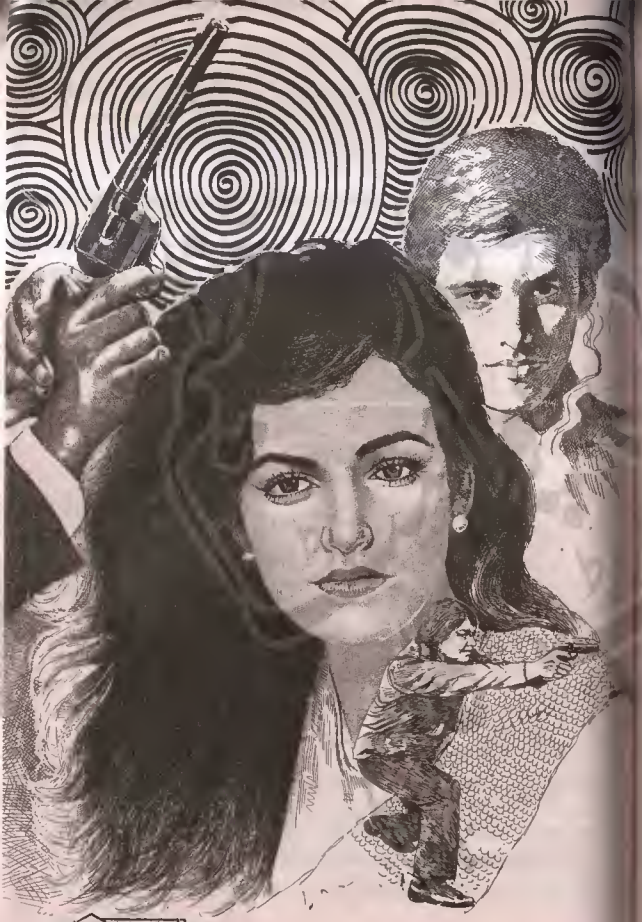
جن آنکھوں میں حیا ہے

شاہد بخاری کا خیال

اب وہاں یادوں کا بکھرا ہوا ملبہ ہی تو ہے
جس جگہ عشق نے بنیاد مکاں رکھی تھی

سچی کہانیاں کی معروف سینئر لکھاری کا دلچسپ و تحیر خیز سلسلہ۔ قسط نمبر 5

خلاصہ: داؤد عرف ڈیوڈ کی ماں میری ایک انگریز عورت تھی جس نے ایک ایشیائی اقتدار المالک نامی شخص سے شادی کی تھی..... اس رشتے کی پاداش میں میری کے ارب پتی باپ لارڈ ڈلفی نے اسے جائیداد سے عاق کر دیا تھا۔ اسی دوران حالات نے اسے اپنے شوہر سے جدا کر دیا..... اس کے بعد میری نے اپنے بیٹے کے ساتھ لندن میں بہت مشکل زندگی گزاری اور مر گئی۔ لارڈ ڈلفی کی موت کے بعد یہ وصیت سامنے آئی کہ اس نے اپنی تمام جائیداد کا وارث میری کے بیٹے ڈیوڈ کو قرار دیا ہے لیکن داؤد عرف ڈیوڈ یہ جائیداد قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے جب کہ لارڈ ڈلفی کی اس جائیداد پر ایک یہودی گروپ کی بھی نظر ہے۔ داؤد کی اس گروپ سے ایک جھڑپ بھی ہوتی ہے۔ لندن میں ہی بہن بھائی جیسے رشتوں سے محروم داؤد کی ایک پاکستانی فیملی سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ اس فیملی کی ایک لڑکی کو بہن بنا لیتا ہے لیکن وہ لڑکی داؤد کو بھائی نہیں سمجھتی اور ایک ایسا قدم اٹھاتی ہے کہ داؤد کی عزت داؤ پر لگ جاتی ہے۔ حالات کا مارا داؤد پاکستان اپنے باپ اقتدار المالک کے پاس جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جہاں وہ شادی کے بعد ایک بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہ رہا ہے۔ جہاز میں سفر کے دوران اس کی ملاقات فاطمہ نامی ایک نہایت موڈلز کی سے ہوتی ہے جو اسے پاکستان میں ملنے کے لیے وزیٹنگ کارڈ بھی دیتی ہے۔ داؤد پاکستان آتا ہے تو اسے باپ ہی نہیں اپنی سوتیلی ماں اور اس کی بیٹی نمیحہ سے بہت پیار، محبت اور شفقت ملتی ہے۔ داؤد اپنی دولت کے ذریعے ان لوگوں کی زندگی میں آسانی اور آسائش لانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ پاکستان میں داؤد کی اپنے باپ سے جڑے رشتے داروں سے ملاقات ہوتی ہے۔ انہی میں ایک بہت خوبصورت ذہین اور حاضر جواب لڑکی عنیزہ بھی ہے جو داؤد کو اچھی لگتی ہے..... اور ایک رشتے دار رابیل اختر سے بھی ملاقات ہوتی ہے جس نے پولیس آفیسر ہونے کے باوجود جیل کاٹی ہے اور وہ منشیات کا عادی بھی رہ چکا ہے۔ پاکستان میں داؤد کو اس لڑکی راحیلہ کا ایک طویل خط ملتا ہے، جسے داؤد نے بہن سمجھا ہوتا ہے لیکن وہ داؤد کو محبوب سمجھ کر اس کی بدنامی کا باعث بن گئی تھی۔ یہ خط راحیلہ نے مرنے سے پہلے تحریر کیا ہے۔ **اور اب آگے پڑھیے:**



www.pdfbooksfree.pk

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ امی مجھ سے میری بہن کی شادی کیوں کرانا چاہتی ہیں، کیا فہمیدہ میری بہن نہیں ہے؟ کیا وہ ابو کی بیٹی نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ شخص دے سکتا ہے۔ اسی سوچ کے تحت میں نے اس سے کہا "اگر مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ چل کر ایک کپ چائے پی لیں۔"

"کیوں نہیں، آپ کی دعوت کو ٹھکرانا عنبر کو ناراض کرنا ہے، میں نے اس دن ہی محسوس کرلیا تھا کہ وہ آپ کو خاص اہمیت دے رہی ہے۔ پھر چچی جان کے ہر رشتے دار کو میں خاص اہمیت دیتا ہوں، وہ تو ایک ہیں جنہوں نے میری خاطر سب سے لڑائی مول لی۔ ان کا احسان میں چکا نہیں سکتا۔" اس نے معصوم سے لہجے میں کہا۔ وہ کسی رخ سے مجھے ہیرو مین کا عادی نہیں لگ رہا تھا پھر عنبر نے اسے ہیرو مین کا عادی کیوں کہا تھا۔

میں اسے لے کر زوبی کی رسٹورینٹ میں آیا۔ ایسے رسٹورینٹ میں لوگ کم کم ہی آتے ہیں۔ شاید چیزوں کی قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے۔ اس وقت بھی بہت کم لوگ نظر آرہے تھے اس لیے میں اسے یہاں لے کر آیا تھا۔ کونے کی ایک خالی میز دیکھ کر میں ادھر ہی بڑھتا چلا گیا۔ پھر میں نے پوچھا۔ "کچھ کھانے کا ارادہ ہے؟ منگواؤں؟"

"آپ مہمان ہیں آپ بل نہیں دیں گے تو منگوا سکتے ہیں؟" اس نے صاف جواب دیا۔

"مگر لے کر میں آیا ہوں اس لیے بل دینا میری ذمے داری ہے آپ صرف آرڈر دیں گے۔" کہہ کر میں نے بیرے کو اشارہ کیا۔ وہ مینو لے کر آگیا۔ میں نے مینو نوٹ کرایا پھر بولا "ایک بات پوچھوں آپ برا تو نہیں مانیں گے؟"

"یقیناً آپ پوچھیں گے کہ عنبر نے مجھے ہیرو مین کا عادی کیوں کہا تو سن لیں اس نے غلط نہیں کہا ہیں ہی نہیں۔ میری بیوی بھی عادی تھی۔"

"گویا اب آپ نے اس سے نجات حاصل کرلی۔"

"جی ہاں مگر ایک آگ کا دریا تھا جسے ہم نے پار کیا آپ فلمیں دیکھتے ہیں؟"

"جی ہاں!"

"میری کہانی بھی کسی فلم کی کہانی جیسی ہیں۔ اور میں بلا جھجک سنا دیتا ہوں۔ اگر آپ کے پاس وقت ہے تو میں سنانے پر تیار ہوں کو کیسے میں نے شادی کی؟ کیوں ہیرو مین کا عادی بنا' کیوں جیل بانڑا کی۔"

کسی سے کوئی راز کی بات معلوم کرنا ہو تو پہلے اس کے دل میں جگہ بنانی پڑتی ہے اسی لیے میں نے اس کی کہانی سننے پر خود کو راضی کرلیا اور اثبات میں جواب بھی دے دیا۔

"تو سنیں میں ایک ایک بات جزیات کے ساتھ سنا دیتا ہوں۔ اس دن میں ڈیوٹی سے واپس آرہا تھا مگر جیسے ہی گلی میں داخل ہوا ٹھٹک کر رک گیا۔ میری نظریں اس پر جم گئیں۔ اس وقت میری کھلتی ہوئی عمر تھی۔ ایسی عمر جو خرمستیوں پر اکساتی ہے۔ لیکن امی کی بندشوں اور بے جا سختیوں نے میرے اندر سنجیدگی پیدا کردی تھی۔ میں نے پچپن سے سیدھے بڑھاپے میں چھلانگ لگائی تھی۔ اسی لئے ہر بات کو عقل کے میزان پر تولنے کی عادت بھی پھر بھی میں ٹھٹک گیا تھا۔ گلی کے موڑ پر آتے ہی میری نگاہیں اس کار پر جم گئی تھیں۔ کار میں روشنی تھی' اندر ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ کار کا بونٹ کھلا ہوا تھا اور سرخ کپڑوں میں ملبوس ایک دوسری نوخیز لڑکی بونٹ پر جھکی ہوئی تھی' لیپ پوسٹ کی ٹمٹماتی روشنی' میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لڑکی کسی ماڈرن

گھرانے کی ہے۔ اس کے کپڑے بھی میرے خیال کی تائید کررہے تھے۔ ایسے جدید تراش کے کپڑے اس گلی میں شاید ہی کوئی پہنتا ہو۔ ان کپڑوں کی وجہ سے اس کا حسن جھلک اٹھا تھا۔ اس نے ایک پل کے لئے میرے طرف دیکھا اور وہی لمحہ مجھ پر بجلی بن کر گرا تھا۔ دل بڑے زور سے دھڑکا تھا اور پہلی بار کسی میں دلچسپی لینے کے لئے مچلا تھا۔

لڑکیاں میں نے ہزاروں دیکھی تھیں۔ اچھی بھی اور بری بھی۔ ان کی نگاہوں کو پیروں سے لپٹتے ہوئے بھی محسوس کیا تھا۔ مگر کبھی رکا نہیں' کسی میں دلچسپی نہیں لی ایک پولیس آفیسر کے پاس ان فالتو باتوں کے لئے وقت ہوتا ہی کب ہے۔ جب تک کالج میں رہا امی کی نگاہیں محاسبہ کرتی رہیں اور جب پولیس انسپکٹر بنا تو ذمے داریوں کے احساس نے موقع نہ دیا۔ یہ تو پہلا موقع تھا جب میرے دل میں ہوک سی اٹھی تھی۔ کوئی میٹھی گدگدی سی مچا گیا تھا۔ بالکل فلمی انداز تھا۔ مگر ابھی تک دلچسپی یک طرفہ تھی۔ میں بونٹ پر جھکی لڑکی کے کھلے ہوئے کمر تک جھکے بالوں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ واقعی شاعروں نے سچ لکھا ہے بال ہوتے ہی ہیں ناگن جیسے۔ ایک نظر میں ڈس لیتے ہیں' اس کے بال تو جوانی کے خطرناک موڑ کی طرح خم کھائے ہوئے تھے اور ایسے گھنے سیاہ تھے کہ اس تاریک صحرا میں کوئی بھی مسافر راستہ بھٹک سکتا ہے۔ پتا نہیں کس کی قسمت میں اس کنواری زلفوں کی خوشبو ہو گی' کون خوش نصیب ان زلفوں کی چھاؤں میں رات بسر کرے گا۔ کسے زلفوں کی سیج نصیب ہوگی؟ میں تو ایسا خوش نصیب نہیں ہوں۔ ابو امی رہے تو شاید کوشش کرتے۔

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ نقرئی گھنگرو بج اٹھے۔ "سنیے!"

"جی!" میں نے تابعداری کے انداز میں کہا اور تقریباً دوڑتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ اس وقت مجھے کوئی دیکھ لیتا تو یقیناً ہنستا۔ ایک پولیس انسپکٹر بچوں جیسی حرکت کرے گا یہ تعجب کی بات تھی مگر دل تو ہوتا ہی ہے عقل کا اندھا۔ فوراً دماغ پر پردہ ڈال دیتا ہے۔

"ذرا ہماری مدد کریں نا۔ پتا نہیں کیا خرابی ہوگئی ہے؟" کھڑکی سے جھانکنے والی نے کہا۔

میں بونٹ پر جھک گیا۔ اسی وقت میری گردن پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کھڑی ہتھیلی کا بھرپور وار ہوا تھا۔ میں تیورا کر گرا تھا اور دھیرے دھیرے میرے حواسوں کے چراغ گل ہوگئے تھے۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے پایا۔ میرے جسم پر ناشرٹ تھی نہ بنیان۔ میں نے گھبرا کر سامنے دیکھا۔ وہی لڑکی ہاتھ میں شیشے کا جگ لیے کھڑی تھی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اسی جگہ سے مجھ پر پانی پھینکا گیا تھا۔ چہرے کے ساتھ میرا سینہ بھی تر تھا۔ سینے پر پھیلے چھوٹے چھوٹے گھونگریالے بالوں میں پھنسی پانی کی بوندیں سرسرائی ہوئی' گدگدی پیدا کرتی نیچے گر رہی تھیں۔

میں نے گھبرا کر کھڑے ہونے کی کوشش کی اور لڑکھڑا گیا۔ میرے دونوں ہاتھ پیر کرسی کے پائیوں سے بندھے تھے۔

"کوشش کرنا فضول ہے!" لڑکی نے چڑانے والے انداز میں کہا۔ "ہم نے فقط حفظ ماتقدم کے طور پر تمہارے پیر باندھ دیے ہیں تاکہ تم یکا یک حملہ نہ کردو۔"

"ایسا کیوں۔ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"صبر میری جان صبر' ہم نے تمہیں شادی کے لئے اغوا کیا ہے۔"

www.pdfbooksfree.pk

''آں! شادی کے لئے؟'' میرے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی ہاں۔ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عورتیں کسی سے پیچھے نہیں ہیں وہ ہر کام کر سکتی ہیں جس پر تم مردوں کی اجارہ داری ہے۔''

''یہ تو سراسر غنڈہ گردی ہے۔''

''ہاں ہاں' یہ غنڈہ گردی ہی سہی' لیکن ہم کھل کر تو سامنے آئے ہیں۔ تم مردوں کی طرح میٹھی چھری سے تو ذبح نہیں کرتے۔'' اس نے ایک ایک بات کو چبا چبا کر کہا۔

میں نے لڑکی کے چہرے پر نظر ڈالی۔ جوش و جذبات سے لڑکی کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ گورے مکھڑے پر جوش کی لالی نے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ پیشانی پر پڑے بلوں نے بھوؤں کو کمان بنا دیا تھا۔ ترا شیدہ ہونٹ کے کنارے پھڑک رہے تھے۔ وہ تقریباً چیخنے کے انداز میں بول رہی تھی۔ ''تم مردوں نے الفاظ کے قفسے سے عورت کو باندھ رکھا ہے۔ ہر دور میں عورت اسی ہتھیار سے شکار ہوئی ہے۔ پیار کی زنجیر پہنا کر انہیں قیدی بنایا گیا ہے۔ قیدیوں کو ہتھکڑی' بیڑی پہنائی جاتی ہے کمر میں رسہ باندھا جاتا ہے۔ انہی چیزوں کو خوبصورت بنا کر گزرے بالے اور چوڑیوں کا نام دیا گیا ہے۔ بیڑی کی جگہ پائل' پازیب' جھانجر تو ڑا۔ کمر کے رسے کی جگہ کمر بند' کمر زیب' جوشن یا پٹکا پہنا دیا جاتا ہے۔ کیا یہ غلامی کی نشانیاں نہیں ہیں؟''

''یہ سارے زیور تو سہاگ کی نشانی ہیں اور سہاگن بنانے کے لئے عورت کی رضامندی لازمی ہے اسی لئے اسلام نے عورت کی رضامندی لینے کا حکم دیا ہے۔''

''عورت نے غم سے نکلی دل اور تم مردوں نے اسے رضامندی کہہ دیا۔ کبھی کسی عورت کے دل میں جھانک کر دیکھا ہے کہ وہ راضی ہے یا نہیں! اس کے بھی تو خواب ہوتے ہیں۔''

''مختر مہ! یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔'' میں نے باتوں میں پھنسا کر بی ڈھیلی کرنا چاہی۔

''لیکن عورت کی چھوٹی سی غلطی کو شاذ و نادر معاف کیا جاتا ہے۔ اگر ہلکی سی لغزش ہو جائے تو فوراً لات ماردی جاتی ہے۔ ذرا سی شکل میں نقص دیکھا اور انکار کر دیا۔ میں پوچھتی ہوں یہ دق زدہ لڑکے کس منہ سے خوبصورت لڑکیوں کی مانگ کرتے ہیں۔ میری سہیلی جمیلہ کا جرم یہی ہے کہ وہ کالی ہے اس لئے کوئی رشتہ بھی نہیں بھیجتا۔ اس سے تم شادی کرو گے تم۔'' لڑکی نے میرے سینے کی جانب اشارہ کیا۔ ''ورنہ تمہاری زندگی تمہاری اس شرٹ کی طرح کالی بنا دوں گی۔'' لڑکی نے میری شرٹ کو اٹھا کر دکھایا۔ ''یہ تو تمہیں ڈکی میں ٹھونسنے کی وجہ سے کالی ہوئی ہے مگر تمہاری زندگی میرے ہاتھوں کالی ہو جائے گی۔''

لڑکی کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کچھ بھی کر گزرنے کے لئے تیار ہے۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟ کیسے اس پاگل لڑکی کے چنگل سے آزادی حاصل کروں۔ تبھی دروازے کا پٹ کھلا اور ایک سانولی سی لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اکہرے بدن کی اس لڑکی کے لباس کو دیکھ کر میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے میں نے گلی میں کار کے اندر بیٹھے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی تندرست تھی۔ فٹ بال کی طرح لڑھکتی ہوئی داخل ہوئی تھی۔ اور اندر آتے ہی ٹھسا سار کر زمین پر بیٹھ گئی تھی۔

''ارے جمیلہ زرا پانی تو پلانا۔ گلا سوکھنے لگا ہے۔''

''موٹی تجھے کھانے پینے کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے؟'' اسی لڑکی نے طنزیہ کہا۔

''تو چپ رہ آصفہ کی بچی!'' موٹی نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''خدا کے لئے آصفہ اب کچھ نہ کہنا ورنہ خوامخواہ یہ کمرا میدان جنگ بن جائے گا۔'' جمیلہ نے مجھ سے سوال و جواب کرنے والی لڑکی سے کہا۔

''تم جس کام کے لئے گئی تھیں وہ کر آئیں؟ مولوی کو لائی ہو؟'' آصفہ نے جمیلہ سے پوچھا۔

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''کیوں کہ یہ بے چارہ مظلوم ہے۔'' اس نے میری جانب اشارہ کیا۔

اس کی بات پر میں چونک گیا اور جمیلہ کے چہرے کو سوالیہ انداز میں گھورنے لگا۔

''مرد بھی مظلوم نہیں ہوتے۔'' آصفہ غرائی۔

''مگر یہ مظلوم ہے۔'' جمیلہ بولی۔ ''تم بھی صادقہ کی اس خوبی سے آگاہ ہو کہ وہ ہر کسی کے پیٹ کی بات معلوم کر لیتی ہے۔ منصوبے کے مطابق جب ہم اس کے محلے میں معلومات حاصل کرنے پہنچے تو پتا چلا کہ یہ شفاعت کا بیٹا نہیں ہے۔''

میں اچھل پڑا۔ یہ اطلاع میرے لئے بالکل نئی تھی۔ بچپن سے جسے میں اپنا باپ سمجھتا آیا تھا۔ جس کی گود میں ہمکتے ہوئے میرا بچپن گزرا۔ جس نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے مجھے افسر بنایا' وہ میرا باپ نہیں ہے۔ یہ اطلاع بالکل عجوبہ سی لگی۔

''اس کا باپ کون ہے؟'' آصفہ نے پوچھا۔

''ندیم' اس کے باپ کا نام ندیم ہے اور وہ ترکی میں رہتا ہے۔ دس سال سے وہیں ہے۔''

''اور ماں؟ کیا وہ عورت جو شفاعت کے ساتھ رہتی تھی وہ بھی اس کی ماں نہیں ہے؟

''ہاں! رابیل کی ماں کوئٹہ میں ہے۔''

''بات پلے نہیں پڑی۔'' آصفہ نے کہا۔

''صادقہ نے اب تک جو معلومات جمع کی ہیں اس کے مطابق رابیل کی ماں کا نام نوراں ہے۔ وہ لاہور کے موچی دروازے کے رہنے والی ہے۔ شفاعت کی بیوی بھی اسی محلے کی ہے۔ دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ شادی کے بعد دونوں سہیلیاں بچھڑ گئیں۔ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملتان چلی گئی۔ اسی دوران میں نوراں کا نکاح بھی ہو گیا۔ محمد عمر نامی لڑکے سے اسے منسوب کیا گیا تھا۔ عمر کراچی میں رہتا تھا۔ نوکر پیشہ تھا۔ سال میں دو تین بار ہی گھر جاتا۔ ایک بار وہ لاہور آیا تو اپنے سسرسے ملنے ان کے گھر بھی پہنچا مگر وہ گھر میں نہیں تھے۔ اور نوراں اکیلی تھی۔ اکیلے گھر اور جوانی کا عمر نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ نوراں نے شوہر کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا۔ اس کے پیر بھاری ہو گئے تھے۔ یہ خبر جب نوراں کے سسرال پہنچی تو ان لوگوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ نوراں بدکردار ہے۔ کسی اور کا گناہ عمر کے سر تھوپ رہی ہے۔ عمر باپ کے غصے کو جانتا تھا۔ اس نے باپ کے حکم پر نوراں کو طلاق بھیج دی۔ وقت کافی گزر چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے بہت اصرار کے باوجود خطرہ مول لینے سے انکار کر دیا مجبوراً وہ اس معصوم کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن پریشان بھی تھی۔ بچے کا کیا ہوگا؟ اس خیال سے نوراں ہر وقت روتی رہتی۔ اسی دوران میں

www.pdfbooksfree.pk

شفاعت کی بیوی کوڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ کبھی بھی ماں نہیں بن سکے گی۔ اس مسئلے کا حل اس نے یہ نکالا کہ اس بچے کو گود لے لیا۔ راحیل ہی وہ بچہ ہے۔"

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ اپنی کہانی سے میں خود ہی بے خبر تھا۔ جسے اپنا سب کچھ سمجھے بیٹھا تھا وہ میرے کچھ بھی نہ تھے۔ ابھی خیالات کے گرداب چکر ہی دے رہے تھے کہ آصفہ کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ جمیلہ سے مخاطب تھی۔ "اگر یہ مظلوم ہے تو اس کی مدد فرض ہے فوراً مولوی کو بلاؤ۔"

"کیوں؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"تم سے نکاح پڑھایا جائے تاکہ تم اس کے زخم پر پھایا رکھ سکو۔"

"ارے ہے رے ہمدرد، خوب ہمدردی جتا رہی ہو۔ ایسے لڑکے کو بے چارہ جمیلہ کے گلے منڈھ رہی ہو جس کے باپ کا ہی پتا نہیں ہے۔" صادقہ نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"تو چپ رہ موئی، یہ پنا راز چھپانے کے لئے جمیلہ کے آگے کبھی سر نہیں اٹھائے گا۔"

"عقل کی دم تو خود کرلے تجھے ہی ایسا شوہر مبارک۔"

دونوں عورت تھیں۔ ان کی جبلت عود آئی تھی۔ ساری ڈگریاں دھری رہ گئی تھیں۔ مردانہ پن کے دعوے ہوا ہوگئے تھے۔ اور ایک دوسرے کو نوچ کھانے کے لئے وہ کنگزنوں کی طرح لڑے جارہی تھیں۔

"خدا کے لئے خاموش ہوجاؤ۔" جمیلہ نے کہا۔

"اسے خاموش کر۔ اس موئی کو چپ کرا۔" آصفہ گرجی۔

"خدا کے لئے صادقہ چپ ہوجاؤ!" جمیلہ نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"ٹھیک ہے میں چپ ہوجاتی ہوں مگر اسے شادی کرنی ہوگی۔"

"ہاں ہاں میں شادی کروں گی۔ بلاؤ مولوی کو۔" آصفہ گرجی۔

"میں ابھی لے کر آتی ہوں۔ گردن سے پکڑ کر لاؤں گی۔" صادقہ جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔

"تم گواہ رہنا جمیلہ اگر اس نے نہ کیا تو میں اس کی گردن توڑ دوں گی۔" بکتے جھکتے صادقہ باہر نکل گئی۔

وہ کچھ دیر بعد لوٹی تو اس کے ساتھ ایک مولانا تھے۔ سیاہ شیروانی، دوپلی ٹوپی، بغل میں رجسٹر، ہونٹ پان کی لالی سے سرخ۔ اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹک گئے۔ انھوں نے ایک نظر لڑکی پر ڈالی اور پھر راحیل کی طرف متوجہ ہوگئے۔ "ارے میاں یہ کون سی شرافت ہے لڑکیوں کے سامنے ننگے بیٹھے ہو۔"

"ارے بڈھے یہ ننگا نہیں ہے اسے گرمی لگ رہی ہے اس لیے شرٹ اتار دی۔" صادقہ نے کہا۔

"کیا گرمی سر پر بھی چڑھ گئی ہے جو اس کے پیر بندھے ہیں۔" مولانا نے طنز کیا۔

"ارے مولانا زیادہ باتیں نہیں، نکاح شروع کرو۔" آصفہ نے جھڑکا۔

"ارے کیسے پڑھادوں؟ آں۔ نکاح ہے کوئی کھیل نہیں۔ گواہ لاؤ، دلھن دولھے کو لاؤ۔" مولانا بولے۔

"گواہ یہ دونوں ہیں۔" آصفہ نے جمیلہ اور صادقہ کی جانب اشارہ کیا۔

"آں، یہ گواہ ہیں؟ ارے بے وقوفوں عورت کی گواہی آدھی ہوتی ہے۔ مرد گواہ لاؤ۔"

"صادقہ! دو بندے پکڑ لا۔" آصفہ نے حکم دیا۔

"ہم بھی لائی۔" وہ باہر نکل گئی۔

"دلھن دکھاؤ تم سب خطرناک نظر آرہی ہو کہیں کسی کو اغوا کر کے تو نہیں لے آئیں۔"

"دلھن میں خود ہوں۔" آصفہ نے کہا۔

"آں!" مولانا اچھل پڑے۔ "اور دولھا؟"

"دولھا یہ بندھا بیٹھا ہے۔" آصفہ نے اشارہ کیا۔ "تم نے صحیح سمجھا ہے ہم اسے اغوا کر کے لائے ہیں۔"

"یا اللہ کیا یہ آخری وقت ہے قیامت آنے والی ہے کیا؟" مولانا نے چھت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "جوڑ کیاں لڑکے کو اغوا کر کے نکیں۔"

میں خاموش تھا۔ انھیں ٹک ٹک دیکھے جارہا تھا۔ جمیلہ کی کہانی نے مجھے گونگا بنا دیا تھا۔ میں سب کچھ سن رہا تھا پر بولنے سے قاصر تھا۔ تبھی آصفہ بولی۔ "ارے مولانا خطبہ شروع کرو، گواہ آتے ہوں گے۔"

"جبریہ نکاح پڑھانا جرم ہے۔" مولانا بولے۔

"جرم کے بچے میں ابھی تجھے جرم بتاتی ہوں۔" آصفہ اچھلی، ہوا میں قلابازی کھاتے ہوئے اس کے پیچھے پہنچی اور ایک زوردار لات اس کے کولھے پر ماری۔ مولانا قلابازی کھا کر دور جا گرے۔

"سن اوئے مولانا میں کراٹے میں بلیک بیلٹ ہوں۔ زیادہ چوں چرا کی تو پیر توڑ کر ہاتھ میں دے دوں گی۔"

مولانا کا رنگ فق ہوگیا۔ چہرہ خون کا آئینہ بن گیا تھا جسم تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ وہ ایسے حالات کب دو چار ہوئے تھے۔ وہ سہم کر ان لڑکیوں کے اشاروں پر معمول کی طرح عمل کرنے لگے۔ "لو گواہ بھی آگئے۔" صادقہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ چہرے سے وہ مزدور لگ رہے تھے۔ عسرت کی زندہ تصویر تھے۔

"لو مولانا گواہ لے آئی۔" صادقہ نے ایک کی گردن پر ہاتھ رکھ کر آگے دھکیلا۔

"گواہ، لیکن مجھے تو آپ مزدوری کے لئے لائی ہیں۔" ایک نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"گواہی تو تیرا باپ بھی دے گا۔" صادقہ نے اس کی پیٹھ پر دھول جمائی۔ اس وقت بپتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ یہی وہ موئی ہے جو گوشت کا پہاڑ بن کر سست پڑی رہتی تھی۔ اس وقت اس کی پھرتی دیدنی تھی۔ خونی خواتین کا نرغہ ان کے بگڑے تیور اور مولانا کے چہرے پر اڑی ہوائیاں دونوں مزدوروں کا حوصلہ پست ہوگیا۔ انھوں نے ہتھیار ڈال دیا۔

مولانا نے خطبہ پڑھا اور نکاح ہوگیا۔ اس پورے ڈرامے میں میرا کردار بت کا رہا۔ میں خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ تیسری بار پوچھنے پر میں نے "قبول ہے۔" کہا تھا۔

نکاح کے فوراً بعد گواہان اور مولانا کو پیسے دے کر بھگا دیا گیا۔

"اے تم کیسی دلھن ہو، شوہر سے باتیں کرو نا۔" صادقہ نے چھیڑا۔

"سنو مسٹر راحیل اب تم میرے شوہر ہو، میرے مجازی خدا مگر صرف نام کے۔ میرے مزاج کے خلاف کچھ بھی نہیں کرو گے۔ مجھ سے پوچھے بغیر ڈیوٹی پر بھی نہیں جاؤ گے۔ جب تک میری مرضی نہ ہو میرے قریب بھی نہ آؤ گے۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

www.pdfbooksfree.pk

آزادی کی نوید بھی میرے حواسوں کو لوٹا نہ سکی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری کہانی اتنی پر درد ہو گی میں معاشرے کے لئے گالی ہوں۔

''مسٹر رابیل' آپ کو شاید میری باتوں سے دکھ پہنچا ہے۔'' گلیارے میں رک کر صادقہ نے کہا۔

''آں!'' میں نے چونک کر کندھے سے اس کا ہاتھ ہٹایا۔

''آپ بے فکر رہیں۔ میں جو چاہتی تھی وہ ہو گیا۔ میں آصفہ کے عہد کو توڑنا چاہتی تھی' سو توڑ دیا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ شادی نہیں کرے گی مگر میں نے اسے مجبور کر دیا۔ میں نے جمیلہ کے ساتھ مل کر جو منصوبہ بنایا تھا وہ کامیاب رہا۔ ابھی ہم نے آپ کے متعلق جو کہانی سنائی تھی وہ صد فیصد جھوٹ تھی۔ صرف آصفہ کو اکسانے کے لئے سنائی تھی۔ آپ شفاعت صاحب ہی کے بیٹے ہیں''۔

''کیا؟'' آصفا اچھل پڑی۔

''ہاں وہ کہانی جھوٹی تھی..... صرف تجھے غصہ دلانے کے لئے گھڑی تھی تاکہ تو جوش میں آ جائے۔''

میرے چہرے پر شادابی لوٹ آئی۔ ''اچھا..... میں تو بری طرح ٹوٹ چکا تھا' کون مردا یسی گالی سہے گا۔''

''ہاں ہاں یہ گالی بھی تو عورت کے لئے منسوب ہے۔ فعل بد خود کریں لعنت کریں شیطان پر۔'' آصفہ بپھرا اٹھی۔

''تمہاری یہی بات غلط ہے۔ ہر معاملے کو تم عورت کی مظلومی کے چشمے سے دیکھتی ہو۔'' جمیلہ نے سمجھانا چاہا۔

''اور کیا' سارا ہی قصور مردوں کا ہوتا ہے' عورت مظلوم ہے اس لئے اس پر الزام دھر دیتے ہیں۔ دیکھ لینا میں اسے کس طرح غلط ثابت کرتی ہوں۔ رابیل کی زندگی اجیرن نا کر دی تو کہنا۔''

''بی بی! تم بھول رہی ہو مرد جب چاہے عورت کو طلاق دے دے۔''

''ہاں ہاں اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہو جب دل بھر جائے طلاق دے دو۔ غلطی کا احساس ہو جائے تو بلا لو مگر حلالہ کرا کر اور حلالہ عورت کو ہی کرانا پڑتا ہے۔''

''حلالہ اس لئے کرانے کا حکم ہے کہ اگر مرد پشیمان رہے کہ اس کی بیوی کچھ دنوں کے لئے کسی دوسرے کی بھی ہو گئی تھی۔'' میں نے سمجھانا چاہا۔

''میرا دماغ مت چاٹو۔ اب جاؤ جب میرا دل ہو گا بلا لوں گی۔'' آصفہ نے جھڑکا۔

جمیلہ اور صادقہ نے آصفہ کی تائید کی تھی۔ مجبوراً میں باہر نکل آیا۔ نکلنے کے بعد باہر رک کر اس مکان کو بغور دیکھا تھا۔ اس مکان کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہتا تھا۔

اس رات میں کافی دیر تک جاگتا رہا۔ سوچتا رہا کہ ان نفسیاتی مریضوں کو کیسے راہ راست پر لاؤں۔ ان کے خود پسندی کے خول کو کیسے توڑوں کیونکہ آصفہ کیلئے بھلے ہی وہ ایک کھیل ہو مگر میرے لئے احکام شرع تھا' باضابطہ نکاح تھا۔ وہ میری بیوی بن چکی تھی۔ اسے راہ راست پر لانا میرا فرض تھا۔

میں ایک ہفتے سے آصفہ کو تلاش کر رہا تھا۔ اس مکان پر بھی گیا تھا جہاں مجھے لے جایا گیا تھا مگر وہ مکان خالی ملا تھا۔ لڑکیوں نے اسے کرائے پر حاصل کیا تھا۔ ایک اسٹیٹ ایجنسی والے نے مکان دلوایا تھا اسی لئے مکان مالک بھی لڑکیوں کا پتا نہ بتا سکا۔

اس دن بھی میں تھانے میں بیٹھا آصفہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''ہیلو!'' میں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

''میں لٹ گیا۔ جلدی آؤ۔ پورے بارہ لاکھ لوٹ لئے۔'' دوسری جانب سے گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔''

''میں ابراہیم شاہ ہوں بھئی ابراہیم شاہ۔ جیمس اینڈ جیولری کا مالک۔'' وہ بے ربط انداز میں بولا۔

''آپ فکر نہ کریں میں نور اپہنچ رہا ہوں۔'' میں نے جیمس اینڈ جیولری نامی دکان دیکھی تھی۔ کافی بڑی دکان تھی۔ زیورات کی ان گنت چنی دکانوں میں سے ایک تھی جس کے زیورات غیر ممالک میں بھی پسند کئے جاتے تھے بڑا ڈیزائنر زیورات بنانے میں اس کا ثانی نہ تھا۔ پچھلے ہی دنوں اخباروں میں پڑھا تھا کہ عرب کے ایک شیخ نے پچیس لاکھ روپے کی منقش کرسی بنوائی تھی۔ ایسی عجوبہ روزگار کرسی بنی تھی کہ لوگوں نے دانتوں تلے انگلیاں دبالی تھیں۔

اس مشہور دکان میں پہنچا تو وہاں پہلے سے ہی انٹیلی جنس کے کئی افسر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے زمین پر دس لڑکے بیٹھے تھے۔ لڑکوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ان کے بٹھائے جانے سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ یقیناً انٹلی جنس والے مجرم پر ہی ہاتھ ڈالتے ہیں' خاص کر خطرناک مجرموں پر۔ یہ بھی خطرناک ہوں گے۔

میں نے خطرناک کتے دیکھے تھے۔ جب تک وہ آزاد رہتے ہیں خطرہ ہی خطرہ رہتا ہے مگر گلے میں پٹا پڑتے ہی ایسے خاموش ہو جاتے ہیں گویا ازل کے شریف ہوں۔ لڑکوں کے چہرے بھی معصومیت کا پرتو تھے مگر مجھے ان پر رحم نہ آیا۔ میں نے سیٹھ سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''ان لوگوں نے ہمارے نام پر انہیں دھوکا دیا ہے۔'' انٹیلی جنس کے افسر نے کہا۔

میں نے مڑ کر لڑکوں کی جانب دیکھا پھر ابراہیم شاہ سے بولا۔ ''آپ واقعہ بتائیے۔''

ابراہیم شاہ نے بتانا شروع کیا۔ ''آج صبح جب میں دکان پر پہنچا تو یہ لڑکے آئے۔ ان کے ساتھ تین لڑکیاں بھی تھیں۔ ایک تو بہت خوبصورت تھی۔ گوری رنگت' اونچا پورا قد' گھنے بال' سفید شلوار قمیض پہنے تھی اور بالوں میں کلپ لگائے ہوئے تھی۔''

میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''میاں' تم تاجر ہو یا درزی جو عورتوں کو بغور دیکھ کر پورا پورا ناپ لیتے ہو۔''

ابراہیم شاہ بولے جا رہا تھا۔ ''اور دوسری لڑکی اکہرے بدن کی تھی۔ رنگت سانولی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی کپڑوں کا رنگ گلابی تھا۔ اس نے ہائی ہیل کی سینڈل پہن رکھی تھی۔ اور تیسری لڑکی بھاری بدن کی تھی۔ بہت بول رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا اس کے منہ میں لاؤڈ اسپیکر فٹ ہو۔ بڑی پاٹ دار آواز تھی۔''

میں چونک گیا اور جلدی سے بولا۔ ''کیا اس کی ناک پر چھوٹا سا مسا تھا؟''

''جی! جی ہاں مسا تھا۔'' ابراہیم شاہ نے جواب دیا۔

www.pdfbooksfree.pk

"آپ اسے پہچانتے ہیں؟" انٹیلی جنس افسر نے پوچھا۔

میرا دل کانپ اٹھا۔ انٹیلی جنس والے جس کے پیچھے پڑ جائیں اسے پاتال سے بھی کھینچ لاتے ہیں۔ یقیناً یہ آسفہ صادقہ اور جمیلہ کو نہیں بخشیں گے۔ کوئی گہرا معاملہ ہے جبھی یہ آئے ہیں۔

انھیں مطمئن کرنا ضروری تھا اس لیے بولا۔ "جی ہاں! ایک روز ویران سڑک پر تین لڑکیاں ایک نوجوان لڑکے کو لوٹنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میری مداخلت کے بعد وہ فرار ہو گئیں۔ مجھے ان پر شک ہوا تھا۔ جیسی ان کا حلیہ بھی ایسا ہی تھا۔ ہمیں مطلوب ہیں....." پھر میں نے ابراہیم شاہ سے پوچھا۔ "ان لڑکیوں نے کیا کیا تھا؟"

"جناب یہ سب آئے۔ پہلے لڑکی نے اپنا کارڈ دکھایا پھر انھوں نے کارڈ دیکھ کر میں چونک گیا۔ انٹیلی جنس کا کارڈ تھا۔ ایک لڑکی نے کہا ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آپ غیر قانونی طور پر ہیرے سمگلوار ہے ہیں۔ میں نے جواب دیا تھا آپ خود چیک کر لیں۔ سارے ہیرے نیکس پیڈ ہیں۔ ان لوگوں نے فائلوں کی چیکنگ شروع کر دی۔ اس خوبصورت لڑکی نے تجوری کھلوائی۔ اندر سے ہیروں کی پوٹلی نکلوائی اور اسے دیکھتے ہوئے بولی، ان کے کاغذات .....؟ میں نے کاغذات دکھائے تو بولی وزن بر مجھے شبہ ہے اسے چیک کرنا ہوگا۔ میں نے کہا چیک کر لیں' اوزان دیکھ لیں مگر وہ نہ مانی کہنے لگی ہمارے ایکسپرٹ تجزیہ کریں گے۔ اسے پوٹلی کو اٹھاتے دیکھ کر میں نے دکان سے باہر لے جانے سے منع کیا تو دھمکی دینے لگی پھر اس نے مجھے مطمئن کرنے کے لئے رسید بنادی اور بولی ہمارے آدمی فائل دیکھ رہے ہیں' ہم ابھی آجائیں گے اور چلی گئی۔ صاحب جی بارہ لاکھ کے ہیرے لے گئی۔" ابراہیم شاہ رونے لگا۔

"ان لڑکوں نے نہیں بتایا کہ وہ کہاں گئی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سب بدمعاش ہیں۔" جوش میں اس نے ایک لڑکے پر تھپڑ چلا دیا۔

"آرام سے آرام سے۔" انٹیلی جنس افسر نے روکا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "ان لڑکوں نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ کچھ دنوں پہلے انھوں نے اخبار میں اشتہار پڑھا تھا کہ ملک و قوم کی خدمت کے لئے حب وطن سے سرشار نوجوان کی ضرورت ہے، انھیں جیب خرچ بھی ملے گا۔ یہ لڑکے بے کاری میں وقت گزار رہے تھے اشتہار پڑھ کر پہنچ گئے۔ انھیں لڑکیوں نے بتایا کہ ان کا تعلق انٹیلی جنس سے ہے اور وہ اوپر والے کے حکم سے ایک نیا گروپ بنا رہی ہیں۔ اس جانباز گروپ میں نئے افسروں کا تقرر ہوگا۔ ایسے خفیہ کام کے لئے کھلا اشتہار دیا نہیں جا سکتا اس لئے بند الفاظ کا اشتہار دیا گیا ہے اگر آپ نے حکومت کو مطمئن کر دیا تو آپ کی تنخواہ تیس ہزار روپے ماہانہ ہوگی۔ لڑکے خوش ہو گئے۔ انھوں نے گھر میں بھی کچھ نہ بتایا کیوں کہ راز داری شرط تھی۔ نام نہاد ٹریننگ کے نام پر کچھ دنوں ان سے اچھل کود کروائی اور آج یہ ڈاکا ڈالنے پہنچ گئے۔"

میں نے دل ہی دل میں آسفہ کی عقل کو داد دی۔ کتنی آسانی سے اس نے بارہ لاکھ کے ہیرے اڑا لیے لیکن میں نے بھی عہد کر لیا کہ آسفہ کو ہیرے ہضم کرنے نہ دوں گا۔ اگر وہ پاتال میں بھی چھپی ہوگی تو میں اسے باہر کھینچ لاؤں گا لیکن کیسے؟ یہی سوچ رہا تھا۔

"آپ انھیں لے جائیں لیکن ہمیں بھی کچھ سوالات کرنے ہیں اس لیے ہم انھیں واپس لے لیں گے۔" انٹیلی جنس افسر کے کہنے پر میرے خیالات بکھر گئے۔

"جی بہتر ہے۔" میں انھیں لے کر تھانے آ گیا۔

تھانے پہنچنے کے بعد بھی میرے دماغ پر آسفہ سوار تھی۔ میں اسے گرفتار کرنے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا کہ کمال کا نام میرے ذہن میں گونجا۔

کمال مقامی روزنامے میں کرائم رپورٹر تھا۔ اس کے ذریعے میں نے کئی مجرموں کو ان کی پناہ گاہوں سے باہر نکالا تھا۔ اس بار بھی میں نے اس کے ساتھ مل کر ایک ڈرامہ رچانے کا سوچا اور اسے فون کر نے لگا۔ کمال تو گویا فون کا منتظر تھا۔ فوراً ہی تھانے پہنچ گیا۔ میں نے اسے منصوبہ سمجھا کر وعدہ لے لیا کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو اس خبر کو چھاپ دے۔

اسی دن میری ظلبی ہوئی۔ افسران بالا نے مجھے چوبیس گھنٹے کا وقت دیا کہ ان لڑکیوں کو گرفتار کر کے لے آؤں۔ میں نے اپنے منصوبے سے انھیں بھی آگاہ کر دیا۔ منصوبہ اتنا جامع تھا کہ افسران بالا نے بھی اپنا منصوبے کی توثیق کر دی۔

اگلے دن کے اخبار میں خبر تھی۔ "جیمس اینڈ جیولری میں لگے ہوئے خود کار کیمرے نے دھوکے باز حسیناؤں کی تصویر اتار لی ہے۔ وہ تصویر اس وقت انسپکٹر رانیل کے پاس ہے مگر انھوں نے ابھی تک کسی کو دکھائی نہیں ہے۔ اپنے افسران کو بھی اس کی ہوا لگنے نہیں دی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ مجرموں کو بچانا چاہتے ہیں۔"

میں جانتا تھا کہ یہ خبر آسفہ کی عقل کو مات دے دے گی۔ اسی لئے میں تھانے نہیں گیا تھا۔ اپنے بنگلے کے بر آمدے میں بیٹھا تھا۔ آسفہ مجرم ہے۔ اور مجرم کبھی بھی تھانے میں جا کر باتیں کرنا پسند نہیں کرتے۔ اسے ملنا ہوگا تو میرے گھر آئے گی۔ اس وقت میں اسی کا انتظار کر رہا تھا کہ میری نظر سڑک کے کنارے کھڑے ایک شخص پر پڑی۔ وہ میرے بنگلے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ کچھ مشکوک سا لگا، کون ہے کیا آسفہ کا بندہ ہے؟ ابھی میں یہی سوچ



www.pdfbooksfree.pk

رہا تھا، کہ فون کا بزر چیخ اٹھا۔ میں نے اٹھ کر فون ریسیو کیا۔ دوسری جانب سے کمال کی جانی پہچانی آواز آئی۔ ”تصویر تمہارے پاس ہے نا؟“

”جی ہاں لہو تو دکھا دوں؟“

”نہیں یار میرا ایڈیٹر میری جان کھا رہا ہے کہ جھوٹی خبر کیوں لگا دی۔“

”بھئی اسے سمجھا دو کہ افسران بالا کی منشا یہی ہے۔“

”اس کا کہنا ہے کہ عوام کو دھوکا دینا ٹھیک نہیں ہے۔ اخبار سچی خبروں کے لئے ہوتا ہے۔“

”اسے ایک روز سنبھال لو۔“ میں نے فور لائن کاٹ دی۔ ابھی مڑا ہی تھا کہ بزر پھر چیخا۔ میں نے جھٹکے سے ریسیور اٹھا کر کہا۔ ”اب کیا ہے؟“

”تصویر تمہارے پاس ہے؟“ میری مطلوبہ آواز آئی۔

”کہیے تو دکھا دوں۔“ میں نے کہا۔

”ہم آ رہے ہیں بنگلے پر ہی رہنا۔“

”بھئی یہ بھی خوب رہی۔ دلھن خود چل کر دلھا کے گھر آئے۔“

”بکواس نہیں۔“ دوسری جانب سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں پھر آ کر اسی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ایک کار آ کر گیٹ پر رکی، میں نے جا کر گیٹ کھول دیا۔ کار اندر داخل ہوئی اور پورچ میں پہنچ کر رک گئی۔ پہلے آصفہ اتری پھر جمیلہ اور صادقہ۔

”آیئے اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔“

آصفہ بولی۔ ”وقت نہیں ہے۔“

”دلہن آئے تو دلھا کے گھر اور کہے وقت نہیں۔ یہ تو عجیب سی بات ہے۔“ میں نے مصنوعی پیار بھرے لہجے میں کہا۔

”مذاق نہیں۔“ آصفہ نے جھڑکا۔

”مذاق کون کمبخت کر رہا ہے۔ ہم تم تو جیون ساتھی ہیں۔ جنم جنم کا رشتہ ہے۔ تم چور ہو میں سپاہی۔ تم قانون شکن ہو اور میں قانون کا محافظ۔ اسی لئے تو مولانا نے ہم دونوں کو ایک ڈور میں باندھا ہے۔“

”چپل صحیح ماروں گی۔“ آصفہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچھل پڑی اگر میں اسے سنبھال نہ لیتا تو وہ گر پڑتی۔ پستول کے دھماکے نے اسے بوکھلا دیا تھا۔

”سنو مسٹر راجیل میرے آدمیوں نے اس بنگلے کو گھیر لیا ہے فوراً ان لڑکیوں کو میرے حوالے کر دو۔“ پستول تھامے ہوئے ایک شخص نے کہا۔

”کیوں بھائی۔ میری تو بیوی ہے تمھاری کون ہے؟“ میں نے کمال اطمینان سے کہا۔

اس شخص نے دوسرا فائر کیا۔ اس بار بھی نشانہ ہمارے سر پر لٹکتا ہوا فانوس تھا۔

”میرے بھائی خواہ مخواہ کیوں میرے قیمتی فانوس کے دشمن ہو گئے ہو۔ کہیں دھماکے کی آواز پر کوئی آ نہ جائے۔“

”سڑک کے دونوں سرے پر میرے آدمی تعینات ہیں۔ رہا پڑوسیوں کا سوال تو جناب یہاں کوئی کسی کے پھٹے میں کبھی پڑتا۔ ۔ اخوت، بھائی چارے کا زمانہ کب کا لد گیا۔“

”ایسی بات ہے تو یہ لو۔“ کہتے ہوئے میں نے کمال پھرتی سے آصفہ کو کمرے میں دھکا دیا اور خود کو گراتے ہوئے لوٹ لگاتا چلا گیا۔ ہمیں گرتے دیکھ کر آصفہ اور جمیلہ نے بھی پلنگ کی آڑ لی تھی۔ پستول ہلاتا ہوا وہ شخص برآمدے کی جانب دوڑ اتھا کہ میں نے سیٹی بجا دی لان کی جھاڑیوں کے پیچھے سے کئی پولیس والے نکل آئے۔

”خبردار پستول پھینک دو ورنہ گولی مار دیں گے۔“ ایک سپاہی نے للکارا۔ اس شخص نے گھبرا کر پیچھے دیکھا اور اس پر سکتہ سا چھا گیا۔ آٹھ نالیں اس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

”اسے ہتھکڑی لگا کر اندر لاؤ۔“ میں نے ایک سپاہی سے کہا۔

”میں..... ہم جا رہے ہیں۔“ آصفہ نے کہا۔

”میری جان! تم کہاں چلیں؟ یہ سپاہیوں کا تعینات تمہارے لیے ہی تو تھی۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پٹر پٹر بولنے والی صادقہ نے مجھے یوں دیکھا گویا سرزنش کرنا چاہتی ہو لیکن کچھ بولی نہیں۔ جمیلہ بھی خاموش تھی۔

”چلو نا۔“ میں نے اسے اندر دھکیلا۔ جمیلہ اور صادقہ بھی ساتھ آ گئیں۔ میں نے فریج سے مٹھائی نکالی۔ ان کے سامنے رکھی اور بولا۔ ”پہلے منہ میٹھا کرو تا کہ میں ایک کڑوی خبر سناؤں۔“ تینوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”کھاؤ!“ میں دہاڑا۔ ”اس وین تم حکم چلا رہی تھیں آج میرا حکم مانو۔“

تینوں کا ہاتھ چلنے لگا۔ مٹھائی ختم ہوتے ہی میں نے کہا۔ ”میری بیگم جان! اب ہتھکڑی پہن لو۔“ پھر میں نے سرعت سے پستول نکال لیا اور زور سے پکارا۔ ”گل خان! اعصی گرفتار کر لو۔“

دروازے پر کھڑے پولیس والوں نے اندر داخل ہو کر لڑکیوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگا دی۔

تھانے کے ایک لاک اپ میں وہ شخص بند تھا جس نے مجھ پر فائر کئے تھا جبکہ تینوں لڑکیاں ایک دوسرے کمرے میں رکھی گئی تھیں ان لڑکیوں کو دیکھنے کئی افسران آ چکے تھے۔ یہ معصوم لڑکیاں ایسا مصوم چہرہ اور کرتوت ایسے قابل نفرت! انھیں سب ہی ملامت سے دیکھتے تھے۔ کئی افسروں نے لڑکیوں سے ہیروں کے بارے میں پوچھا، اس دوسرے قیدی کے بارے میں پوچھا لیکن انھوں نے اس بات سے لاعلمی ظاہر کی۔ اس شخص کے بارے میں تو خود مجھے بھی تجسس تھا کہ وہ کون ہے اور انھیں ساتھ کیوں لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے یہی سوال اس شخص سے بھی کیا تھا لیکن اس نے تو خاموش رہنے کی قسم کھائی تھی۔

اس وقت بھی میں اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا کہ تم کس لئے لڑکی کو لے جانا چاہتے تھے۔ تبھی ایڑیاں بجنے کی آواز سنائی دی۔ سلوٹ کی آواز سنتے ہی میں نے مڑ کر دیکھا۔ آئی جی سلطان خان کے ساتھ ایک بھاری بدن کا شخص تھا، وہ دونوں اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے بھی سلوٹ کیا۔ وہ جا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

”کیا یہی تینوں لڑکیاں ہیں؟“ آئی جی صاحب نے پوچھا۔

”جی ہاں!“ میں نے جواب دیا۔ ساتھ والا شخص بڑی دلچسپی سے لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔ دوسری جانب سے بولنے والے کا نام سنتے ہی اچھل پڑا۔ ”کیا..... تم..... شیر خان۔“

شیر خان کا نام سنتے ہی آئی جی بھی چونک گئے۔ شیر خان ایک ایسا نام تھا جس سے پورے ملک کی پولیس واقف تھی۔ وہ منشیات کی دنیا کا بے تاج بادشاہ تھا۔

شیر خان پورے ملک کی پولیس کو مطلوب تھا۔ آئی جی نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور تھام لیا اور بولے۔ ”کون ہو تم؟“

www.pdfbooksfree.pk

"میں شیر خان بول رہا ہوں۔ چودھری کو رہا کر دو۔"

"تم جھوٹے ہو۔ شیر خان کا نام لے کر بھی تم کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

"اگر تم نہیں چھوڑو گے تو ہم خود رہا کرا لیں گے۔ ابھی ایک نوجوان لڑکی آئے گی۔ وہ آ کر اسے چھڑا لے جائے گی۔" دوسرے جانب سے ریسیور رکھ دیا گیا۔

"گلنا نے کسی نے مذاق کیا ہے۔" کہتے ہوئے آئی جی صاحب باہر نکل گئے۔ جاتے جاتے اپنے دوست سے کہہ گئے تھے کہ وہ بیٹھے۔ راؤنڈ لگا کر اسے لیتے جائیں گے۔ ہم بھی اس فون کال کو مذاق سمجھ رہے تھے کہ وہ لڑکی پہنچ گئی۔ وہ آئی جی صاحب کے ساتھ آنے والے شخص کی بیٹی شگفتہ تھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "ڈیڈی چودھری کو چھوڑ دیجئے۔"

"تم ہوش میں تو ہو؟"

"جی ہاں! میں بہ ہوش و حواس کہہ رہی ہوں چودھری کو چھوڑ دیجئے ورنہ میں پیپر ویٹ مار کر بلب توڑ دوں گی۔"

پتا نہیں کیوں اس بے تکی بات کا گہرا اثر ہوا۔ آئی جی صاحب کے دوست کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ انھوں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "اسے چھوڑ دو۔"

آئی جی صاحب کے دوست کا حکم۔ اسے ٹالنے کی کس میں ہمت تھی پھر بھی قانون روک رہا تھا۔ ہمیں پس و پیش کرتا دیکھ کر آئی جی کے دوست نے پستول نکال لیا۔ ہم تیار نہ تھے اس نے چودھری کو آزاد کرا لیا۔ چودھری کو شگفتہ اپنے ساتھ لے گئی۔

ایک مجرم کی مدد کرنا جرم ہے۔ مجرم کتنا ہی بڑا افسر کیوں نہ ہو۔ قانون اسے معاف نہیں کرتا۔ آئی جی صاحب کے دوست عثمانی پر مقدمہ قائم ہو گیا اور وہ گرفتار ہو گئے۔ انھیں شاہ پور جا کر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ وہ بھاگ کر وہاں چھپے ہوئے تھے۔ ان کے جیل جانے سے مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں تو اپنی فتح پر شاد ماں تھا۔ مجھے جو کامیابی ملی تھی وہ معمولی نہ تھی۔ اتنی بڑی واردات کے مجرموں کو گرفتار کر کے شہرت حاصل کر لی تھی۔ اخبارات نے پہلے صفحے پر تفریفیں لکھی تھیں، مجھے ایک ذہین پولیس افسر لکھا تھا لیکن میں اپنے ذہن کی تھی کو سلجھا نہیں پایا تھا۔ میرے سامنے عثمانی صاحب کا فعل سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ یہ بات صحیح تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو دل و جان سے عزیز رکھتے تھے لیکن اس کی ایک چھوٹی سی بات پر قانون شکنی کر بیٹھے یہ بات سمجھ سے پرے تھی۔ پھر شگفتہ کی بات مہمل تھی۔ وہ ایک فضول سا جملہ تھا کہ بلب توڑ دوں گی اس جملے میں ایسی کون سی بات تھی۔ جس نے انھیں اتنا بڑا اقدم اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس راز کو سمجھنے کے لئے میں ایک دن جنگل پہنچ گیا۔ وہ بن کلاس کے قیدی تھے۔ انھیں تمام آسائشیں مہیا تھیں۔ ان سے ملاقات کے لئے جیلر نے الگ کمرے کا انتظام کر دیا۔ میں نے پہلا سوال کیا۔

"انکل! آپ میرے افسر کے دوست ہیں۔" میں کچھ دیر کے لیے رکا اور سانس لے کر بولا۔ "ایسی کون سی بات ہے جس نے آپ کو اتنا بڑا قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ شگفتہ کے جملے میں ایسی کون سی بات پوشیدہ تھی جس نے آپ کو بلا دیا تھا۔"

عثمانی صاحب خاموش تھے۔ ان کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ وہ سر جھکائے کچھ سوچ رہے تھے۔

"بولیے ایسی کون سی بات تھی جس نے آپ کو قانون شکنی پر آمادہ کر دیا؟"

"میری زندگی اور موت کا سوال ہے بیٹے اس زخم کو مت کریدو۔ میرے ساتھ تم بھی رو پڑو گے۔ اس جملے

میں ہم دونوں کے لئے دھمکی تھی۔ میرے ساتھ تم بھی تباہ ہو جاتے۔"

"میں..... میری تباہی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں..... میں۔ نے تمھیں بہت پہلے پہچان لیا تھا۔ اسی لئے اتنا قریب آیا تھا۔ تم غیر نہیں ہو۔ میرے عزیز دوست کے بیٹے ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شگفتہ اور تم پھانسی پر لٹکا دیئے جاؤ۔ اگر اس کی بات نہ مانتا پھر بھی میں مجرم ٹھہرا دیا جاتا۔ گھر ایسے بھی تباہ ہونا ویسے بھی۔ اس لیے میں نے آسان تباہی کا راستہ ڈھونڈ لیا۔" پھر انھوں نے آہستہ آہستہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں میری اپنی داستان سنا دی۔

میں خود نہیں جانتا تھا کہ میرا ہاتھ خون سے رنگا ہوا ہے۔ میں قتل جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب کر چکا ہوں۔ بھلے ہی قانون کی نظروں سے بچا ہوا ہوں مگر ضمیر کی عدالت تو معاف نہیں کرے گی۔ اسی خیال نے مجھے بے چین کر دیا تھا اور مجھے شگفتہ سے انسیت سی ہو گئی تھی۔ یوں بھی میرے بیان نے اسے بچا لیا تھا۔ ناداستگی میں لکھی رپورٹ نے ہی اسے بچا لیا تھا۔ میں نے رپورٹ میں شگفتہ کا نام نہیں دیا تھا۔ صرف اتنا لکھا تھا کہ آئی جی کے دوست عثمانی نے آ کر مجرم کو فرار کرا دیا تھا یہی وجہ تھی کہ پولیس نے اسے گرفتار نہیں کیا تھا۔ لیکن اب مجھے اپنے فعل پر ندامت نہیں تھی۔ بلکہ شگفتہ پر پیار آ رہا تھا۔ اسی کی وجہ سے مجھے ایک نئی بات معلوم ہوئی تھی۔ اب میں اپنے طور پر شگفتہ کے بارے میں تحقیق کر رہا تھا کہ وہ کس کے کہنے پر تھانے پہنچی تھی۔ ملزم چودھری سے اس کا کیا رشتہ تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ منشیات کی عادی ہے۔ یقیناً اس کی اسی کمزوری کا مجرم نے فائدہ اٹھایا تھا۔ چودھری کا تعلق بھی منشیات فروشی کے گروہ سے ہے۔ اس کا اقرار شیر خان نے بھی کیا تھا اور شیر خان کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں یہ بات مجھے معلوم تھی۔ اس بد بخت کے پنجے سے شگفتہ کو بھی نکالا جا سکتا تھا۔ جب وہ اس لت سے چھٹکارہ پا لیتی۔

کافی دیر غور کرنے کے بعد میں نے عثمانی صاحب سے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے شگفتہ شیر خان کے گروہ سے وابستہ ہے؟"

"نہیں یہ غلط ہے۔ کسی اور نے شیر خان کے نام کا فائدہ اٹھایا ہو گا۔"

"آپ کو کیسے پتا ہے؟"

"مجھے؟" وہ گھبرا گئے لیکن فوراً ہی انھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "میں ہر بات پر نظر رکھتا ہوں۔"

"کیا اس بات پر بھی آپ کی نظر ہے کہ شگفتہ منشیات کی عادی ہے۔"

"آں! وہ منشیات کی عادی ہے؟"

"ہاں! اسے یہ لت کالج سے لگی ہے۔ اسی لت نے اسے شیر خان کی بات ماننے پر مجبور کیا تھا۔"

"اسے کسی طرح بچا لو۔ اگر وہ مر گئی تو میں بھی نہیں بچوں گا۔ اسے بدنامی سے بچانے کے لئے ہی میں نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔"

"آپ مطمئن رہیں۔ میں اس کا علاج کراؤں گا۔" کہتے ہوئے میں اٹھ گیا۔

اسی دن میں شگفتہ کو لے کر رائیل کلینک پہنچا۔ ڈاکٹر اجیل کا شمار ملک کے معروف نفسیاتی معالج میں ہوتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اسے اس لعنت سے چھٹکارا دلا دیں گے۔

www.pdfbooksfree.pk

شگفتہ کو ان کے اسپتال میں داخل کرانے کے بعد میں پھر منشیات فروشوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس بار میرا انداز جارحانہ تھا۔ میں نے ایک ہفتے کے اندر اپنے علاقے سے منشیات فروشوں کا نام و نشان مٹا دیا۔ میری کارروائی سے منشیات فروشوں میں افراتفری پھیل گئی۔ میرے اس اقدام سے میرے ہی ڈپارٹمنٹ کے کئی افسران ناراض ہو گئے مگر مجھے پروا نہیں تھی کیونکہ زیادہ تر افسران مجھے شاباشی دے رہے تھے۔

☆.....☆

اس روز بھی میں ایک بڑی مچھلی پر ہاتھ ڈال کر لوٹا تھا کہ ڈاکٹر راحیل گھبرائے ہوئے آئے۔ ''میری پوتی' ہائے میری پوتی۔'' وہ بے ربط الفاظ میں بولے۔

''کیا ہوا آپ کی پوتی کو؟'' میں نے پوچھا۔

''اسے کسی نے اغوا کر لیا' ہائے میری پوتی۔''

''ڈاکٹر صاحب یہ کراچی ہے ایسا واقعہ تو عام سی بات ہو گئی ہے۔ جب لوگ مادہ پرست بنیں گے تو یہی ہو گا۔''

''ڈھونڈو اسے تلاش کرو۔'' وہ کراہے۔

''عمر کیا ہو گی؟''

''تیرہ سال۔ میرے مرحوم بیٹے بہو کی وہی تو ایک نشانی ہے۔''

''اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ میں ابھی سارے تھانوں کو الرٹ کرتا ہوں۔ نام کیا تھا؟

''فہمیدہ نازلی۔ باپ کا نام فرحت حسین اور.....اور وہ پھولوں ایسی نازک ہے ہائے میری پوتی۔''

میں نے سپاہی کو آنکھیں پانی پلانے کا حکم دیا اور افسران بالا سے رابطہ کرنے لگا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس کے پیچھے شیر خان کا ہاتھ ہو گا۔ اسے خبر مل گئی ہو گی کہ شگفتہ اسی کلینک میں ہے وہ ڈاکٹر کے ذریعے اسے اغوا کرانا چاہتا ہو گا تاکہ مجھ پر دباؤ ڈال سکے۔ میں نے کانسٹیبلوں کو اس کے اسپتال بھیج دیا۔ ڈاکٹر کو بھی تسلی تشفی کے بعد واپس بھیج دیا۔

دس دن گزر چکے تھے نازلی کا پتا نہ چلا۔ وہ کہاں ہے' کس کے قبضے میں ہے اس کی خبر نہ ملی۔ میں نے ڈاکٹر سے بھی رابطہ کیا مگر وہ خاموش رہے۔ اداسی ان کے چہرے کا جزو بن چکی تھی' وہ مسکرانا بھول گئے تھے مگر مجھ سے پوتی کے بارے میں سوال نہیں کرتے تھے۔ ایسا لگتا تھا انھیں قرار آ چکا ہے۔ شگفتہ کی حالت بھی اب سدھرنے لگی تھی۔ وہ پہلے ایسی نہ تھی۔ اب بہکی بہکی باتیں بھی نہیں کرتی تھی۔ جب بھی جاتا وہ پرسکون ملتی۔ پہلے نشے کی طلب اسے بے چین کیے رہتی۔ وہ رات میں بھی جاگتی رہتی مگر اب اسے نیند آنے لگی تھی۔

اس دن جب میں پہنچا تو وہ سو رہی تھی۔ میرے پکارنے پر وہ اٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں مگر مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ بیٹھی اور بولی۔ ''راحیل ایک سگریٹ پلاؤ گے؟ نشے کی طلب بے چین کیے دے رہی ہے۔''

میں نے پیکٹ نکال کر بڑھا دیا۔ اس نے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور ڈبی کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''سادے سگریٹ میں مزہ کہاں لیکن کچھ تو راحت ملے گی۔''

ٹیبل پر دوا کی شیشی الٹی پڑی تھی دوا بہہ کر پیکٹ تک پہنچ رہی تھی کہ میں نے جلدی سے اسے اٹھا لیا۔ مجھے پیکٹ اٹھاتے دیکھ کر وہ بولی۔ ''پلیز ایک اور سگریٹ۔''

میں نے ڈبی بڑھا دی۔ اس نے پیکٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''پلیز راحیل' مجھے ایک ٹھنڈی بوتل لا دو نا۔''

میں اٹھ کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد لوٹا تو وہ منتظر بیٹھی تھی۔ میرے ہاتھ سے بوتل لے کر چسکیاں لینے لگی۔

مجھے تھانے پہنچنا تھا۔ اس لیے اٹھ کر باہر آ کر بائیک اسٹارٹ کی اور تھانے کی جانب چل پڑا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ میری بائیک کے سامنے ایک ہیرو نچی آ گیا۔ اسے بچانے کے لئے میں نے پوری کوشش کی اس کوشش میں بائیک قبرستان کے گیٹ سے ٹکرا تے ٹکراتے بچی۔ غصے میں ابلتا ہوا میں مڑا لیکن وہ ہیرو نچی غائب تھا۔ عیسیٰ نگری میرے علاقے میں نہیں تھا ورنہ میں ہیرو نچیوں کو اس طرح جمع ہونے نہ دیتا۔

کبھی کبھی تو مجھے حیرت ہوتی تھی۔ غریب آباد پل سے حسن اسکوائر تک ہیرو نچیوں کی جنت نظر آتی تھی۔ سینکڑوں کی تعداد میں ہر وقت جمع نظر آتے تھے۔ جدھر بھی نظر اٹھتی چار پانچ کی ٹولی میں بیٹھے نظر آتے۔ سب کا چہرہ ایک چادر سے ڈھکا ہوتا۔ ایک ہیرو ئن پیتا باقی اس کے دھوئے سے لطف لیتے۔ یہ نظارہ میری طرح افسران بالا بھی دیکھتے ہوں گے۔ برابر میں ہی بھٹائی رینجرز کا ہیڈ کوارٹر ہے ان جانبازوں پر اس کا اثر کیا پڑے گا۔ کبھی کسی نے سوچنے کی زحمت نہ کی ہو گی۔ مگر اس دن میں بالکل ہوا اٹھا تھا۔ وردی میرے جسم پر تھی۔ وہی وردی جسے زیب تن کرتے وقت ہم قسم کھاتے ہیں کہ جرم کا نام و نشان مٹا دیں گے۔ اس وردی کی لاج رکھنا ضروری تھی۔ میں نے قبرستان کے گیٹ پر بنی ماربل والی دکان سے ایک ڈنڈا اٹھایا اور ان بدبختوں پر پل پڑا۔ دو چار کو ڈنڈے پڑے تو باقی نے اونچے ہوتے سر کو اٹھا کر دیکھا اور پھر وہ سب ایسے بھاگے گویا بھوت دیکھ لیا ہو۔ جھگڑ دیکھ کر منارٹی فرنٹ کے آفس سے کچھ لوگ نکل آئے۔ میں نے انھیں اشارے سے بلایا۔ وہ نزدیک آ کر کھڑے ہو گئے۔

''کیا نام ہے؟'' میں نے ایک سے پوچھا۔

''جاوید مسیح۔''

''تمھیں شرم نہیں آتی۔ تمھارے علاقے میں یہ گندگی پھیلی ہے۔''

''سر ہم تو خود پریشان ہیں لیکن کیا کریں آپ لوگوں نے ہی انھیں چھوٹ دے رکھی ہے۔ مائکل صاحب نے کئی بار حکام بالا سے شکایت کی اور پہ سے آرڈر بھی آیا مگر کون سنتا ہے۔''

''کل سے یہاں کوئی نہ بیٹھے۔'' میں نے بائیک پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں جانتا تھا اکیلا پتا بھاڑ نہیں جھونک سکتا۔ وہ بے چارے کچھ بھی نہیں کر سکتے یہ لعنت اتنی آسانی سے تو ختم نہ ہو گی۔

تھانے پہنچ کر میں نے ڈبی سے سگریٹ نکالی اور ہونٹوں میں پھنسا کر تیلی جلائی۔ دو چار کش لیتے ہی منہ کا مزہ عجیب ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ دوا کا اثر سگریٹ میں بھی آ گیا ہے۔ اکلوتا سگریٹ تھا مجبوری میں اسے ہی پینا پڑا۔ سگریٹ ختم ہوتے ہی میرا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دائرے ناچنے لگے اور میں نے ٹیبل پر سر رکھ دیا۔

''اے مسٹر اٹھو۔'' چھڑی کی چبھن نے مجھے سر اٹھانے پر مجبور کر دیا اور سامنے کھڑے شخص کو دیکھتے ہی میں گھبرا گیا۔ ایس پی عارف حسین کھڑے تھے۔

میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو ایسا لگا کہ میرے پیروں میں جان نہیں ہے میں لڑکھڑا گیا اور کرسی کے ساتھ فرش پر گر گیا اور پھر جب مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھا۔ میرے بیڈ کے نزدیک ایک سپاہی بیٹھا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

"مجھے کیا ہو گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"آپ نے ہیروئن پی رکھی تھی۔ جس کے لئے شام میں آپ نے عیسیٰ نگری میں مار پیٹ بھی کی تھی۔ اب آپ لائن حاضر ہیں۔"

"میں۔ میں نے ہیروئن پی تھی؟"

"ہاں آپ نے' ایس پی صاحب نے خود پکڑا ہے۔ ڈاکٹر نے بھی تصدیق کر دی ہے۔" میرا دماغ ہوا میں معلق ہو گیا تھا۔ میں ایسی غلیظ شے کو ہاتھ لگا ہی نہیں سکتا تھا پھر ایسا کیوں ہوا؟ میں نے تو دوا میں بھیگی سگریٹ پی تھی اور وہ دوا ٹامن بی کمپلیکس تھی۔ ضرور ڈاکٹر کو دھوکا ہوا ہے۔

میں نے پاکٹ میں ہاتھ ڈالا۔ سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی مگر سگریٹ نہ تھی' میں نے سپاہی سے کہا۔ "بھاگ کر ایک پیکٹ سگریٹ لے لو۔"

"لیجئے پیجئے۔" اس نے سگریٹ نکال کر بڑھائی۔ میں نے سگریٹ تھام لی پہلا کش لیتے ہی مجھے بالکل ویسا ہی مزہ لگا جیسے میں وٹامن بی کمپلیکس میں بھیگا سگریٹ پی رہا ہوں۔ میں نے حیرت سے سگریٹ کو دیکھا۔ وہی میرا برانڈ تھا۔ میں سوچنے لگا پھر مزہ کیوں بدلا بدلا سا ہے۔ لگتا ہے منہ میں دوا کا ذائقہ باقی ہے۔ سگریٹ پی کر میں لیٹ گیا۔ مجھ پر غنودگی سی چھا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہونے لگا۔

میری آنکھ رات کے دس بجے کھلی۔ بھوک پیاس مر چکی تھی۔ صرف سگریٹ کی طلب تھی۔ میں نے اسٹول کی جانب دیکھا۔ وہ سپاہی ہنوز بیٹھا تھا۔ میں نے پھر ایک سگریٹ طلب کی جو اس نے فوراً پیش کر دی۔ مجھے پھر وہی مزہ ملا لیکن اس بار وہ مزہ نہیں لگا۔ عجیب سے سرور کا احساس ہوا۔ میں پھر سو گیا۔ صبح اٹھا تو پھر سگریٹ کی طلب ہوئی۔ میں اس سپاہی کو تلاش ہی کر رہا تھا کہ میرے تھانے کا ایس آئی تو نیق آ گیا۔ اس نے خلاف توقع سلام تک نہ کیا۔ میں جانتا تھا وہ مجھ سے حسد کرتا ہے میں نے اسے کئی بار لائن حاضر کروایا تھا۔ اس بار مجھے لائن حاضر کیا گیا تو وہ پہنچ گیا۔ ضرور میرا مذاق اڑانے آیا ہو گا۔

"ہو سٹرا تیل کیسی طبیعت ہے۔ مجھے تو خبر ہی نہ تھی کہ منشیات کے خلاف مہم چلانے والا ہی منشیات کا عادی ہے۔" اس کی زہریلی باتوں نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی پھر بھی میں نے جواب نہیں دیا۔ ڈال سے چاگر جائے تو حقیقت کھو دیتا ہے۔ میں اس وقت زیرو تھا۔ اس لئے بھی خاموش رہ گیا۔

مجھے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا "کسے تلاش کر رہے ہو؟"

"ایک گارڈ تھا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"گارڈ؟ تم کیا وی آئی پی ہو جو تمہیں گارڈ ملے گا۔ شکر کرو کہ ایس پی صاحب کو رحم آ گیا اور انہوں نے تمہیں اسپتال بھیج دیا مجھے حکم ملا ہے کہ تمہیں گھر پہنچا دوں۔"

"مگر وہ سپاہی؟"

"تم کس سپاہی کی بات کر رہے ہو۔ ٹھہرو میں نرس سے پوچھتا ہوں۔"

آگے کا احوال جاننے کے لیے
آئندہ ماہ شمارہ جون میں پانچویں قسط ملاحظہ فرمائیں

سلسلے وار کہانی ایک نئی دلچسپ قسط وار کہانی جسے آپ ہر ماہ پڑھنا چاہیں گے

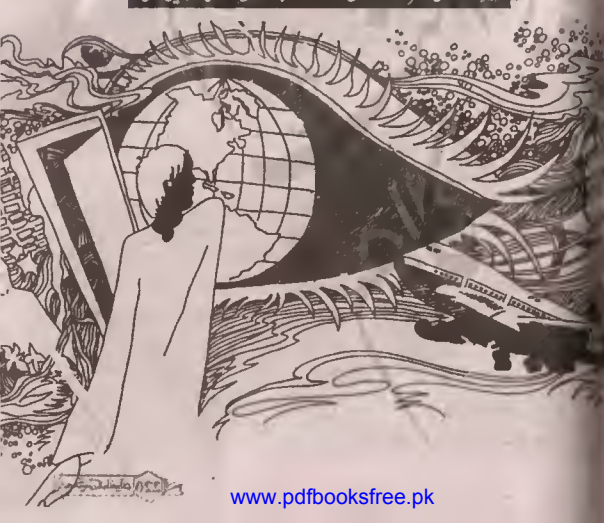
شازلی سعید مغل

تاشقون

حزیں صدیقی کا خیال

عالم رنگ و تماشا سے گزر
کوئی قیمت نہیں پائی کی

حیرت، تجسس، اسرار اور ستاروں سے جڑے بہت خاص سلسلے کی سولہویں کڑی



www.pdfbooksfree.pk

خلاصہ

"ناشون"..... ایک پاکستانی نژاد امریکی ہے۔ اس کے ماں باپ اُس کی پیدائش پر مصر چلے گئے تھے۔ وہ صرف ایک ماہر ستارہ شناس یا پراسرار علوم کا مالک ہی نہیں ہے بلکہ زر وحانیت کی منازل طے کر نا روشنی کا ایک استعارہ ہے۔ اُس کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جن کی دُعائیں بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبولیت پاتی ہیں اور زمین پر معجزہ بن کر واپس آتی ہیں۔ ذوالفقار مصباحی عرف ذُلفی' ناشون کا جگری یار ہے جس کی بیوی رانیہ طاغوتی طاقتوں کے نرغے میں پھنس جاتی ہے۔ ناشون اپنے دوست ذُلفی کے بلانے پر پاکستان کے لیے رختِ سفر باندھ لیتا ہے۔ رانیہ کی کیفیت واقعی خراب ہوتی ہے۔ وہ اکثر واقعوں کو محسوس کرتی ہے کہ جیسے اس کی روح اس کے جسم سے باہر جانے کی کوشش کرتی ہے لیکن جب اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوتی تو واپس رانیہ کے جسم میں آجاتی ہے۔ صورتِ حال نہایت گمبھیر ہوتی جارہی تھی' ایسے حملے بار بار ہو رہے تھے۔ چنانچہ ناشون اپنے دوست ذُلفی کی مدد کرنے کے لیے پاکستان چلا آتا ہے اور یہاں آکر رانیہ کا پیدائشی زائچہ بناتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رانیہ سازشوں کے زیرِ اثر ہے اور ستاروں کی بگھ خاص پوزیشنز نے اُسے کمزور بنا دیا ہے۔ اس کی پیدائش کے وقت سورج گرہن تھا جو کہ شیطانی قوتوں کے لیے نہایت سعد وقت ہوتا ہے۔ شیطانی قوتیں ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتی ہیں جن کی پیدائش کے وقت سورج یا چاند گرہن لگا ہو۔ رانیہ کے پیچھے بھی سیل شیا نامی ایک منظم طاغوتی تنظیم کی رکن لگی ہوئی ہے جسے اپنی طاغوتی قوتوں کو بڑھانے اور اپنے نامکمل مقاصد کو پورا کرنے کے لیے رانیہ کی روح درکار ہے۔ اس کے نامکمل مقاصد میں سب سے اہم مقصد اس کے شیطان صفت شوہر ہمائیل کی واپسی سرِ فہرست ہے۔ ہمائیل وہ مخلوق ہے جو کہ ایک صدی سے موت کی نیند سو رہا ہے۔ اپنے اس نامکمل مقصد میں کامیابی کے لیے سیل شیا ہر حد سے گزرنا جانتی ہے' چنانچہ اس نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایک صحرائی دیہاتی جوڑا کے مرنے کے بعد اس کے ہم زاد کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے جس کے ذریعے وہ فراعنہ مصر کے خزانوں پر بھی قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ سیل شیا نہایت کڑی تپسیا کے بعد ایک مرتبہ رانیہ کی روح کو اس کے جسم سے نکالنے میں کامیاب بھی ہوگئی تھی مگر ناشون نے اللہ تعالیٰ کی مرضی اور دعوت کے طفیل روح کو اس کے جسم میں واپس بلا لیا تھا۔ اس وجہ سے سیل شیا کی طاقتیں اس وقت کمزور پڑ گئی تھیں جب اس کا انتہا کاری وار خالی گیا تھا اور رانیہ کی روح جسم سے نکلنے کے باوجود ناشون کے علم اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے واپس رانیہ کے جسم میں چلی گئی تھی۔ اپنی اس ناکامی پر سیل شیا بوکھلا گئی تھی' اسے اپنے آقا شیطان کو منانے کے لیے کافی جتن کرنے پڑے تھے کہیں جا کر اسے ایک بار پھر یہ اجازت ملی کہ وہ کچھ عرصے بعد پھر دوبارہ کوشش کر سکتی ہے۔ اِدھر تو ناشون ذُلفی کے دوست شہباز سونگی کے گھر آکر مہمان کے جسم سے چار ہزار سال عمر رسیدہ جن کو نکالتا ہے۔ ذُلفی بہت فخر محسوس کرتا ہے کہ اُس کا دوست اس کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کے کام بھی آرہا ہے۔

راحت بچانے سیل شیا سے ایک نوجوان کامران کی ملاقات کروائی ہے جس کی بہن رقیہ کے گھر عجیب و غریب خوفناک واقعات پیش آئے ہیں۔ سیل شیا کا کہنا ہے کہ وہ مکان اس کے بتائے ہوئے شخص کو فروخت کر دیا جائے ورنہ انہیں بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

ناشون سے ملنے اس کے والد صاحب کے زمانے کے ایک بزرگ شاکر علی صاحب آتے ہیں جو سنگاپور میں اپنے مکان میں رہنے والے دوسرے خاندان کا ذکر کرتے ہیں جو کہ ڈاکٹر نیمسن کا آسیب تھا۔ ذُلفی کے گھر پر وہ اپنے سنگاپور والے مکان اور مادے اور جوہر کے ان کے والد اور ان کے نظریات کی بابت ذکر کرتے ہیں۔

(اب آگے پڑھیے۔)

وہ ہمارے ساتھ ساتھ سبک خرامی سے چلنے لگا تھا۔ اس نے بھی' ہمیں راہ سے بھٹکانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن ہم جی کڑا کر کے درست راستے پر چلتے رہے تھے اور پھر وہ شعلہ ہمارے ساتھ اس وقت تک چلتا رہا تھا جب تک ہماری منزلِ مقصود نہ آگئی تھی اور جیسے ہی ہماری منزل آئی تھی' وہ شعلہ غائب ہو گیا تھا۔"

"وہ شہابہ تھا' شہابۂ جو سنسان راستوں' صحراؤں میں نظری فریب دے کر مسافروں کو بھٹکا دیتا ہے۔ وہ غیر مرئی اجسام میں سے ہے۔" ناشون نے بتایا تھا۔ "صاحبو..... علم نجوم اور قدیم مائی تھولوجی کے نظریات کے

مطابق ہر مہینے کے شراراتی عناصر اپنے موجودہ اوقات میں کارفرما ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ ماہ فروری کو قدیم رومی بے زار کن مہینہ گردانتے تھے۔ رومی اس مہینے سے اتنی نفرت کرتے تھے کہ انہوں نے ہی اسے گھٹا کر اٹھائیس دن کا کر دیا تھا۔ ایک ایسا مہینہ جس میں لیپ کے سال میں 4 سال بعد ایک دن کا اضافہ کر دیا جاتا' اس طرح کیلنڈر کو مزید پیچیدہ بنا دیا گیا۔ قدیم مائی تھولوجی کے مطابق جسے ہم اب فروری کہتے ہیں' اُسے شراراتی عناصر کا مہینہ کہا جاتا تھا۔ ان عناصر کی ایک دیوی بھی جونا رئیا کہلاتی تھی' اُسے T کی شکل کے پتھر پر تراشا جاتا تھا۔ T کی شکل کے پتھر کو شراراتی عناصر کا حاکم یا ان پر نظر رکھنے والا بھی تصور کیا جاتا ہے۔ لوگ اکثر ان عناصر کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں لیکن جانتے بہت کم ہیں۔" ناشون چند لمحوں کے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔ "علم تو ایک نہایت گہرے سمندر کی طرح ہے جہاں سے آپ نہ جانے کون کون سے خزانے نکال لیں یا آپ کے ہاتھ لگ جائیں' معلوم نہیں' پر تو سمندر میں اتر کر ہی پتہ چلتا ہے۔ یہ عناصر کافی دلچسپ اور حیرت انگیز ہوتے ہیں۔ قدیم مائی تھولوجی کے نظریات اور علم نجوم میں ان کو خاص مقام اور اہمیت حاصل ہے۔ ان عناصر کی شرارت اس قسم کی ہوتی ہے کہ آپ حیران رہ جائیں گے لیکن تجربہ ثابت کرتا ہے' اگر غور کیا جائے تو وجود ثابت ہوتا ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں' وہ کیا ہو سکتی ہیں؟" ناشون نے شاکر علی خان اور ذُلفی کی طرف دیکھا تو انہوں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"ان کی مشہور شرارتوں میں فرنیچر کا کسی زاویے سے ٹیڑھا ہو جانا بھی ہے' یہ عناصر فرنیچر کو حرکت میں نہیں لاتے بلکہ میزیا کسی لکڑی کی چیز کا کونہ خفیہ طریقے سے ٹیڑھا ہو جاتا ہے' بعض دن تو ایسے بھی ہوتے ہیں جب بے جان چیزیں ضدی اور دشمن ثابت ہوتی ہیں اور قدیم روایات کے مطابق ان کا پسندیدہ مہینہ فروری کا ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ فرش پر کچھ اٹھانے کے لیے جھکے اور آپ سیدھا ہونے لگتے ہیں تو آپ کی کمر میں بل پڑ جاتا ہے۔ بعض راتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان اپنے گھر میں ہی ڈر جاتا ہے' ہینگر پر لٹکے کپڑے عجیب و غریب شکل بنا کر ڈر کا سبب بنتے ہیں۔ سینٹ ویلنٹائن کو فروری سے منسوب کیا گیا ہے' سینٹ ویلنٹائن محبت کے معاملات میں مشہور ہیں لیکن سینٹ ویلنٹائن کی زندگی کے اصل حالات سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا محبت سے دور دور تک کا واسطہ نہ تھا اور تاریخ گواہ ہے کہ 14 فروری کو سینٹ ویلنٹائن کو پھانسی دی گئی تھی۔ 14 فروری اس کے مرنے کا دن ہے اور اس دن سے بے حد افسوس ناک واقعات رونما ہوئے تھے' اس دن اس کے مرنے پر خاص رقص کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں چہرے پر مختلف ماسک پہن کر شرکت کرنی تھی' ناکہ اصل شخصیت پوشیدہ رہے۔ اس موقع پر شادیوں اور ترقی تعلقات کا خاتمہ کیا گیا تھا لیکن کوئی اس طرف توجہ نہیں دیتا۔ سینٹ ویلنٹائن کو پاگل ہونے کے جرم میں پھانسی دی گئی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فروری کے زیادہ تر حصے پر یورینس کی حکمرانی ہوتی ہے' جس کے متعلق کوئی بات پورے یقین سے نہیں کی جا سکتی جو پریشانی اور ابتری پھیلانے والا ستارہ ہے' چنانچہ یہاں اُن دیکھے شراراتی عناصر کی تشریح اگر کی جا سکتی ہے تو وہ یورینس کے ردیئے سے کی جا سکتی ہے۔ فروری کی 2,10,14,22,23 تاریخ خاص طور پر اہم ہیں۔ یورینس کی ان دنوں بہت بری حکمرانی ہوتی ہے۔ ان عناصر پر حکومت کرنے والا پتھر T کی شکل میں تراشا جاتا ہے۔ قدیم مائی تھولوجی کے مطابق سمجھا جاتا ہے کہ T کی شکل کا پتھر ان شراراتی عناصر کو کنٹرول کر سکتا ہے اور مصیبتوں' آفتوں سے تحفظ دیتا ہے' یہ بات کہاں تک درست ہے' اس کے متعلق کچھ خاص نہیں کہا جا سکتا لیکن تجربہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ قدیم عقائد محض عقائد نہیں ہوتے تھے' اُن کے پیچھے کوئی ٹھوس بنیاد ہوا کرتی ہے۔"

www.pdfbooksfree.pk

"لیکن تاشون، مجھے لگتا ہے، مافوق الفطرت اور توہم پرستی ان دونوں میں فرق عام لوگوں کو محسوس کرنا مشکل ہوتا ہوگا۔" زلفی نے بڑے پتے کی بات کی تھی۔

"تم نے ٹھیک کہا مگر یہاں بات صرف اور صرف علم کی ہی آجاتی ہے، ہم اس بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کرتے اور مرتے دم تک توہم پرستی کا شکار رہتے ہیں۔ میں تمہیں صرف جاہل نہیں، ایسے ایسے پڑھے لکھے اشخاص کے بارے میں اگر بتاؤں تو تم حیران رہ جاؤ گے۔ یورپ جو تہذیب و تمدن کا بڑا فخر یہ شاہکار بنتا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ سب سے زیادہ تو ہم پرستی کا شکار ہے۔ کیا تم یقین کرو گے کہ ایک امریکن پروفیسر ڈاکٹر ایڈورڈ ایچ کالویل نے اپنے گھر پر اپنے تین ساتھیوں کو کھانے پر مدعو کیا، کھانے کے دوران ان کے ایک مہمان سے جو ریاضی داں تھا، کچھ نمک گر گیا تو اس نے خود بخود اختیاری طور پر کچھ نمک لیا اور بائیں شانے کی طرف پھینک دیا اور پھر شام کو تاش کی میز پر اس کے تیسرے مہمان نے جو کہ ایک فلسفی تھا، بتایا کہ وہ برج کھیلتے ہوئے نیک شگون کے لیے نیلے پتے پسند کرتا ہے اور پھر بعد میں جب وہ فارغ ہو کر جمع ہوئے تو پروفیسر ڈاکٹر ایڈورڈ نے اپنے تینوں دوستوں سے ان کے ان توہمات کا ذکر کیا، تینوں نے حتمی طور پر اسے بتایا کہ ہم سب اس عام انسانی کمزوری سے مبرا نہیں ہیں۔ یہ 1944ء کی بات ہے، اس کے بعد ڈاکٹر ایڈورڈ کالویل نے توہمات کے سلسلے میں کافی چھان بین کی، اس کی ٹیم نے جو اٹھارہ ملکوں میں پھیلی ہوئی تھی، ایک لاکھ پچاس ہزار سے زیادہ لوگوں کے عام توہمات کے نظریات معلوم کیے۔ پہلے تو سائنس دانوں نے تقریباً چار ہزار توہمات کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا، اس کے بعد آدمیوں کو منکرین، پختہ معتقدین اور مکمل یقین، تین حصوں میں تقسیم کیا۔ یہ آخری قسم ان لوگوں کی تھی جو خود توہمات پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے مگر کھانے کی میز پر 13 افراد ہوں، پسند نہیں کرتے تھے یا لکڑی کی سیڑھی کے نیچے سے گزرنے سے پرہیز کرتے تھے۔ اس ہمہ گیر تحقیق سے بہت سی عجیب باتیں معلوم ہوئی ہیں مثلاً عموماً لوگ دو دنیاؤں میں رہتے ہیں، ایک عقلی سائنسی، دوسری غیر منطقی اور توہماتی، صرف 30 فیصد لوگ ایسے ہیں جو قطعیت سے کہہ سکیں کہ وہ توہم پرست نہیں ہیں۔ عموماً عورتیں زیادہ وہم کا شکار ہوتی ہیں، اس کے بعد سب سے زیادہ توہم پرست تاش اور جوئے باز ہوتے ہیں، ہندو قوم سب سے زیادہ توہم پرست ہے۔ چینی قوم بھی کسی وقت ایسی تھی مگر اب نئے دور کے افراد کی حالت پہلے جیسی نہیں رہی، امریکن سب سے زیادہ ٹونے ٹوٹکے باز ہوتے ہیں بلکہ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ امریکن سب سے زیادہ ٹونے ٹوٹکوں پر یقین کرتے ہیں مثلاً آج بھی وہ کوئی سکہ، چاندی کا، نعل پرانا ہو، ٹہنی کا ٹکڑا اور کچھ نہیں تو خرگوش کا پیر ہی سہی، اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں۔ ان کی دنیا اب بھی توہم پرستی سے آباد ہے۔۔۔ بہرحال یہ سب ماورا سے دور دنیاؤں سے جڑے خیال اور حقیقتیں ہیں جن کو پہلے مادے اور جوہر کی ظاہری حالت کے قائل حضرات گردانتے ہیں اور جب ان سے سابقہ پڑتا ہے تو پھر یہ غیر مادرائی دنیا اپنا یقین خود دلاتی ہے۔"

"تاشون.....! میں نے تمہیں شاید بتایا نہیں، جب میں رانیہ کے سلسلے میں پریشان حال اِدھر اُدھر پھر رہا تھا تو مجھے ایک صاحب نے کسی بزرگ کے بارے میں بتایا تھا۔ ان بزرگ سے ملاقات کے دوران میری ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جس کو شکایت تھی کہ اس کا مکان کسی شیطانی قوت کے زیر اثر آ گیا ہے جو کرائے دار بھی اس کے گھر میں رہنے آیا، اس کا ذہنی سکون ختم ہو گیا اور وہ جتنے دن بھی اُس مکان میں رہا، انتہائی خوف و ہراس میں رہا۔ اس صورت حال کے بعد وہ اپنا مکان بیچنا چاہتا تھا مگر مکان بہت بدنام ہو چکا تھا، اسے کوئی گاہک نہیں ملتا تھا

اور اگر ملتا تھا تو مکان کے بارے میں اس کو پہلے ہی سے پتہ چل جاتا تھا۔ بقول اس شخص کے "میرے مکان کے سارے کمرے حیرت انگیز طور پر سرد رہتے تھے اور ایک کمرہ تو ایسا تھا کہ اس میں جو شخص بھی داخل ہوتا، اس کو فوری طور پر کسی اَن دیکھی قوت کی موجودگی کا احساس ستانے لگتا اور اس کمرے میں سونے والے کو آدھی رات کے وقت جیسے کوئی کمرے سے باہر لاکر پٹخ دیا کرتا اور وارننگ کے طور پر اس کی کوئی نہ کوئی ہڈی پسلی ضرور توڑ دی جاتی تا کہ وہ اُس کمرے میں دوبارہ سونے کی جرأت نہ کر سکے۔ یہاں ایک سوال میرے ذہن میں اٹھ رہا ہے۔"

"وہ کیا؟" سونگا جلدی سے بولی تھی۔

"وہ یہ ہے کہ میں تو سمجھتا تھا کہ یہاں پاکستان، ہندوستان یا ایشیائی ممالک کے لوگ ہی اس طرح کی چیزوں کا شکار ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو ان میں حقیقت بھی نہیں ہوتی، صرف وہم ہوتا ہے لیکن کیا یورپ اور مغربی ممالک میں بھی مکان اور آسیب کا چولی دامن کا ساتھ ہے؟"

"اپنی کم علمی کا ماتم کرو۔" تاشون نے خفیف مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میرے دوست.....! یورپ اور مغربی ممالک تو توہمات اور حقیقت کے چکر میں ہم سے زیادہ پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر میں تمہیں یورپ اور مغربی دنیا کی توہم پرستی کے قصے سنانے لگ جاؤں تو تمہیں حیرت کے شدید جھٹکے ہی لگیں گے۔"

"لیکن اُن میں کچھ نہ کچھ حقیقت بھی ہے جیسا کہ ہمارے ساتھ ہوا۔" شاہ رخ علی نے تاشون کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"جی بالکل، اصل کیسز بھی ہوتے ہیں اور پھر اُن مکانات کو آسیب یا کسی اور شیطانی قوت سے بچانے کے لیے وہی طریقے اپنائے جاتے ہیں جو کہ زمانہ قدیم سے چلے آ رہے ہیں۔"

"مثلاً؟" زلفی نے فوراً ہی سوال کیا تھا۔

"مثلاً اب بھی بعض ملکوں میں مکانوں کی بنیادوں میں سکے دفن کیے جاتے ہیں تا کہ مکان دولت سے خالی نہ رہے، مکان کی آخری اینٹ لگانے کے ساتھ صنوبر کے درخت یا ورچی خانے کے ساتھ یا مکان کی چنی کے قریب لگائے جاتے ہیں۔ صنوبر کا درخت بڑا مقدس تسلیم کیا جاتا ہے اور زمانہ قدیم سے یورپ میں اسے گھر میں اس لیے لگایا جاتا ہے کہ گھر کو مقدس تحفظ حاصل رہے۔ اس کے علاوہ قدیم رومیوں سے بھی کچھ رسوم وابستہ ہیں جن میں گھر کے دالان یا ڈیوڑھی کو گھر کی دیوی ویستا سے منسوب کرتے تھے اور گھر کے دروازے اور گیٹ کو قدیم اطالوی دیوتا جانوس سے منسوب کرتے تھے جو دروازوں کا محافظ سمجھا جاتا تھا۔ اگر چہ اب رومن اور اس کی قدیم رسمیں صرف یادیں بن چکی ہیں، تاہم رومی گھر کو اس قدر مقدس سمجھتے تھے کہ اسے ایک معبد یا گھریلو عبادت گاہ کا درجہ دیتے تھے۔ قدیم انگلستان میں دہن کو وہ چوما بطور تحفہ دیتے تھے، اس سے اس بات کا اظہار ہوتا تھا کہ وہ گھر اور باورچی خانہ کی مالکن ہے۔"

"اوہ، یعنی قدیم زمانے میں بھی گھر کی مالکن اور باورچی خانے کی حکومت مسلمہ تھی؟" زلفی نے حیرت کا اظہار کیا۔

"جی، بالکل۔" تاشون نے کہا۔ "گھر کی سلطنت کا پایۂ تخت" باورچی خانہ" شروع سے تھا اور رہے گا۔ قدیم زمانے میں باورچی خانے کو گھر کے وسط میں بنایا جاتا تھا۔ دھوئیں کی نکاسی کے لیے چمنی بنائی جاتی تھی۔ اُس وقت آگ اور چولہے کو اس قدر مقدس سمجھا جاتا تھا کہ ایک شخص صرف اس لیے ملازم رکھا جاتا تھا کہ وہ آگ کبھی بجھنے نہ دے اور اگر پہلی مرتبہ کوئی اپنا علیحدہ گھر بنا لیتا تھا تو وہ اپنے گھر میں پہلی بار آگ جلانے کے لیے اسی خاندانی اور قدیم چولہے سے آگ یا دہکتا ہوا انگارہ لے کر جاتا تھا۔ اسی طرح خاندانی زندگی کا تسلسل نسل در نسل

www.pdfbooksfree.pk

اس جلتی رہنے والی آگ کے ذریعے برقرار رکھا جاتا تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کئی ممالک میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ گھر کے چولہے میں جلنے والی آگ کو مقدس دیوتا کا تحفظ حاصل ہے اور روس میں تو بعض علاقوں میں آج بھی چولہے کی آگ کی حفاظت کرنے والے مقدس دیوتا کی عزت کی جاتی ہے کیونکہ وہاں کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یہ دیوتا اس قدر غصے والا ہے کہ اگر حفاظت نہ کی گئی تو وہ ناراضگی میں گھر میں آگ لگا سکتا ہے اور وہم کا عالم یہ ہے کہ گھر میں لگی ہوئی کوئی تصویر اگر بغیر کسی وجہ کے گر جائے تو اسے موت کی دستک سمجھا جاتا ہے' نام اس وارننگ کا اطلاق عموماً حاملِ تصویر پر ہوتا ہے۔ مغربی جدید و قدیم توہمات میں ایک آئینے سے متعلق بھی ہے۔ بعض علاقوں میں یہ دستور ہے کہ کسی گھر میں موت واقع ہو جانے کی صورت میں گھر میں موجود تمام آئینے اس خوف سے ڈھک دیئے جاتے ہیں کہ کہیں روح آئینے میں اپنا عکس نہ دیکھ لے' ایسا ہونے کی صورت وہ دوسری دنیا تک طویل سفر میں رفاقت کی غرض سے خاندان کے کسی اور فرد کو بھی ساتھ لے جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ گھر میں آئینے کا ٹوٹ جانا' سات سال کے لیے بدقسمتی لاتا ہے۔ اسکاٹ لینڈ میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ پہاڑوں کی مٹی اگر گھر میں رکھی جائے تو چڑیلیں اور شیطانی روحیں گھر میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ کچھ لوگ گھر کی چھت پر ہرا لہسن اگاتے ہیں کیونکہ اُن کے خیال میں اس طرح گھر آگ لگنے سے محفوظ رہتا ہے اور کچھ لوگ اپنے گھر کو آسیب سے بچانے کے لیے درخت لگا کر اس کے چاروں طرف سفید پھول لگا دیتے ہیں کیونکہ اس انداز میں درخت اور پھول لگانے سے گھر کو چاند کی دیوی 'آئی سس' کا تحفظ حاصل ہو جاتا ہے یا پھر گھر میں سنہرے یا نارنجی پھول لگا کر گھر کو سورج دیوتا' کے تحفظ میں دے دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ عقیدوں اور باتوں میں حقیقت بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں توہمات کی دنیا آباد ہے وہاں شیطانی قوتیں بھی کارفرما ہوتی ہیں جیسا کہ شاکر علی صاحب نے بتایا۔" ٹاشون نے اپنی بات کے تسلسل میں ایک مرتبہ پھر شاکر صاحب کے سنگاپور والے مکان کی مثال پیش کی تھی۔

"کسی گھر میں غیر مرئی یا شیطانی قوت کی موجودگی سے خطرناک کوئی اور بات نہیں کیونکہ ایسی قوتیں رُوحانی' جسمانی' مادی غرض ہر قسم کا نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں بھی پرانے زمانے کے لوگ گھروں میں ایسی چیزیں ضرور رکھا کرتے تھے جن کی موجودگی شیطانی قوتوں کو گھر میں آنے سے روکتی تھیں مثلاً گھوڑے کی نعل گھر کے دروازے پر لٹکانے میں بھی یہی خیال کارفرما ہوتا ہے کیونکہ نعل لوہے کی یا قوت حفاظتی جادوئی قوت و خصوصیات کے ساتھ ساتھ مال و دولت کی بھی خصوصیات رکھتی ہے' اس طرح یہ نعل نہ صرف تحفظ بلکہ خوش بختی بھی لاتا ہے۔ گھر تبدیل کرتے وقت عموماً نئے گھر میں سب سے پہلے نمک لا کر رکھا جاتا ہے کیونکہ نمک شیطانی قوتوں کے خلاف رُوحانی رکاوٹ کا کام کرتا ہے۔ گھر کو شیطانی قوتوں سے محفوظ اور برکتوں' خوشیوں سے ہمکنار کرنے کے لیے زمانہ قدیم سے یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے اور چلتا رہے گا۔"

"بالکل بجا فرمایا آپ نے۔" شاکر علی نے کہا۔ "لیکن اس کے علاوہ بھی ایک چیز ہے جو گھر یا گھروں میں رہنے والے کینکوں کو رُوحانی اور جسمانی نقصان' بیماری وغیرہ کی صورت پہنچا سکتی ہے اور جسے بہت عرصے تک گھر میں رہنے والے سمجھتے ہیں کہ وہ جب سے اس گھر میں شفٹ ہوئے ہیں' تب سے ہی ان کے ساتھ مسائل چل رہے ہیں اور جب اسے گھر کی نحوست سمجھتے سمجھتے بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز اور حقیقت کچھ اور ہی تھی۔"

"وہ چیز کیا ہے؟" زلفی نے کچھ سمجھتے' نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"جادو..... کالا جادو....." ٹاشون نے گہرے لہجے میں کہا تھا۔

"ہاں' گھروں میں موجود شیطانی قوتوں کے علاوہ' گھروں میں رہنے والے کینکوں کو بھی شیطانی مقاصد کا شکار بنایا جاتا ہے' ایسا کسی دشمنی کی بنا پر یا دیگر وجوہ کی بنا پر ہوتا ہے۔" شاکر علی نے کہا تھا۔ "کیا آپ لوگوں کو معلوم ہے' میرے پاس جو افریقی سیاہ فام ملازم ہنڈرک ہے' اس کے گھر کی دو عورتیں اس کا شکار ہو کر مر چکی ہیں اور اس سیاہ فام لڑکے ہنڈرک کو میں بڑی ناگفتہ بہ حالت میں اپنے گھر لے کر آیا تھا اور پھر رفتہ رفتہ اس کی حالت میں سدھار آ تا گیا لیکن اب بھی وہ اس واقعہ کو نہیں بھولا اور کبھی کبھی تو اس پر ایک دورہ سا پڑتا ہے تو اس کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"کیا کچھ آپ کے جیسا ہی گزر رہا ہے اس پر؟" ٹاشون نے شاکر علی سے پوچھا۔

"ہاں' ہم سب تو اُس گھر سے بہ خیر و خوبی نکل آئے تھے لیکن ہنڈرک کا تقریباً پورا خاندان شدید متاثر ہوا۔ میں اس کے ساتھ افریقہ چلا گیا کہ شاید اپنے تباہ شدہ گھر کو دیکھ کر اسے سکون آ جائے۔"

"ہوا کیا تھا اس کے ساتھ؟" زلفی نے پوچھا۔

"آپ سنیں گے افریقہ کے جادوگروں کی کارستانیاں؟" شاکر علی نے کہا۔

"ہاں ہاں' ضرور سنیں گے۔" زلفی نے کہا جبکہ دوسروں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"ہنڈرک نے بتایا تھا کہ وہ کسی کمیت میں رہتے تھے' ان کے ساتھ ان کی ایک غیر شادی شدہ خالہ بھی رہتی تھی۔ وہ مرغیوں کے انڈے جمع کر کے بیچتی تھی اور ان کی بہت مدد کرتی تھی۔ ایک دن اس کی دائیں ٹانگ میں شدید درد اٹھا جو بڑھتا ہی گیا حتیٰ کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہی لیکن اس نے پھر بھی لاٹھی کے سہارے انڈے جمع کرنا اور بیچنا نہ چھوڑے۔ وہ صبح نکل جاتی اور شام ڈھلے واپس آتی۔ ہنڈرک کی والدہ نے اپنی بہن کی حالت کے پیشِ نظر اُسے روکا لیکن اس نے اصرار کیا کہ وہ کام مزدوری کرے گی کہ وہ جس گھر میں رہتی ہے' اس کا فرض ہے کہ ان کے لیے کچھ کرے۔ خیر' اس نے کام جاری رکھا لیکن اس کی وہ مردزدہ ٹانگ خراب ہونا شروع ہو گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دوسری ٹانگ بھی خراب ہو گئی' یہاں تک کہ وہ چلنے پھرنے سے بالکل معذور ہو گئی تھی۔ اس کی ماں اُسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے جاتی رہی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔ وہ دن بدن کمزور اور لاغر ہوتی چلی گئی تھی حتیٰ کہ وہ اپنے بستر سے بھی نہ نکل سکتی تھی اور پھر اس کی خالہ ایک دن موت کی وادیوں میں کھو گئی تھی۔"

"ہنڈرک جس کمیت میں رہتا تھا' اس کے برابر والے کمیت میں ایک ہندوستانی رام رہتا تھا' وہ ہنڈرک کی ماں کے پاس آیا اور اسے بتایا کہ "آپ کی بہن کی موت جادو کی وجہ سے ہوئی ہے کیونکہ میں نے خود ایک جادوگر ڈاکٹر کو آپ کے راستے میں کالے جادو کی پڑیا دفن کرتے دیکھا تھا۔ آپ کی بہن جونہی اس پر سے گزری ہو گی' جادو نے اپنا کام کر دیا اور وہ تکلیف میں مبتلا ہونے کے بعد مر گئی۔"

"میری ماں اور باپ یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔" ہنڈرک نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا۔ "وہ ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے' انہوں نے اس شخص سے پوچھا کہ پڑیا میں ایسا کیا ہو سکتا ہے جو اس جادوگر ڈاکٹر نے دفن کی تھی؟ اس ہندوستانی رام نے بتایا کہ اس پڑیا میں آپ کی بہن کے بال اور ناخن ہوں گے۔ افریقہ میں جادوگر ڈاکٹر یہ کام معاوضہ لے کر کرتے ہیں اور مختلف عملیات کر کے وہ جادوئی پڑیا تیار کرتے ہیں' یہ پڑیا جس شخص کے لیے ہوتی ہے' اس کے راستے میں دفن کرتے ہیں' جس پر سے وہ گزرتا ہے اور بیماری کی حالت میں مر

www.pdfbooksfree.pk

جاتا ہے..... اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں یہ پڑیا نکال کر جلا دوں؟ ایسا کرنے سے جس نے جادو کرایا ہے، وہ آدھے گھنٹے میں یہاں حاضر ہو جائے گا۔"

"میرے باپ نے رام کو اس بات کی اجازت دے دی تھی، وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ رام جھوٹ بول رہا ہے یا سچ؟ رام نے اپنی مذہبی روایات و رسومات کے تحت پوجا پاٹ کر کے ایک کدال لی تھی اور مرغی خانے کے راستے میں جا کر ایک جگہ کھودنے کے بعد وہاں سے ایک پڑیا نکالی تھی جس پر ایک ڈوری لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں ہدایت دی تھی کہ اسے ہاتھ نہ لگاؤں اور پھر اس نے پڑیا کو کدال پر رکھ کر آگ دکھادی تھی۔ جونہی وہ پڑیا جلی تھی ایک بدبودار دھواں پیدا ہوا تھا اور تقریباً بیس منٹ بعد میری ممانی ہمارے گھر آن موجود ہوئی تھیں۔ ان کا نام اینا تھا۔"

"یہی وہ عورت ہے جس نے جادو کرایا تھا۔" رام نے میرے باپ سے کہا تھا۔ "لیکن وہ یہ بات مانتے میں تردد اس لیے کر رہے تھے کہ میری ممانی اینا اتفاقاً بھی تو یہاں آ سکتی ہیں۔ بہرحال پھر رام نے میرے پاس سے کوئی اور بات نہیں کی تھی اور اپنے کمیت واپس ہولیا تھا۔ اس تمام صورت حال میں تباہی کا اصل پہلو تب نکلا جب میری بہن نیلیا جو پندرہ سال کی عمر کو پہنچی ہی تھی کہ اچانک بیمار رہنے لگی۔ نیلیا ایک بہت خوبصورت لڑکی تھی اور اس کی خوبصورتی اور معصومیت کی وجہ سے اُسے اسکول میں بھی سب بہت پسند کرتے تھے اور وہ ہماری ممانی اینا کی بیٹی جانا تا سے زیادہ حسین تھی جس وجہ سے نانا نانی بھی اسے بہت چاہتے تھے اور یہی وجہ بنی جو ممانی اینا کی بیٹی جانا تا نیلیا سے شدید حسد کرنے لگی اور پھر نیلیا شدید بیمار ہو گئی۔ میرے ماں باپ شدید پریشان تھے۔ انہوں نے نیلیا کے علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی پھر بھی وہ دیکھتے ہی دیکھتے خالہ کی طرح دونوں ٹانگوں سے مفلوج ہو ہی گئی تھی۔ اب میرے باپ کو رام کی باتوں میں کچھ سچائی محسوس ہوئی تھی۔ انہوں نے فوراً اس کو بلا کر تمام صورت حال بتائی تھی۔ اس نے میری بہن کا معائنہ کرنے کے بعد یہی کہا تھا کہ اس پر جادو ٹونہ کیا گیا ہے۔ میرے باپ نے نیلیا کو بچانے کے لیے رام کو تمام ممکنہ اقدامات کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ رام کچھ دیر تک کچھ پڑھنے کے بعد ہمارے گھر کے کچن کی سیڑھیوں کی طرف گیا تھا اور وہاں کھدائی شروع کر دی تھی اور وہاں سے دیسی ہی ایک پڑیا نکلی تھی جیسی پڑیا رام نے اس سے پہلے میری خالہ کے گزرنے والے راستے سے نکالی تھی۔ میری بہن نیلیا کچن کی سیڑھیوں کے پاس سے روزانہ گزرتی تھی، وہاں سے گزرتے تو گھر کے تمام افراد ہی تھے لیکن یہ جادو نیلیا کے نام کا تھا اس لیے اس کو ہی نقصان پہنچا تھا۔ رام نے پہلے کی طرح اس پڑیا کو آگ لگا دی تھی اور پڑیا کے جلنے کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہی ممانی اینا ہمارے گھر آ گئی تھیں اور انہوں نے کہا تھا کہ میں نیلیا کی طبیعت دریافت کرنے آئی ہوں۔ اب میرا باپ اپنا صبر کھو چکا تھا۔ اس نے ممانی سے صاف صاف بات کی تھی کہ "ہمیں تمہاری چالبازیوں کا لے کر تو تک کا علم ہو چکا ہے۔" میری ممانی پہلے تو یہ بات تسلیم ہی نہیں کر رہی تھیں لیکن ان کے انکار پر رام نے ان پر کچھ پڑھ کر پھونک ماری تھی اور پھر اچانک ہی ممانی کے اندر سے بدبو کے بھبکے اٹھنے شروع ہو گئے تھے اور ممانی نے فوراً ہی یہ اقرار کر لیا تھا کہ وہ ہی نیلیا کو جان سے مارنا چاہتی ہیں اور خالہ کو بھی انہوں نے کالے جادو کے سبب مروا دیا ہے۔

ممانی نے جرم قبول تو کر لیا لیکن نیلیا تو بہت دیر ہو چکی تھی، اس کی زندگی اگلے دن ختم ہو گئی..... خالہ کی طرح نیلیا بھی دنیا سے چلی گئی..... میری ماں صدمے سے نیم پاگل ہو گئی اور اس نے پھر ہمارے کھیت میں بنے کنویں میں چھلانگ لگا دی..... میرا باپ اپنے گھر کی تباہی برداشت نہ کر سکا، اس نے میری ممانی اینا کو جان سے مار دیا

اور جیل چلا گیا۔"

شاکر علی کی زبانی ہنڈرک کی اتنی دلخراش روداد زندگی سن کر ماحول پر ایک بوجھل سا سکوت طاری ہو چکا تھا۔

"پورا گھر، خاندان..... آہ..... بے چارہ غریب ہنڈرک....." زلفی کو اس سیاہ فام لڑکے سے بہت ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

•.....•.....•

وہ ایک نہایت خوبصورت سا مضافاتی مقام تھا جہاں تاحد نظر درخت ہی درخت نظر آ رہے تھے۔ درختوں کے اس جنگل کے درمیان ایک خوبصورت، صاف ستھرا اور میدانی راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں ایک بہت شاندار فارم ہاؤس تھا جو کہ پورے چاند کی اس روشن نرم چاندنی بکھیرتی رات میں آنے والے مہمانوں کے سواگت کا منتظر تھا۔ درختوں اور جنگلی بیلوں سے ڈھکے اس خوبصورت فارم ہاؤس میں آج تاشون کی طرف سے اپنے دوستوں کے لیے ایک ضیافت کا انتظام کیا گیا تھا۔ مہمان دھیرے دھیرے آنا شروع ہو چکے تھے۔ زلفی اور رانیہ کے لیے بھی یہ ایک سرپرائزنگ بات تھی کہ تاشون کسی اتنے خوبصورت مقام پر اس طرح ضیافت کا انتظام کرے گا۔ اس وقت ایک خدمت گار فارم ہاؤس کا بڑا سا دروازہ کھول کر ملاقاتیوں کو نہایت احترام کے ساتھ اندر بھیج رہا تھا۔ اندر جدید و قدیم امتزاج کے ساتھ نہایت نفاست اور خوبصورتی سے زیب و زینت کی گئی تھی۔ خوبصورت مرمریں فرش، بلوری آئینوں اور حسین منقش فرنیچر میز بان کے اعلیٰ ذوق کی گواہی دے رہا تھا۔ تاشون چونکہ پیدائشی مصری تھا چنانچہ دریائے نیل کی قدیم تہذیب اس کے ذوق میں اپنی جھلک ضرور دکھلاتی تھی۔ فارم ہاؤس کی سادہ مگر نفیس سی زیب و زینت میں بھی مصری تہذیب کی ایک خوبصورت جھلک موجود تھی۔

"یار، کمال کر دیا تم نے، واقعی چھپے رستم نکلے۔" زلفی نے تحسین آمیز نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے، اس فارم ہاؤس کی تلاش، خریداری اور زینت، عمر اور مونگا کی مرہون منت ہے۔ یہ جنگل سا مقام مجھے بہت اچھا لگا ہے اور یہاں جنگلی پھولوں کی مہک کی تو کیا بات ہے، انسان کو پتہ نہیں کہاں پہنچا دیتی ہے بلکہ اپنے آپ سے ملوا دیتی ہے۔"

"جمتی، مجھے تو یہ جگہ بہت پسند آئی ہے۔" رانیہ چاروں طرف گھوم پھر کر ان لوگوں کے پاس آئی تھی۔ "سچ تاشون بھائی، خود سے ملاقات ہو سکتی ہے یہاں؟" رانیہ نے جذب کے سے عالم میں کہا تھا۔ اسی وقت کچھ اور مہمانوں کی آمد ہوئی تھی۔ تاشون اُن کے استقبال کے لیے آگے بڑھا تھا۔ آنے والے مہمانوں میں شاکر علی اور ڈوہانی بھی شامل تھے۔ ڈوہانی کو دیکھ کر بھی بہت خوش اور حیران ہوئے تھے۔ عمر نے بتایا تھا کہ وہ اینگلو انڈین لڑکی بس اچانک ہی انگلینڈ چلی گئی تھی اور اب دو روز پہلے ہی واپسی ہوئی تھی۔ اسے وہاں اپنے درمیان دیکھ کر سب ہی کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ ابھی وہ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھ ہی رہے تھے کہ اچانک ہی تاشون کے دربان نے اسے ایک مستطیل باکس ڈاکر دیا تھا جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا کارڈ منسلک تھا۔ اس پر بھیجنے والے کا نام درج تھا۔ وہ گفٹ باکس ریڈ کلر کے گفٹ پیپر میں لپٹا ہوا تھا۔ تاشون نے کچھ دیر پر سوچ نظروں سے اس گفٹ باکس کو دیکھا اور پھر اسے اندر رکھنے کا اشارہ دے کر اپنے مہمانوں کی میزبانی کرنے لگا۔

رات گہماگہمی جاری ہی تھی اور موسم بہت خوشگوار تھا کیونکہ اس وقت ہلکی پھواری پڑنا شروع ہو گئی تھی اور پھر جب دھیرے دھیرے تاشون کے مہمان رخصت ہو گئے تھے تو زلفی، رانیہ، ڈوہانی اور شاکر علی، عمر کی فرمائش پر اُس رات وہیں

www.pdfbooksfree.pk

رکنے والے تھے۔ فارم ہاؤس کے فرانسیسی دریچوں سے چھن کر آنے والی چاند کی روشنی میں ماحول خاصا پراسرار سا ہو رہا تھا۔ ذوہائی جو کافی دیر سے دریچے کھولے کھڑی تھی' سب کے ساتھ آ کر بیٹھ چکی تھی۔ عمر کافی دیر سے اُس گفٹ پیک کو کھولنے کے چکر میں تھا۔ زلفی کو بھی ایک تجسس تھا کہ اُس گفٹ پیک میں کیا ہے اور کس نے بھیجا ہے جو بڑا پراسرار سا تحفہ لگ رہا تھا۔

مونگ سب کے لیے کافی بنا لائی تھی۔ یخ بستگی نرم چاندنی رات میں بھاپ اڑاتی کافی اس پر تکلف ضیافت کا ایک خوبصورت اختتام معلوم دیتی تھی۔ شاکر علی' عمر کو سنگاپور کے قصے سنا رہے تھے۔ زلفی اندر سے تاشون کا گفٹ پیک اٹھا لایا تھا۔ ''خواتین و حضرات' اب میں اس کو کھولنے لگا ہوں۔'' زلفی نے باآواز بلند یہ اعلان کرتے ہوئے پیکٹ کھول ڈالا تھا۔ پیکٹ میں سے نکلنے والی چیز نے اُن سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

''مجھے پتہ تھا' وہ مجھے ایسا ہی کچھ بھیج سکتی ہے۔'' تاشون نے کہا تھا۔

''تمہارا اشارہ سیل شیا کی طرف تو نہیں؟'' زلفی نے پوچھا تھا۔

''ہاں' وہ ہی ہے' مجھے بلاوجہ چھیڑ رہی ہے' سکون اسے راس نہیں آ رہا ہے۔'' یہ بات سن کر رانیہ کے چہرے پر اترتی پریشانی کی جھلک دیکھ کر تاشون نے فوراً ہی بات کا رخ موڑ دیا تھا۔ ''ویسے دشمن بھی اگر باذوق ہو تو پھر دشمنی کا مزہ بھی الگ ہوتا ہے' کیوں شاکر صاحب؟'' تاشون نے شاکر علی کی جانب جھکتے ہوئے کہا تھا تو وہ بھی زیرلب مسکرا دیئے تھے۔

''ارے دیکھیے بھئی چاندنی رات اور یہ آئی سس کا مجسمہ۔'' تاشون نے پیکٹ میں سے ایک چھوٹا سا مجسمہ نکال کر میز پر رکھا تھا۔ وہ ایک دیوی کا مجسمہ تھا' ایک عظیم الشان دیوی کا مجسمہ جسے قدیم مصر کے لوگوں نے آئی سس کا نام دیا تھا۔ وہ چاند سے منسوب تھی' وہ چاند کی دیوی کہلاتی تھی۔ ہزاروں سال قبل مصریوں نے اسے آئی سس کا نام دیا تھا اور ان کی درمیانی مدت میں فونیقی قوم میں بھی دیوی عسطوروت کے نام سے یاد کی جاتی تھی۔ یہ لوگ اس کی پرستش مقدس غاروں میں کرتے تھے جہاں فاختائیں اور کبوتر قربان کیے جاتے تھے اور ساتھ ہی نفس پرستی کے انتہائی شرم ناک' ناقابل بیان ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ مصریوں کی آئی سس اور فونیقی قوم کی عسطوروت کا عاشق ایک دیوتا عدونس مانا جاتا تھا اور لوگ ہر سال اس دیوتا کی افسانوی موت کا ماتم کرتے تھے کیونکہ وہ اس دیوتا کو عالم انسانیت کا نجات دہندہ تسلیم کرتے تھے۔ جب وہ جلوسوں کی شکل میں عسطوروت دیوی کے معبدوں کی طرف جاتے تھے تو خود کو انتہائی وحشیانہ جوش میں غرق کر لیتے تھے اور بہوشدہ دیوی کے غم میں اپنے جسموں کو نجروں سے زخمی کر لیا کرتے تھے اور اس طرح خون بہایا جاتا کہ اب صدیاں گزرنے کے بعد بھی یہ دیوی ان کے عقیدے کے مطابق مزید خون کی پیاسی ہے اور اگر ایک مناسب وقت پر اور مناسب مقام پر ضروری تیاریوں کے ساتھ اعلیٰ ترین درجے کا جادوگر چادو کے مخصوص گیارہ الفاظ جن میں سے ہر ایک لفظ گیارہ حروف رکھتا ہے' ایک خاص ترتیب سے دو مرتبہ ادا کرے تو یہی دیوی چشم زدن میں تمہارے سامنے آ کھڑی ہو جائے گی اور اپنے بھرپور حسن و جمال کی دھنوں کے ساتھ ایک نئی قربانی طلب کرے گی۔''

اُس وقت تاشون کی اس بات کی تائید میں مونگا اور شاکر علی نے اپنے سر ہلا دیئے تھے۔ زلفی جو کہ جدید خیالات اور روشن خیال طرزِ فکر رکھنے والا انسان تھا مگر اس وقت تاشون کے بیان کردہ آئی سس کے مجسمے اور اس کی تاریخ کے سلسلے میں کسی پس و پیش کا شکار نہ ہوا تھا بلکہ اسے آئی سس کی خوفناک پوشیدہ حقیقت کا مکمل یقین تھا۔

''لیکن کیا یہ فکر کی بات نہیں ہے کہ یہ مجسمہ تمہیں سیل شیا نے کیوں بھیجا ہے؟'' زلفی نے فکریہ انداز میں تاشون سے دریافت کیا تھا۔

''نہیں' یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔'' تاشون نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔ ''بس وہ ویسے ہی یاد دلا رہی ہے کہ میں ابھی زندہ ہوں اور تمہاری منتظر ہوں۔'' تاشون نے یہ بات کچھ ایسے انداز میں کہی تھی کہ تقریباً سب ہی ہنس پڑے تھے۔

''سیل شیا نے آپ کو کچھ یاد دلایا ہو یا نہ دلایا ہو' مجھے تو اپنا معاملہ' اپنی حالت یاد آ گئی ہے۔ وہ چاند گرہن اور میں.....'' رانیہ نے تشویش بھرے انداز میں اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''صرف چاند گرہن سے کچھ نہیں ہوتا بھائی! آپ کو یاد ہے نا' میں نے آپ کو بتایا تھا کہ جب آپ کی پیدائش ہوئی آسمانوں پر چند خاص ستارے ایک جگہ جمع تھے اور اس پار سیل شیا جادو کا جو عمل کرے گی' وہ اُن دونوں خاص ستاروں مریخ اور زحل کے ایک برج میں جمع ہونے پر ہی زود اثر ہوگا۔ اس کے بغیر سیل شیا کا عمل پورا نہیں ہوگا اور وہ اجتماع ٹھیک ایک سال بعد آئے گا لہٰذا ابھی آپ فکر نہ کریں بلکہ اب کبھی فکر نہ کیجیے گا۔'' تاشون نے مسکراتے ہوئے رانیہ کو تسلی دی تھی۔

''تاشون.....! یہ چاند گرہن والی بات تو سمجھ آ گئی ہے مگر یہ مریخ اور زحل کا معاملہ کیا ہے؟'' عمر نے حسب سابق اپنی ناک میں اضافہ چاہا تھا۔ ''آپ لوگوں کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ میرا فلکیات کا علم بہت ہی زنگ خوردہ ہے' اب کچھ کچھ معلومات حاصل ہوتی جا رہی ہیں' چند کتابیں بھی لے کر آیا ہوں جو زیرِ مطالعہ ہیں لیکن ظاہر ہے' تم سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں' وہ جلد سمجھ آ جاتی ہیں۔'' عمر نے ایک تمہید سی باندھی تھی۔

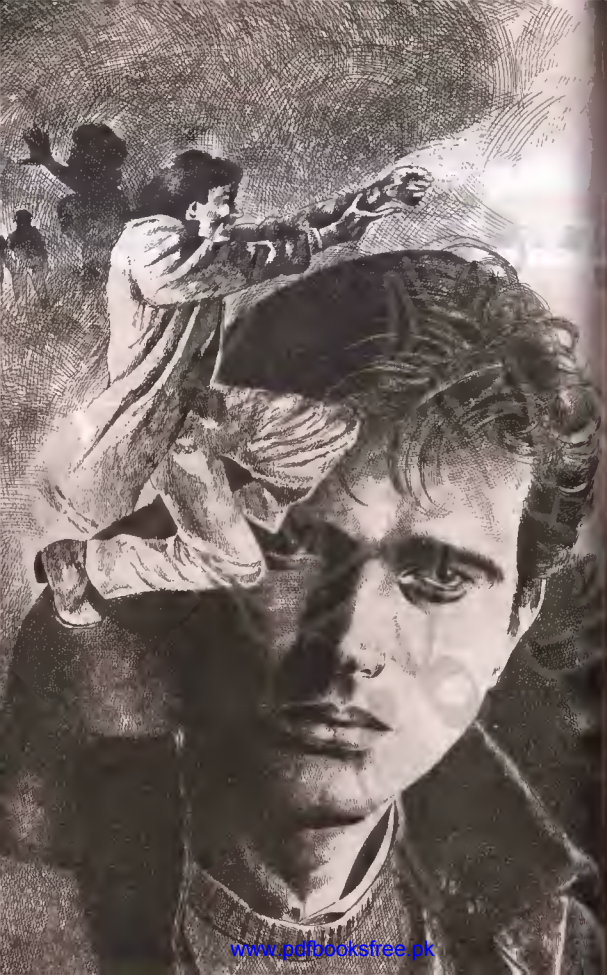
''دیکھو عمر.....! علم نجوم ایک قدیم آرٹ ہے لیکن اکثر لوگ اسے قیاس آرائی پر مبنی علم کہتے ہیں جو کہ بالکل غلط ہے۔ اگر آپ اس قدیم آرٹ' علمِ رُوحانیت اور علم نجوم کو بالکل نظر انداز کر دیں گے تو اس کا مقصد یہ ہوگا کہ آپ ذوقِ فنونِ لطیفہ سے خطی عاری ہیں کیونکہ زائچہ جن بنیادوں پر تیار کیا جاتا ہے' اُن کا حتمائی اور صحیح اعداد و شمار پر مبنی ہونا ضروری ہے' یعنی تاریخ' وقت' جائے پیدائش کے علاوہ شمس اور دیگر تمام ستاروں کی صحیح پوزیشن لے کر ہی زائچے کی تیاری ممکن ہے لیکن اس کی تشریح کرنا ایک ایسا علم ہے جس کی سالہا سال سے تعلیم جاری ہے اور زمانہ قدیم سے یہ علم چلا آ رہا ہے۔ دراصل اس کی صحیح تشریح ہی صحیح معلومات کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ زمانہ قدیم میں ایک عرصہ تک اس علم کے رازوں کی سخت حفاظت کی گئی لیکن جب مصر کی قدیم تہذیب بے بی لونیا اور کلدانیوں کا زوال شروع ہوا تو اُن کے علم کے قواعد یونان اور اہلِ روما تک جا پہنچے یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں نئی تہذیب اور نئی روشنی کے لوگ اس علم پر یقین کرنے لگے۔ آسٹرولوجی علم نجوم کا یونانی لفظ ہے۔ آسٹر کا لفظ ستارے اور لوجی کے معنی ہیں پیغام' الفاظ یعنی ستاروں کے پیغام..... ہمارے ہاں اس کے دو حصے ہیں ایک علم ہیئت یعنی علم کثیف اور علم نجوم یعنی علم لطیف۔ یہ اجرامِ فلکی کی حرکات اور ان کے مقامات کی دریافت کرتا ہے اور دوسرا اس کے رُوحانی پہلو کو بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد عرب نے اس میں بڑی مہارت پیدا کی۔ اہلِ روما عرب سے ہی علم نجوم کے قواعد یورپ لائے تھے۔ بہت سے مشہور نجومیوں نے اپنی پیشن گوئیوں کی بدولت شہرت حاصل کی مثلاً جوہن کیلر جنہوں نے ابتدائی قوانینِ حرکتی مرتب کیے' ٹیپ آف ڈسمون' ٹیچو براہی ایک عظیم منجم گزرا ہے۔ جیروم کارڈن ایک معالج تھا اور سلطنتِ برطانیہ کا پہلا نجومی جوہن فلارسٹڈ۔ علم نجوم سائنس کی طرح ایک

www.pdfbooksfree.pk

علم ہے' یہ انسان کے پوشیدہ رازوں کا انکشاف ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی اخلاقی اور ذہنی صلاحیتوں کو بھی جلا بخشتا ہے اور مستقبل کے لیے ایک مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے۔ راستوں کی دشواریوں سے آگاہ کرتا ہے اور آپ کو حالات کے مطابق فیصلہ کرنے کے قابل بناتا ہے۔ مریخ اور زحل اس کے دو بڑے اہم ستارے ہیں جن کا میں نے رانیہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے جس میں زحل نحس اکبر ہے لیکن مریخ کو بھی اکثر نحس ہی مانا جاتا ہے جبکہ اس کے اثرات اچھے بھی ہو سکتے ہیں لیکن کبھی کبھی اور رانیہ کے پیدائشی ستاروں کے اجتماع میں مریخ اور زحل شامل ہیں' یہ اس وقت ایک ہی برج میں تھے۔ سیل شیا کو اپنا جادوئی عمل پورا کرنے کے لیے رانیہ کی بطور کنجی بہت ضرورت ہے۔ چنانچہ جب جب یہ وقت آئے گا' تب ہی وہ اپنا یہ کام کر سکے گی۔ مریخ ایک آتشی کوکب ہے' زائچے میں موجود بارہ گھروں کا چکر تقریباً ڈیڑھ سال سے دو سال میں پورا کرتا ہے۔ قدیم تاریخ میں مریخ کو آبی بروج کا حاکم سیارہ کہا جاتا تھا' یہ آبی بروج سرطان' دلو' حوت ہیں اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ مریخ کی اچھی طاقتیں' اس کی شیطانی طاقتوں سے بڑھ سکتی ہیں کیونکہ پانی' آگ کو ٹھنڈا کرتا ہے لیکن بعد میں ماہرین نجوم نے اسے ایک آتشی کوکب قرار دیا اور آتشی بروج کا حاکم یعنی حمل' عقرب کا حاکم سیارہ قرار دیا۔ بارہ بروج میں سے کچھ خاص بروج ہیں جہاں مریخ خاص خصوصیات کا حامل ہو جاتا ہے مثلاً مریخ جب برج حمل پر ابتدائی دس درجات پر پہنچتا ہے تو وہ اعتماد' قوت طاقت' جرأت' بے باکی' عالی ظرفی' جنسِ مخالف کے لیے کشش دیتا ہے' جب مریخ' جوزا کے 10 سے 20 درجات پر پہنچتا ہے تو وہ محنت کش اور ایسی زندگی دیتا ہے جس میں جدوجہد کی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ برج اسد 20 ویں درجے پر مریخ کی فطرت بالکل بدل جاتی ہے۔ یہاں وہ امن سے محبت کرنے' دوستی اور محبت کا متلاشی ہوتا ہے۔ مریخ برج عقرب کے 10 درجے پر پہنچتا ہے تو لاقانونیت' جھگڑا فساد کرنے والا' قاتل' ڈاکو' غارت گر بن جاتا ہے۔ مریخ جب برج جدی کے 10 سے 20 درجے پر پہنچتا ہے تو اس میں ایک غم ناک سنجیدگی آ جاتی ہے' یہاں وہ ناممکنات کے پیچھے بھاگنے والا بن جاتا ہے یعنی ایسا انسان ہمیشہ خود کو دھوکہ دے گا اور ہمیشہ مایوس اور ناامید رہے گا۔ مریخ برج حوت کے 20 سے 30 درجے پر پہنچتا ہے تو عاشقوں کا بھیس بدل لیتا ہے' دیومالائی قصوں میں مریخ کو زہرہ کا عاشق بتایا گیا ہے۔ مریخ کی ایسی پوزیشن میں پیدا ہونے والا شخص جنسِ مخالف سے بے اندازہ محبت کرنے والا' جھگڑوں سے بچنے والا اور زندگی میں توازن قائم رکھنے والا ہوگا جبکہ سرطان کے 22 ویں درجے پر پہنچتا ہے تو وہ وبال میں آ جاتا ہے۔ (علم نجوم کی ایک اصطلاح ہے وبال میں آ جانا۔) اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اچھے کاموں کے لیے مریخ کی قوت کمزور ہو گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مریخ کی اس پوزیشن کے تحت پیدا ہونے والے آدمی میں ہمت و جرأت' اولوالعزمی' استحکام کا فقدان ہوگا۔ وہ اپنے ارادوں میں کسی انجانی خوفزدگی کا شکار رہے گا جس کا نتیجہ خراب نکلتا ہے۔ مریخ ماضی پرست نہیں ہوتا' اس کے لیے ماضی مر چکا ہے' زائچہ پیدائش میں مریخ کی اچھی پوزیشن آپ کو ماضی کے مقابلے میں حال اور مستقبل کو اہمیت دینے والا بناتی ہے۔ نئے آغاز نئے کاموں کی خواہش پیدا کرتی ہے اور وہ قوتِ عمل دیتی ہے جو ہمیں مشکلات سے بچاتی ہے۔"

حیرت' اسرار' تجسس اور علم و آگہی
سے آباد اس سلسلے کی دلچسپ کڑی
آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔

www.pdfbooksfree.pk



www.pdfbooksfree.pk

سلسلہ خاص ایک نامور لکھاری کا تہلکہ خیز سلسلہ، جسے پڑھنے والے برسوں یاد رکھیں گے

سلیم فاروقی

آتش جنوں

شاعر کا خیال

سو پیکاں تھے پیوستِ گلو جب چھیڑی یار کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت، اس کے دل میں مقام کا جنوں سلگ رہا تھا۔ قسط نمبر 2

خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں، ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے، نہایت جرأت مند اور اپنی عزت و انا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے..... ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا ہے۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان، راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران ان کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم نجفی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ نجفی، راشد کی لالچی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کرتا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ نجفی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلہ کار ہے۔ ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں اس جرائم پیشہ گروہ کے کچھ افراد حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کا دونوں بھائیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔

(اب آگے ملاحظہ فرمایئے۔)

وہ خاموشی سے میری شکل دیکھتا رہا۔ میں نے اسے کالر پکڑ کر اٹھالیا۔ وہ کھڑا تو ہو گیا لیکن اس کا دایاں ہاتھ بے جان حالت میں پہلو میں جھول رہا تھا۔ اس کا شانہ بری طرح ادھڑ گیا تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ دوسرے غیر ملکی کا دایاں ہاتھ بھی موٹر سائیکل کی چین سے بے کار ہو چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ چکی ہوگی۔

میں نے جس غیر ملکی کو کھڑا کیا تھا، وہ بھی آگے پیچھے ڈول رہا تھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''میرا نام عباس حکتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تعلق کس ملک سے ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں ایرانی ہوں۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''میں باقاعدہ ویزے پر پاکستان آیا ہوں۔ تم لوگوں کو یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔''

''آج کل تو ہر چیز مہنگی ہے عباس بھائی.....!'' ارسلان نے ہنس کر کہا۔ ''حرکت کے مہنگے پڑنے سے کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ فی الحال تو تم لوگوں کا زبردستی گھر میں گھس کر راشد کو اغوا کی کوشش کرنا مہنگا پڑے گا۔''

''میں غنی نہیں ہوں' عباس حکمتی ہوں۔'' اس نے یوں کہا جیسے وہ ایران کا صدر ہو۔

''تم غنی بھی نہیں سکتے۔'' ارسلان نے کہا۔ ''غنی اتنی آسانی سے مار کھانے والا نہیں تھا۔''

''تم زیادہ سے زیادہ مجھے پولیس کے حوالے کر دو گے؟'' عباس نے کہا۔ ''تو پھر کر دو' میں آدھے گھنٹے سے زیادہ پولیس کی تحویل میں نہیں رہ سکوں گا۔''

''تمہیں یہ خوش فہمی کیوں ہے مائی ڈیئر حکمتی کہ ہم تمہیں پولیس کے حوالے کریں گے؟'' ارسلان کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ''ہم تم سب کے ہاتھ پیر توڑ کر کوڑے کے کسی ڈھیر پر پھینک دیں گے پھر تمہاری باقی زندگی بھیک مانگتے گزرے گی اور آج کل تو بھیک بھی مشکل سے ملتی ہے۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتے؟'' غیر ملکی کے چہرے پر پہلی دفعہ پریشانی کے تاثرات ظاہر ہوئے۔

''مجھے کون روکے گا؟'' ارسلان نے کہا۔ ''یہ بائیک کی بھاری چین دیکھ رہے ہو' یہ بہت خونی چین ہے' اس سے پہلے گیارہ آدمی اس کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔'' ارسلان نے عباس کو خوف زدہ کرنے کے لیے کہا ورنہ گیارہ آدمی تو کیا' اس نے تو اس چین سے ابھی تک گیارہ کتے بھی نہیں مارے تھے۔

''میں تمہیں ہلاک نہیں کروں گا' بس تمہارے دونوں گھٹنے اور شانے اس چین سے چور چور کر دوں گا۔ ایک وار تمہاری ریڑھ کی ہڈی پر بھی کروں گا پھر دنیا کا کوئی ڈاکٹر تمہاری معذوری کو ختم نہیں کر سکے گا۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے دوسرے غیر ملکی کی پسلیوں میں ٹھوکر مارتے ہوئے پوچھا۔

''جلال یزدانی ہے۔'' اس نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں تمہارے برادر ملک ترکی کا باشندہ ہوں۔''

''ہمارا برادر ملک تو ایران بھی ہے؟'' میں نے کہا۔ ''تو کیا ہم اپنے برادر ملکوں کے شہر بدر کو یہ چھوٹ دے دیں کہ وہ جس کی چاہیں' گردن اتار دیں اور جسے چاہیں' گن پوائنٹ پر اغوا کر لیں؟''

''تمہیں یہاں کس نے بھیجا تھا؟'' راشد نے پوچھا۔

''اس کا نام سنو گے تو تمہیں چکر آ جائے گا۔'' ایرانی نے کہا۔

''پھر تو اس کا نام میں بھی سنوں گا۔'' ارسلان نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے بہت دن سے چکر نہیں آیا۔''

''ابھی تمہارا سارا مذاق اور غرور ہوا ہو جائے گا۔'' اب ایرانی کے لہجے میں خاصا اطمینان تھا۔ ''ہمیں علی اکبر مشہدی نے بھیجا ہے۔ غنی بھی اس کے لیے کام کرتا ہے۔''

''مجھے چکر آ رہے ہیں بھیا!'' ارسلان نے خوفزدہ ہونے کا مظاہرہ کیا۔ ''مجھے سنبھالو ورنہ میں اس چکر میں اپنی بائیک کی چین کو بھی چکر دے دوں گا۔''

''تم مشہدی کے نام سے مجھے خوف زدہ کر رہے ہو؟'' راشد نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''اب تو وہ خود ہی یہاں آ کر تمہیں چھڑائے گا ورنہ زندگی بھر کی معذوری تمہارا مقدر ہو گی۔''

''وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔'' ایرانی نے کہا۔ ''وہ کوئی چھوٹا موٹا آدمی نہیں ہے بلکہ ایک گینگ کا ڈان ہے' ہمارا انیٹ ورک دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے۔'' اس نے یوں بتایا جیسے اپنی کسی پروڈکٹ کی تعریف کر رہا ہو یا پھر اپنے بزنس کے بارے میں بتا رہا ہو۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' راشد نے کہا۔ ''تم جیسے لوگ جب پٹ جاتے ہیں تو وہ اس کے کسی کام کے نہیں رہتے۔ اس کی بلا سے تم مرو یا جیو.....''

''تو پھر تم ہمیں مارہی دو.....'' ترک نے مایوسی سے کہا۔

''تو.....'' میں نے کہا۔ ''ہم تم جیسے چھوٹے لوگوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتے' ہم تمہیں زندہ رکھیں گے اور دوسروں کے لیے نشان عبرت بنا دیں گے.....''

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کمرے کی کوئی دیوار پشت سے مجھ پر آ گری ہو پھر کسی نے پشت سے میری گردن دبوچ لی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے سپیرے سانپوں کو گردن سے پکڑتے ہیں۔''

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری گردن کسی آہنی شکنجے میں جکڑ گئی ہو۔ اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ مجھ سے سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا پھر ایک غراہٹ سی آواز آئی۔ ''اپنے آدمی سے کہہ کہ یہ چین پھینک کر اپنے دونوں ہاتھ اٹھا لے۔''

آواز سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ اس گنجے کی آواز ہے جسے میں نے بالکل فراموش کر دیا تھا۔

زمر نعیم کے قلم کا شاہکار

ایک خوبصورت ناول

روشنی میرا استعارہ

پراثر اور منفرد کہانی

دلکش اسلوب سے سجا ناول

جو ماہنامہ دوشیزہ میں کئی ماہ سلسلے وار چھپتا رہا

اور بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔

منگوانے کا پتہ

علی میاں پبلیکیشن

اردو بازار۔ لاہور' فون: 7247414



www.pdfbooksfree.pk

"کہتا ہے یا تیری گردن توڑ دوں؟" اس نے اپنے شکنجے نما ہاتھ کا دباؤ مزید بڑھاتے ہوئے کہا۔

مجھے ایسا لگا جیسے میری گردن کی ہڈی اب کسی بھی لمحے ٹوٹ جائے گی اور آنکھیں حلقوں سے ابل کر باہر جا گریں گی۔ میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے لیکن اس مرد نے میری گردن پکڑ کر مجھے اتنا بے بس کر دیا تھا کہ میں اپنے ہاتھ ہلانے کے قابل بھی نہیں تھا۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نے دیکھا' ارسلان کے چہرے پر عجب بے بسی اور کرب ہے۔

اس نے چیخ کر کہا۔ "میرے بھائی کو چھوڑ دو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے موٹر سائیکل کی چین بھی ہاتھ سے چھوڑ دی۔

گنجے نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ سانس کی آمد و رفت دوبارہ معمول پر آئی تو مجھے ایسا لگا جیسے مجھے دوبارہ زندگی ملی ہو۔

"اب یہ بائیک کی چین اور ریوالور مجھے دے دو۔" اس نے ارسلان کو حکم دیا۔

گردن پر دباؤ کم ہوتے ہی میری توانائی تیزی سے بحال ہو رہی تھی۔ میں نے تھوڑا سا تر چھا ہو کر اپنی دائیں کہنی پوری قوت سے گنجے کے پیٹ میں ماردی۔

اس سے مجھے اتنا فائدہ ہوا کہ میری گردن اس کی گرفت سے نکل گئی۔ میں نے گھوم کر گنجے کے سر پہ پوری قوت سے اسٹریٹ پنچ رسید کر دیا۔ وہ لڑکھڑایا اور دو چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے حیرت تو اس کی سخت جانی پر تھی' اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میرے اس بھرپور گھونسے سے اس کی کھوپڑی چٹخ گئی ہوتی۔

دوسرے ہی لمحے اس کے شانے پر موٹر سائیکل کی چین کا بھرپور وار ہوا۔ وہ کرب ناک انداز میں کراہتا ہوا فرش پر گر گیا۔

میں نے گھوم کر دیکھا' ارسلان نے ایک مرتبہ پھر اپنا وہ خوفناک ہتھیار اٹھا لیا تھا۔ اس پہ اس وقت گویا جنون طاری تھا۔ اس نے گنجے کے دوسرے شانے پر بھی بھرپور وار کیا تو وہ تکلیف کی شدت سے بری طرح تڑپنے لگا۔

"اس کے دونوں ہاتھ بے کار ہو گئے ہیں۔" ارسلان نے راشد سے کہا۔ "اب آپ پولیس کو بلائیں اور ان لوگوں کو ان کے حوالے کر دیں۔"

اسی وقت اس کے دونوں چوکیدار کمرے میں داخل ہوئے۔ راشد نے دہاڑ کر پوچھا۔ "تم لوگ کہاں مر گئے تھے؟"

"صاب..... ان لوگوں نے امیر خان کو اندر بھیجنے کے بعد مجھ پہ اچانک حملہ کیا اور میرے سر پہ ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کر دیا۔" چوکیدار رونے لگا۔

"میں آپ لوگوں کو ان کے بارے میں اطلاع دے کر باہر نکلا تو کسی نے پیچھے سے میرے سر پہ وار کیا اور میں بھی بے ہوش ہو گیا۔" دوسرے چوکیدار نے کہا۔ غالباً اس کا نام امیر خان تھا۔

باہر گاڑیاں رکنے کی آواز آئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ پولیس آ چکی ہے۔ راشد نے پولیس کو ٹیلی فون کر دیا تھا۔

کمرے میں پولیس انسپکٹر کے پیچھے پیچھے تین کانسٹیبل بھی تھے۔ ان کے علاوہ اس ایجنسی کے گارڈز بھی تھے جنہیں راشد نے طلب کیا تھا۔

پولیس انسپکٹر شاید راشد کو پہچانتا تھا۔ اس نے راشد سے ہاتھ ملایا اور ایک نظر ان زخمی حملہ آوروں کی طرف دیکھ کر بولا۔ "راشد صاحب' کون ہیں یہ لوگ؟"

"میں نہیں جانتا۔" راشد نے جواب دیا۔ "یہ میرے چوکیدار کو بے ہوش کرنے کے بعد زبردستی اندر داخل ہوئے تھے۔" ارسلان نے اس دوران موٹر سائیکل کی چین اپنی کمر سے باندھ کر اسے شرٹ کے نیچے چھپا لیا تھا۔

"لیکن ان کی یہ حالت کیسے ہوئی؟" انسپکٹر نے حیرت سے پوچھا پھر وہ سیکورٹی ایجنسی کے گارڈ کی طرف مڑا۔ "کیا ان کا یہ حال آپ لوگوں نے کیا ہے؟"

"ہم تو ابھی آپ کے ساتھ ہی پہنچے ہیں۔" ایک گارڈ بولا۔

"ان کا یہ حال میں نے اور ارسلان نے کیا ہے۔" میں نے کہا۔

انسپکٹر نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے وہاں میری موجودگی کا علم نہ ہو۔ "آپ کی تعریف؟" اس نے پوچھا۔

"یہ میرا دوست عمران ہے۔" راشد نے تعارف کرایا۔ "اور یہ اس کا بھائی ارسلان ہے۔ یہ دونوں ملاقات کے لیے میرے پاس آئے تھے کہ یہ حملہ آور گھر میں گھس آئے۔"

"یہ سب کے سب مسلح بھی ہوں گے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں' ان چاروں کے پاس ریوالورز تھے۔" میں نے جواب دیا۔

"اور آپ دونوں نے اس کے باوجود ان کا یہ حشر کر دیا؟" انسپکٹر کے لہجے میں حیرت سے زیادہ طنز تھا۔

"کیا ہم انہیں پھولوں کے ہار پہناتے؟" ارسلان نے کہا۔ "آپ ان لوگوں کے بارے میں معلوم کرنے کی بجائے یہ کس بحث میں الجھ گئے ہیں؟"

"ان چاروں کو گرفتار کرو۔" انسپکٹر نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "عمران صاحب' آپ لوگوں کو بھی پولیس اسٹیشن چلنا پڑے گا۔"

"وہ کس خوشی میں؟" ارسلان نے ترش لہجے میں پوچھا۔

"مجھے آپ لوگوں کے بیانات بھی لینا ہوں گے۔" انسپکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔ "ان لوگوں کا میڈیکل چیک اپ کرانا ہو گا۔ ان کے جسموں پر شدید ضربات کے نشان ہیں۔ کسی بھی شہری کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے۔"

"چاہے کوئی اس شہری کا سر جسم سے علیحدہ کر کے اپنے ہاتھ میں لے لے؟" ارسلان کے لہجے میں طنز تھا۔

"زرداھیان سے بات کرو پتر.....!" انسپکٹر کا لہجہ درشت ہو گیا۔ "میرا نام اکرم خان ہے اور علاقے کے بڑے بڑے بدمعاش میرے نام سے کانپتے ہیں۔"

"تو پھر ان لوگوں کو لے جاؤ اور ان سے پوچھو کہ یہ یہاں کس کے کہنے پر آئے تھے؟"

www.pdfbooksfree.pk

''راشد صاحب.....!'' انسپکٹر نے کہا۔ ''اپنے مہمانوں کو سمجھائیے کہ وہ ہمارے ساتھ تعاون کریں ورنہ.....''

''ورنہ کیا؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''ورنہ ہم تم لوگوں کو زبردستی بھی لے جاسکتے ہیں۔''

''میں نے آپ کو اس لیے بلایا تھا؟'' راشد بپھر گیا۔ ''کہ آپ میرے گھر میں بیٹھ کر میرے ہی مہمانوں کی توہین کریں؟''

''راشد صاحب! تھانے تو آپ کو بھی چلنا پڑے گا۔'' انسپکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔

''آپ چلیں' میں تھانے پہنچتا ہوں۔'' راشد نے کہا۔

''آپ لوگوں کو ابھی میرے ساتھ تھانے چلنا پڑے گا۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''چلیے میں تیار ہوں۔'' میں نے کہا۔

ارسلان نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر پنچ کرنے کے بعد بولا۔ ''یار ناصر میں..... میں اس وقت بھیا کے ایک دوست کے گھر ہوں۔'' پھر اس نے مختصراً ناصر کو اس واردات کے بارے میں بتایا اور بولا۔ ''یہ انسپکٹر صاحب ہمیں بیان لینے کے لیے تھانے لے جارہے ہیں' تو ذرا انکل سے بات کر..... اچھا موجود ہیں..... ہاں' میری بات کرا.....'' وہ چند لمحے تک کسی سیل فون کان سے لگائے کھڑا رہا۔

''او بھائی.....!'' انسپکٹر نے کہا۔ ''ہمارے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں ہوتا کہ.....''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ ارسلان نے کہا۔ ''السلام علیکم انکل..... میں ناصر بول رہا ہوں..... میں اس وقت..... اچھا' ناصر بتا چکا ہے۔'' پھر انسپکٹر کی طرف گھوما اور اس کی جیب پر لگی ہوئی نام کی پٹی پڑھ کر بولا۔ ''یہ کوئی انسپکٹر اکرم خان ہیں' بہت دبنگ پولیس آفیسر ہیں' علاقے کے بدمعاش ان کے نام سے کانپتے ہیں۔ نہیں انکل..... یہ تو مجھے انہوں نے خود ہی بتایا ہے۔'' پھر اس نے سیل فون انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ ''لیجیے انسپکٹر صاحب بات کریں گے۔''

''اوئے' یہ کیا بکواس ہے؟ تو سیدھی طرح تھانے چلتا ہے یا..... میرے پاس تیرے ماموؤں اور چاچوں سے بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔''

''آپ بات تو کریں۔'' ارسلان نے کہا۔ ''یہ آپ کے بھی ماما ہیں۔''

انسپکٹر نے سیل فون اس کے ہاتھ سے لے لیا اور درشت لہجے میں بولا۔ ''ہیلو..... انسپکٹر اکرم خان اسپیکنگ..... جی..... جی سر..... وہ میں..... مجھے معلوم نہیں تھا کہ..... دوسری طرف آپ ہیں..... یس سر..... مجھے معلوم نہیں تھا کہ..... اوکے سر.....''

دوسری طرف سے شاید سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ انسپکٹر سیل فون ہاتھ میں پکڑے گم صم کھڑا تھا پھر وہ آہستہ بولا۔ ''جنابِ عالی..... آپ پہلے بتاتے کہ لائن پر ڈی آئی جی صاحب ہیں۔ سوری سر مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ ڈی آئی جی کرائمز کے بھتیجے ہیں۔ درانی صاحب بہت ہی سخت گیر آفیسر ہیں۔ وہ..... نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے؟''

''یہی سوچ رہے ہوں گے کہ ان کا پولیس آفیسر کتنا فرض شناس ہے۔'' ارسلان نے طنزیہ لہجے میں

کہا۔ ''اس کی فرض شناسی کا عالم یہ ہے کہ اس نے زخمی طرمان کو ابھی تک طبی امداد کے لیے اسپتال بھی نہیں بھجوایا ہے۔''

''ان کا خون بہہ رہا ہے انسپکٹر۔'' میں نے کہا۔ ''اگر ان میں سے کوئی مر گیا تو اس کی ذمے دار پولیس ہوگی۔''

''آپ فکر مت کریں جنابِ عالی.....!'' انسپکٹر نے کہا۔ ''میں اپنے فرائض سے واقف ہوں۔ ان لوگوں کو پہلے اسپتال میں بھجواؤں گا۔''

اس وقت تک اس کے ماتحت ان چاروں افراد کو پولیس موبائل میں منتقل کر چکے تھے۔

انسپکٹر بھی جانے کے لیے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''آپ لوگوں کے پاس جب بھی وقت ہو تھانے آکر اپنے بیانات قلم بند ضرور کرا دیں اور ہاں' وہ آلۂ ضرب لیتے آیئے گا جس سے آپ لوگوں نے انہیں زخمی کیا ہے۔''

''ہم لوگ بغیر ہاتھوں کے تو پولیس اسٹیشن نہیں آئیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے تو انہیں ہاتھوں سے زخمی کیا ہے۔''

انسپکٹر نے حیرت سے مجھے اور ارسلان کو دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں اور باہر نکل گیا۔

''یہ ناصر تمہارا کون سا دوست ہے ارسلان؟'' میں نے پوچھا۔ ''تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ ڈی آئی جی کرائمز کا بیٹا تمہارا دوست ہے؟''

''اب تو آپ کو یقین ہو گیا کہ میرے تمام دوست اعلیٰ گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈی آئی جی کرائمز میں کیا' کلکٹر' کسٹم اور آرمی کے ایک میجر جنرل کے بیٹے سے بھی میری دوستی ہے۔''

''سوری یار.....!'' راشد نے کہا۔ ''میری وجہ سے تم لوگوں کو ایک مرتبہ پھر تکلیف اٹھانا پڑی۔ میں اس کے لیے شرمندہ.....''

''اب زیادہ بکواس مت کر یار.....!'' میں نے کہا پھر چونک کر بولا۔ ''ہاں' یہ تو بتا کہ انکل اور آنٹی کہاں ہیں؟''

''امی اور بابا آج کل لاہور میں ہیں ورنہ تیرا خیال ہے کہ گھر میں اتنی دھما چوکڑی اور ہنگامے کے بعد بھی وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتے؟'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''او کے یار' پھر ملاقات ہوگی اور میری خواہش ہے کہ یہ ملاقات خوش گوار ماحول میں ہو۔ میں اتنی جلدی تم سے رخصت نہ ہوتا لیکن مجھے ابھی پولیس اسٹیشن بھی جانا ہے۔''

''راشد بھائی! آپ اکیلے کیوں جارہے ہیں؟ ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔'' ارسلان نے کہا۔

''ارے نہیں' اس کی ضرورت نہیں ہے۔ شہر میں کچھ لوگوں سے میری بھی شناسائی ہے۔ ہاں اگر ضرورت پڑی تو میں تم لوگوں کو زحمت ضرور دوں گا۔''

راشد نے جس سیکورٹی کمپنی کی خدمات حاصل کی تھیں' وہ لوگ گھوم پھر کے اس کے نکلنے کا جائزہ لے رہے تھے۔

میں راشد سے رخصت ہوا تو اس کے بارے میں بہت فکر مند تھا۔ یہ کون لوگ تھے جو اس کے پیچھے پڑ گئے

www.pdfbooksfree.pk

تھے؟ راشد کی بوٹس کے ذریعے یہ ناجائز اور غیر قانونی کام نہ جانے کب سے ہو رہے تھے؟ غنی تو یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اس کام میں راشد صاحب بھی میرے ساتھ ملوث ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر میں ان کی بوٹ کیسے استعمال کر سکتا ہوں؟

ارسلان بھی اپنی سوچوں میں گم تھا۔

"ارسلان.....!" میں نے ہنس کر کہا۔ "تمہارا مخصوص ہتھیار مجھے چھاگا۔"

"آپ بانیک کی چین کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "وہ واقعی بہت خوف ناک اور مہلک ہتھیار ہے۔" پھر میں چونک کر بولا۔ "میں تو تمہیں عام سا ایک سیدھا سادہ لڑکا سمجھتا تھا' تم نے فائٹنگ کہاں سے سیکھ لی؟"

"جب آپ سیکھ سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں سیکھ سکتا؟" ارسلان ہنس کر بولا۔

میں نے کئی سال پہلے کراٹے کا ایک کلب جوائن کیا تھا' مقصد محض خود کو فٹ رکھنا تھا۔ مجھے لڑائی بھڑائی سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ہاں یہ بتاتا چلوں کہ میں جو کام بھی کرتا ہوں' اسے پوری توجہ سے کرتا ہوں۔ کراٹے کے تمام کورسز پر بھی میں نے بہت محنت کی تھی' جم بھی بڑی باقاعدگی سے جاتا تھا۔

ہم لوگ گھر پہنچے تو اس وقت بھی شاید میرے چہرے پر فکر و تشویش کے آثار رہوں گے۔

ابو نے فکر مند ہو کر پوچھا۔ "کیا بات ہے عمران؟ مجھے تم خاصے پریشان لگ رہے ہو؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے ابو.....!" میں نے کہا۔ "بس سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔"

حقیقت بھی یہ ہی تھی' میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ میں نے کھانا بھی الٹا سیدھا کھایا اور اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔

میں سونے کی کوشش کرتا رہا لیکن کافی دیر تک مجھے نیند نہیں آئی۔ مجھے رہ رہ کر یہ ہی خیال آ رہا تھا کہ غنی کے تمام ناجائز کاموں کے لیے راشد کی بوٹس استعمال ہو رہی تھیں۔ وہ تو بہت آسانی سے سارا الزام راشد پر دھر دے گا۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ مشہدی کون تھا؟ راشد کے رویے سے البتہ یہ ضرور ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ مشہدی کو جانتا ہے۔ ان ہی خیالات میں جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

اچانک کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے ارسلان کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ بہت بوکھلایا ہوا تھا۔

اسے اس حالت میں دیکھ کر میں بھی گھبرا گیا۔ "کیا ہوا ارسلان؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"بھیا.....او.....راشد بھائی....."

"کیا ہوا راشد کو؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"راشد بھائی کا مرڈر ہو گیا۔"

"کیا؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سر پر لٹھ رسید کر دیا ہو۔ "کیا کہہ رہے ہو تم؟" میں نے ہذیانی لہجے میں پوچھا۔ "راشد کل تک تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"نہیں بھیا.....!" ارسلان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے ٹی وی کی خبروں سے

معلوم ہوا ہے۔ میں نے مزید کنفرم کرنے کے لیے راشد بھائی کے گھر [illegible] نے ریسیور اٹھایا۔ اس نے مجھے بتایا کہ راشد بھائی کو آج صبح اُس وقت قتل کیا گیا جب وہ [illegible] تھے۔"

"اسے کس نے قتل کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ان کے کاروباری حریف تو کئی تھے لیکن فی الحال تو وہی لوگ مجھے اس کے ذمے دار لگ رہے ہیں جنہیں کل ہم نے پولیس کے حوالے کیا تھا۔"

میں جلدی سے اٹھا۔ بہت عجلت میں ہاتھ منہ دھویا اور کپڑے بدل کر تیار ہو گیا۔

لاؤنج میں ابو آئی اور شائستہ افسردہ بیٹھے تھے۔

میں باہر کی طرف بڑھا تو امی نے کہا۔ "عمران.....بیٹا.....ناشتا تو کر لو۔"

"مجھے بالکل بھوک نہیں ہے امی.....!" میں نے کہا۔ پھر اُن سے پوچھا۔ "یہ ارسلان کہاں گیا؟"

"وہ بھی ابھی ابھی بانیک پر کہیں نکلا ہے۔" ابو نے جواب دیا۔

میں نے گاڑی نکالی اور سیدھا راشد کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں گیٹ پر پولیس کا ایک سپاہی بیٹھا تھا۔ میں نے اندر جانے کی کوشش کی تو اس نے مجھے بتایا۔ "اندر کوئی نہیں ہے' راشد صاحب کا مرڈر ہو گیا ہے....."

"میں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اندر راشد کے ملازم تو ہوں گے؟"

"ان سب کو پولیس تھانے لے گئی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیوں؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"یہ تو آپ کو پولیس اسٹیشن جا کر ہی معلوم ہو گا۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

میں نے اپنی گاڑی کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف موڑ دیا۔

انسپکٹر اکرم خان حسبِ معمول علاقہ گشت پر تھا۔ پولیس اسٹیشن میں صرف دو سپاہی وردیوں میں اور دو آدمی سادہ لباس میں موجود تھے۔ ان کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھی پولیس کا سٹیشنل ہیں۔ ان چار کے علاوہ ہیڈ محرر بھی موجود تھا۔

مجھے اس نے انتہائی رعونت سے دیکھا اور درشت لہجے میں بولا۔ "فرماؤ' کس سے ملنا ہے؟"

"کیا تربیت کے ساتھ ساتھ تمہیں اس اکھڑ انداز میں بولنے کی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" وہ مجھے گھور کے پہلے سے زیادہ کرخت لہجے میں بولا۔

"مطلب یہ کہ تم لوگ عام انسانوں کی طرح بات نہیں کر سکتے؟"

"اوئے.....زیادہ سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بپھر کر بولا۔ "کام کیا ہے؟"

"مجھے انسپکٹر اکرم خان سے ملنا ہے۔" میں نے بھی درشت لہجے میں کہا۔

"وہ اس وقت علاقہ گشت پر ہیں۔" اس نے کہا۔ "کیا سنتری نے آپ کو بتایا نہیں؟"

"مجھے معلوم ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟" میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔ "اس سے کہو کہ فوراً پولیس اسٹیشن پہنچے۔"

www.pdfbooksfree.pk

میرے پراعتماد لہجے میں ہیڈ محرر کچھ گھبرا سا گیا لیکن آدمی گھاگ تھا اس لیے فوراً ہی اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پالیا اور بولا۔ ”جب آپ کو معلوم ہے تو مجھ سے کیا پوچھ رہے ہیں کہ صاحب کہاں ہے؟“

”اسے ابھی اور اسی وقت بلاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”میں تم سے پوچھ نہیں رہا ہوں بلکہ تم سے یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ جہاں بھی ہے اسے یہاں بلاؤ۔“

”تم ہو کون؟“ وہ اچانک بلند آواز میں بولا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا اکرم خان کی گاڑی پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ ہیڈ محرر کا کمرا سامنے ہی تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ گاڑی سے اترکے سیدھا میرے پاس پہنچا اور بولا۔ ”سر آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟ میرے کمرے میں بیٹھ جایئے۔“

”آپ کمرے کی بات کررہے ہیں آپ کے ہیڈ محرر نے تو مجھے بیٹھنے کو کرسی تک نہیں دی۔“ میں نے کہا۔

”سر جی آپ.....نے تو بتایا ہی نہیں کہ آپ.....“

”بس کرادئے.....“ انسپکٹر نے اس کی بات کاٹ دی اور مجھ سے بولا۔ ”سر آپ میرے ساتھ آئیں۔“

میں اس کے ساتھ اس کے کمرے میں پہنچا تو اس نے پہلے مجھے کرسی پیش کی پھر خود بیٹھا۔ عام پولیس اسٹیشنز کے برعکس اس کا کمرا زیادہ آراستہ تھا۔ ٹیبل بھی جدید طرز کی تھی اور ریوالونگ چیئر بھی خاصی قیمتی تھی۔ کمرے میں لیدر کوٹڈ صوفہ سیٹ بھی موجود تھا۔

میں نے تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”واہ انسپکٹر صاحب آپ کا آفس تو بہت شاندار ہے۔ لگتا ہے سرکار اب پولیس پر بھی خرچ کرنے لگی ہے۔“

”ارے نہیں صاحب.....“ اس نے کہا۔ ”یہ سب کچھ تو میں نے ذاتی طور پر کیا ہے اپنی جیب سے۔“

”آپ کی جیب میں تو ماشاءاللہ بہت برکت ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”آپ کی گاڑی بھی پندرہ سولہ لاکھ روپے سے کم نہیں ہوگی۔“

”سر.....وہ تو میں نے بینک سے لیزپر لی ہے۔“

”ویری گڈ.....“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”اس کی انسٹالمنٹ بھی تقریباً پچیس ہزار تو ہوگی۔“ میں نے اچانک درشت لہجے میں پوچھا۔ ”آپ نے راشد کے ملازمین کو کیوں گرفتار کیا ہے؟“

”میں نے انہیں شاملِ تفتیش کیا ہے۔“ انسپکٹر بھی سنجیدہ ہوگیا۔ ”دیکھیے، تفتیش کا ہمارا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے۔ مرڈر اور ڈکیتیوں کے کیسوں میں عام طور پہ گھریلو ملازمین بھی ملوث ہوتے ہیں۔“

”راشد کا مرڈر میرے خیال میں گھر سے باہر نزدیکی پارک کے نزدیک ہوا ہے جو اس کے گھر سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا؟“

”جی ہاں جناب۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن گھر کا کوئی بھی ملازم قاتل کو ٹپ دے سکتا ہے کہ مقتول اس وقت کہاں ہے؟“

”آپ نے راشد کے والدین کو اطلاع دے دی ہے؟“ میں نے انسپکٹر سے پوچھا۔

”جی ہاں انہیں تو مرڈر کے فوراً بعد اطلاع دے دی تھی۔ وہ دو گھنٹے میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

”ویسے کچھ معلوم ہوا کہ راشد کے قاتل کون لوگ تھے؟“

”اس واقعے کا کوئی عینی شاہد ابھی سامنے نہیں آیا۔ پولیس اسٹیشن پر صرف ایک ٹیلی فون موصول ہوا تھا کہ ڈیفنس فیز II کے پبلک پارک کے پاس ایک مرڈر ہوگیا ہے۔ ہم لوگ موقع پر پہنچے تو راشد کی ڈیڈ باڈی وہاں موجود تھی۔ اس کے سینے پر کلاشنکوف کا برسٹ مارا گیا ہے۔“

”ویسے میں ایک بات ضرور کہوں گا۔ راشد کے تمام ملازمین بہت پرانے تھے۔ میں بھی انہیں راشد کے گھر میں برسوں سے دیکھ رہا ہوں۔ ان پہ ہاتھ ذرا ہلکا رکھیے گا۔“

انسپکٹر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ اسکرین پر ابو کا نام تھا۔ میں نے بٹن بتا کر سیل فون کان سے لگالیا اور بولا۔ ”السلام علیکم! جی ابو؟“

”عمران بیٹا.....!“ ابو کی آواز میں گھبراہٹ اور پریشانی تھی۔ ”فوراً گھر پہنچو۔“

”خیریت تو ہے ابو؟“ میں نے پوچھا۔

”بس تم فوراً گھر پہنچو۔“ ابو نے بولائی ہوئی آواز میں کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

انسپکٹر اکرم خان بہت غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ جب میں اٹھنے لگا تو اس نے پوچھا۔ ”خیریت تو ہے جناب؟“

”ہاں خیریت ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہاں راشد کا پوسٹ مارٹم ہوجائے تو مجھے ضرور اطلاع کیجیے گا۔“ یہ کہہ کر میں باہر نکل آیا۔

پھر میں انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتا ہوا گھر پہنچا۔

ابو اور امی لاؤنج ہی میں موجود تھے۔ ابو کی حالت بہت ابتر تھی۔ میں نے تشویش سے پوچھا۔ ”کیا ہوا ابو! خیریت تو ہے؟“

ابو مجھ سے لپٹ کر بری طرح رونے لگے۔

”ابو.....! پلیز مجھے بتائیں کیا بات ہے؟“ میں امی سے مخاطب ہوا۔ ”امی.....! آپ ہی بتائیں؟“

امی کی حالت تو پہلے ہی تباہ تھی اُن کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے کبھی انہیں اس حلیے میں نہیں دیکھا تھا۔

”آپ لوگ بولتے کیوں نہیں؟“ میں نے ہیجانی انداز میں کہا۔ ”آخر ہوا کیا ہے؟“

اسی وقت عدنان بھاگتا ہوا آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ روتے ہوئے بولا۔ ”بھیا.....! وہ لوگ شائستہ باجی کو لے گئے.....“

”کون شائستہ کو لے گیا؟ تم کیا بکواس کررہے ہو؟“ میں نے چیخ کر کہا۔

”ہاں بیٹا.....!“ ابو نے مستحبل کر کہا۔ ”انہوں نے پہلے چوکیدار کو بے ہوش کر کے باندھا پھر دندناتے ہوئے اندر آئے اور تمہارے اور ارسلان کے بارے میں پوچھا۔ اس دوران خانساماں نے مزاحمت کی کوشش کی تو ان لوگوں نے رائفلوں کے بٹ مار کے اسے بھی بے ہوش کردیا۔

”ان میں سے ایک نے شائستہ باجی کا ہاتھ پکڑا تو مجھ سے برداشت نہ ہوسکا۔“ عدنان نے کہا۔ ”میں نے انہیں چھڑانے کی کوشش کی تو ان میں سے ایک نے میرے سر پر بھی کلاشنکوف کا بٹ مار دیا پھر ابو کو ایک طرف

www.pdfbooksfree.pk

دھکا دیا اور شائستہ باجی کو کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔"

"کون لوگ تھے وہ؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "کس کی اتنی جرات ہوگئی کہ ہمارے گھر کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھ سکے؟"

"وہ جاتے جاتے کہہ گئے ہیں کہ جب تک ارسلان اور تم خود کو ان کے حوالے نہیں کرو گے وہ شائستہ کو نہیں چھوڑیں گے۔"

"کس کے حوالے کریں؟" میں نے پھر چیخ کر کہا۔ "انہوں نے کوئی پتہ تو بتایا ہوگا؟ کوئی نام تو بتایا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کسی مشہدی کا نام لے رہے تھے۔" ابو نے کہا۔ "انہوں نے کہا ہے کہ وہ خود ہم سے رابطہ کریں گے۔ تم دونوں کے علاوہ انہیں ہم سے کچھ نقد رقم بھی چاہیے۔"

"اب کیا ہوگا بیٹا؟" امی نے بری طرح بلکتے ہوئے کہا۔ "وہ لوگ میری پھول سی بچی کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کریں گے؟"

"حوصلہ رکھیں امی!" میں نے کہا۔ "وہ لوگ کچھ بھی نہیں کریں گے۔" میں نے کہا لیکن مجھے اپنے الفاظ خود بھی کھوکھلے لگ رہے تھے۔ "ارسلان کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ان ہی لوگوں کے پیچھے گیا ہے۔" امی نے روتے ہوئے کہا۔

"کیا.....؟" میں بوکھلا کر کھڑا ہوگیا۔ "وہ ان کے پیچھے کیسے چلا گیا؟"

"جب وہ گھر پہنچا تو ان لوگوں کو یہاں سے نکلے ہوئے مشکل سے دو منٹ ہوئے ہوں گے۔ وہ اس وقت اپنی بائیک پر ان کے پیچھے روانہ ہوگیا۔"

"یہ ارسلان بھی انتہائی درجے کا احمق اور جذباتی ہے۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "ان کے پیچھے جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بیٹا.....! تم اس کا مزاج جانتے تو ہو۔" امی نے کہا۔ "یہ بھی جانتے ہو کہ وہ شائستہ پر جان چھڑکتا ہے۔ وہ بھلا ہماری بات مانتا؟"

"آپ نے پولیس کو اطلاع دی؟" میں نے کہا۔

"ہاں میں نے بعد میں پولیس کو ٹیلی فون پر انفارم کر دیا تھا لیکن وہ لوگ ابھی تک نہیں پہنچے ہیں۔"

"اب میں اس ارسلان کو کہاں ڈھونڈوں؟" میں نے بے بسی سے کہا۔ اس کی وجہ سے تو دہری پریشانی کھڑی ہوگئی تھی۔ ارسلان جذبات میں نہ جانے کیا کر بیٹھتا؟

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ایک طرف میرے بہترین دوست کا مرڈر ہوگیا تھا۔ اس کے والدین بھی اب تک کراچی پہنچ چکے ہوں گے۔ دوسری طرف میری پھول سی بہن ان درندوں کے قبضے میں تھی اور اب مصیبت یہ تھی کہ ارسلان بھی ان لوگوں کے تعاقب میں گیا تھا۔ میں کئی دفعہ گاڑی تک گیا پھر واپس آ گیا۔

دروازے پر پولیس کی موبائل وین آ کر رکی اور اس میں سے ایک سب انسپکٹر اور چار سپاہی نکلے جیسے انھوں اکثر لوگ ابھی تک گھر میں موجود ہوں اور وہ ان کی آمد کا انتظار کر رہے ہوں۔ ان لوگوں نے یوں بندوقیں

تھام رکھی تھیں جیسے محاذ جنگ پر فوجی دشمنوں کی گھات میں آگے بڑھتے ہیں۔

"کون ہے؟ کہاں ہے؟" سب انسپکٹر نے یوں پوچھا جیسے مجرم اس کے سامنے یا کہیں موجود ہے۔

"آپ تو لٹھوں میں پہنچ گئے آفیسر؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ کی سروس تو لاجواب ہے۔"

"آپ مجھ پر طنز فرما رہے ہیں؟" سب انسپکٹر نے درشت لہجے میں کہا۔

"میں تو آپ کی تعریف کر رہا ہوں۔ واردات کو صرف ایک گھنٹہ چالیس منٹ گزرے ہیں اور آپ اتنے مختصر وقت میں چلے آئے؟"

"ہم بھی کوئی فارغ نہیں بیٹھے ہیں۔" سب انسپکٹر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ہمارے پاس صرف دو موبائلیں ہیں اور تھانے کی نفری بھی کم ہے۔" پھر وہ بولا۔ "ہاں اب بتایئے ڈاکو کیا کچھ لے گئے ہیں؟"

"ڈاکو میرے گھر کی عزت لے گئے ہیں میری بہن کو لے گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا عمر تھی مغویہ کی؟"

"انیس سال!" ابو نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ مغویہ جوان العمر اور بالغ ہے۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

"تو پھر؟" میں نے کہا۔ "وہ کہیں گم نہیں ہوئی ہے کہ راستہ ڈھونڈ کر گھر آ جائے گی۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کسی لڑکے کا چکر بھی تو ہو سکتا ہے؟" سب انسپکٹر کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ اس نے کسی کے ساتھ مل کر اپنے اغوا کا ڈراما رچایا ہو۔" سب انسپکٹر نے کہا۔ "آج کل کی لڑکیاں....."

"بکواس بند کرو....." میں نے بھڑک کر کہا۔ "تم تفتیش کر رہے ہو یا ہماری عزت پر کیچڑ اچھال رہے ہو؟"

"اوہ آرام سے اوئے....." سب انسپکٹر اپنے اصلی لہجے پر آ گیا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ لڑکی خود ہی گھر سے بھاگی ہو اور تم لوگ اپنی عزت بچانے کے لیے اسے اغوا کرا کر پیش کر رہے ہو؟"

میں نے آگے بڑھ کر اچانک انسپکٹر کا گریبان پکڑ لیا اور اس کے چہرے پر دوسرے ہاتھ سے تھپڑ مارنے ہی والا تھا کہ ابو نے جھپٹ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے۔ "ہوش سے کام لو عمران.....! یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

میں نے جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

سب انسپکٹر غضب ناک لہجے میں بولا۔ "گرفتار کرلو اسے.....اب میں اس سے تھانے لے جا کر پوچھ گچھ کروں گا۔ بہت گرمی چڑھ گئی ہے اسے۔ بڑی جان بنائی ہوئی ہے۔ میں دیکھتا ہوں تو کتنا عزت دار ہے؟"

"اپنے بیٹے کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں آفیسر.....!" ابو نے کہا۔ "غصے میں غلطی ہو ہی جاتی ہے۔"

"آپ بیچ میں مت بولو بزرگ.....!" سب انسپکٹر نے انہیں جھڑک دیا۔ "انسان غلطی کرتا ہے تو اسے سزا ہی تو ملتی ہے۔" سب انسپکٹر کے چہرے پر رعونت تھی۔ "حوالات کی ہوا کھائے گا تو غلطیاں کرنا بھول جائے گا۔"

"ابو.....! آپ کے پاس ارسلان کے دوست ناصر کا سیل نمبر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بیٹا.....! اس کے دوستوں سے میرا کیا تعلق؟" ابو نے کہا۔ "ہاں صبح وہ جانے سے پہلے اپنے کسی دوست

www.pdfbooksfree.pk

سے بات تو کر رہا تھا' شاید اس نے ناصر ہی کا نام لیا تھا۔ ناصر کی کال لینڈ لائن پر آئی تھی۔" ابو نے کہا۔ "وہاں اس کا نمبر شاید اب بھی محفوظ ہو؟"

"او بھائی.....!" سب انسپکٹر نے کہا۔ "جلدی کرو ہمارے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔"

عدنان ٹیلی فون سیٹ میں نمبر دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "بھیا..... لینڈ لائن پر صرف تین کالز ریسیو ہوئی ہیں۔"

"تم ان تینوں پر ٹرائی کرو اور ناصر کو تفصیل سے سب کچھ بتا دو۔ اس کا سیل نمبر بھی لینے کی کوشش کرنا۔"

"اوئے..... تو خود چلے گا یا تجھے ہتھکڑی پہنا کر لے جاؤں؟ کسی بادردی پولیس افسر پہ ہاتھ اٹھانے کی سزا معلوم ہے تجھے؟"

"چلو۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "میں بھی تو دیکھوں کہ ہماری پولیس کتنی فرض شناس ہے؟" پھر میں عدنان سے بولا۔ "تم ناصر کو ٹیلی فون کر دو اور سب کچھ بتا دو۔" یہ کہہ کر میں پولیس کی موبائل وین کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے سپاہیوں نے یوں گھیر لیا جیسے انہوں نے کوئی انتہائی خوف ناک قسم کا اشتہاری ملزم پکڑ لیا ہو۔ مجھے یہ بھی فکر تھی کہ اب تک راشد کے والدین لاہور سے کراچی پہنچ چکے ہوں گے۔ ایسے موقع پر میرا اُن کے پاس ہونا بہت ضروری تھا لیکن یہ "فرض شناس" افسر مجھے پولیس اسٹیشن لے جا رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ میں سیل فون پر راشد کے ڈیڈی سے بات کر لوں اور انہیں تمام صورتِ حال سے آگاہ کر دوں ورنہ وہ یہ ہی سمجھتے کہ میں جان بوجھ کر راشد کی مدفین میں نہیں آیا۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالنے کی کوشش کی لیکن میرے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے سپاہیوں نے مجھے دبوچ لیا اور ان میں سے ایک انتہائی اکھڑ لہجے میں بولا۔ "اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھ اور خاموشی سے بیٹھا رہ۔" ان میں سے ایک نے میری شرٹ کا کالر پکڑا اور دوسرے نے میری جیبوں کی تلاشی لے کر ان میں سے میرا پرس' وزیٹنگ کارڈز' لیڈر' سگریٹ کا پیکٹ اور میرا قیمتی سیل فون نکال کر اپنے قبضے میں کر لیا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں بھنا کر بولا۔

جواب میں میری دائیں جانب بیٹھے ہوئے پولیس والے نے میری گردن پر ایک ہاتھ جما دیا اور بولا۔ "آرام سے بیٹھ اور بھونکنا بند کر....."

زندگی میں کبھی میری اتنی ذلت نہیں ہوئی تھی' میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں ان سب پولیس والوں کی گردنیں توڑ دوں لیکن میں نے بہت مشکل سے اپنی اس خواہش پر قابو پایا۔

پولیس اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے انہوں نے اتنی دفعہ میرے منہ اور گردن پر تھپڑ مارے کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

میں نے بپھر کر کہا۔ "اب اگر کسی نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو میں اس کا ہاتھ توڑ دوں گا۔ قانون کے احترام کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

"اچھا....." ایک پولیس والے نے طنزیہ لہجے میں کہا اور میرے منہ پر تھپڑ مارنا چاہا لیکن میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے پر اتنا زوردار تھپڑ مارا کہ اس کے ہونٹ پھٹ گئے اور ان سے خون بہنے لگا۔

اسی وقت موبائل پولیس اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہوئی۔ مجھ سے مار کھانے والے نے مجھے دین کے دروازے کی طرف دھکا دیا اور پیچھے سے ایک زوردار لات میری کمر پر جڑ دی۔

میں اس حملے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اس لیے اوندھے منہ فرش پہ جا گرا۔ فرش پہ گرنے سے میری ناک اور ایک گال زخمی ہو گیا۔

"یہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا جی....." مار کھانے والے سپاہی نے سب انسپکٹر سے کہا۔ "اس نے مجھ پہ حملہ کر کے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔"

"اسے ہتھکڑی لگاؤ اور لاک اپ میں بند کر دو۔ میں ابھی اس کی ساری گرمی نکالتا ہوں۔ اس کی تو....." سب انسپکٹر نے وزنی سی ایک گالی لڑھکاتے ہوئے کہا۔

ان لوگوں نے مجھے ہتھکڑی تو نہیں لگائی لیکن لاتوں اور گھونسوں سے مجھے مارتے ہوئے لاک اپ تک لائے اور اس کا دروازہ کھول کر مجھے اندر دھکیل دیا۔

"ابھی تو کچھ دیر آرام کر لے۔" سب انسپکٹر نے کہا۔ "تجھ سے تو میں رات کو نمٹوں گا۔"

حوالات میں اس وقت دو افراد موجود تھے' وہ اچھے لباس اور چہروں سے عادی مجرم لگ رہے تھے۔ ان کا اطمینان دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ حوالات ان کے لیے کوئی نئی جگہ نہیں ہے۔

سنتری کے جانے کے بعد وہ دونوں کھسک کر میرے پاس آ گئے۔ ان میں سے ایک بولا۔ "تمہیں کس جرم میں لائے ہیں یہ لوگ؟"

"افسوس تو مجھے یہ ہی ہے کہ میں نے سوائے ایک جرم کے' کوئی جرم نہیں کیا ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں نے پولیس کے سب انسپکٹر کا گریبان پکڑ لیا تھا اور ابھی پولیس اسٹیشن آتے ہوئے ایک سپاہی کو پیٹا ہے۔"

"یار' کام تو تم نے بہت نیک کیا ہے لیکن اس کے بدلے میں یہ لوگ تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کریں گے۔"

"دیکھا جائے گا....."

"ویسے تم اپنے کپڑوں اور چہرے سے تو شریف آدمی لگ رہے ہو۔" دوسرا حوالاتی بولا۔ "پولیس سے مار پیٹ کی نوبت کیوں آ گئی؟"

میں نے مختصراً اسے بتایا کہ ایسا کیوں ہوا ہے؟ میں جان بوجھ کر ایسی عام باتوں میں لگا رہا تھا تاکہ میرے ذہن میں شائستہ کے بارے میں راشد کی مدفین کے بارے میں کوئی خیال نہ آئے۔

اچانک سلاخوں کے پاس مجھے عدنان کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور وہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔

"کیا ہوا عدنان.....؟" میں نے پوچھا۔

"ناصر بھائی تو کسی بزنس ٹرپ پر سنگاپور گئے ہوئے ہیں اور ان کے والد اسلام آباد میں ہیں۔ میں نے ٹیلی فون ریسیو کرنے والے ملازم سے بہت کہا کہ مجھے ناصر بھائی یا اُن کے والد کا سیل نمبر دو لیکن وہ کسی صورت نہیں مانا۔" پھر وہ پرتشویش لہجے میں بولا۔ "اب کیا ہو گا بھیا؟" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کچھ نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "اور تم بھی ہمت ہارو گے تو ابو اور امی کو کون سنبھالے گا؟" پھر میں چونک کر

www.pdfbooksfree.pk

بولا۔ ”ارسلان کہاں ہے؟“

”ارسلان بھائی تو ابھی تک واپس ہی نہیں آئے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس کا سیل نمبر ملاؤ۔“ میں نے کہا۔

”ان کا سیل فون آف ہے۔“ عدنان نے کہا۔ ”میں گزشتہ آدھے گھنٹے سے کوشش کر رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”چل بھئی اب جا.....“ سنتری نے سلاخوں کے پاس آ کر عدنان سے کہا۔ ”صاحب آ گیا تو میری مصیبت آ جائے گی۔“

”بس ایک منٹ اور۔“ عدنان نے کہا پھر مجھ سے بولا۔ ”راشد بھائی کے ڈیڈی اور امی لاہور سے آ گئے ہیں۔ میں نے انہیں بھی ٹیلی فون کر دیا ہے۔ ابو اور امی راشد بھائی کی تدفین میں جا رہے ہیں۔“ پھر وہ مجھ سے بولا۔ ”بھیا..... آپ پریشان مت ہوں۔ ابو نے اپنے جاننے والے کئی افسروں کو ٹیلی فون کیے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہ لوگ آپ کو چھوڑ دیں گے۔“

سنتری نے اسے ایک مرتبہ پھر ڈانٹا تو وہ وہاں سے چلا گیا۔

”او بھائی..... رات سے پہلے پہلے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔“ حوالاتیوں میں سے ایک بولا۔ ”رات کو سب انسپکٹر تھرڈ ڈگری استعمال کرتا ہے اور اس کا ایک خاص آدمی محمد خان بھی اس فن میں ماہر ہے، وہ تو پورا پاپا یا سانڈ ہے۔“

’دیکھا جائے گا۔‘ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

مجھے ایک دفعہ پھر تفکرات اور اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔ نہ جانے شائستہ کہاں ہوگی اور کس حال میں ہوگی؟ ان ظالموں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا؟ اس کے ساتھ ہی مجھے ارسلان کی فکر تھی، نہ جانے وہ کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا؟ کہیں وہ ان جرائم پیشہ افراد سے اکیلا ہی نہ بھڑ گیا ہو؟ وہ خاصا جذباتی تھا اور بات بات پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا، اگر یہ تو پھر اس کی لاڈلی بہن کا معاملہ تھا۔

میں اب دوسرے حوالاتیوں سے بات بھی نہیں کر رہا تھا۔ ان دونوں نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن جب میری طرف سے انہیں کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا تو وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ کہتے ہیں کہ جب مصیبت آتی ہے تو اپنے ساتھ اور بہت سی مصیبتیں لے کر آتی ہے۔ راشد کے قتل پر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا، میں کیسا بے مروت دوست تھا کہ اپنے دوست کی آخری رسومات میں شرکت بھی نہ کر سکا تھا۔ مجھے یہاں آئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے اب تک تو راشد کی تدفین بھی ہو گئی ہوگی۔ ان ہی خیالات میں گم نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ آتی ہوئی سردیوں کا موسم تھا اور لاک اپ کے سلاخوں والے دروازے سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔

میں نیند کے جھونکے میں ایک طرف لڑھکا تو میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں بہت ہی مدقوق سی روشنی والا ایک بلب روشن تھا جو اس سیلن زدہ کمرے کی تاریکی دور کرنے میں ناکام تھا۔ پولیس والوں نے تو میرے ہاتھ سے گھڑی بھی اتار لی تھی جس سے مجھے وقت کا اندازہ ہو سکتا لیکن پولیس اسٹیشن کے سکوت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ رات خاصی بیت چکی ہے۔

اچانک تاریک کاریڈور میں بھاری جوتوں کی دھمک سنائی دی پھر کوئی بہت بری طرح کھانسا۔ قدموں کی آہٹ سلاخوں والے دروازے کے پاس آ کر رک گئی۔ سلاخوں کے پیچھے مجھے ایک سنتری کا منحوس چہرہ دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے مکروہ چہرے والا ایک اور سنتری تھا۔

ان لوگوں نے پرشور انداز میں لاک اپ کا دروازہ کھولا تو دوسرے دونوں حوالاتی جو گہری نیند میں تھے، ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

دونوں سنتریوں میں سے ایک سنتری اندر آ گیا اور اس نے بہت پھرتی سے میرے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی اور ملائمی آواز میں بولا۔ ”چل بھئی، تجھے ذرا باہر کی سیر کرا لائیں، جب سے آیا ہے اسی طرح بیٹھا جھول رہا ہے۔“

اس نے ہتھکڑی میں بندھی ہوئی زنجیر کا سرا بہت بے دردی سے کھینچا۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ زمین پر ایک ہی زاویے سے بیٹھے رہنے کی وجہ سے میرے پیر اکڑ کر رہ گئے تھے۔ اس نے مجھے گھسیٹا تو میں سنبھلتے سنبھلتے بھی گر پڑا۔

میں نے گزشتہ رات کو الٹا سیدھا کھانا کھایا تھا۔ اس کے بعد سے ایک کھیل بھی اڑ کر میرے منہ میں نہیں گئی تھی۔ وہاں رکھا ہوا پانی کا مٹکا بھی اتنا غلیظ تھا کہ اس سے پانی پیتے ہوئے مجھے کراہیت محسوس ہوئی تھی اس لیے میں نے پانی بھی نہیں پیا تھا۔ میں بھوک سے تو نڈھال تھا، پیاس کی وجہ سے میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔

وہ لوگ مجھے گھسیٹتے ہوئے ایس ایچ او کے کمرے میں لے گئے۔ اس کا کمرا حوالات سے خاصے فاصلے پر تھا۔ وہاں تو اس وقت گویا دن تھا، دال کلاک پر میری نظر پڑی تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس میں ایک بج رہا تھا۔

ایس ایچ او کے کمرے میں بھانت بھانت کے کئی آدمی بیٹھے تھے۔ ان میں کچھ ملزمان کے لواحقین تھے، دو تین وہی تھے جنہیں میں نے ان کے کالے کوٹوں کی وجہ سے پہچانا۔ ان کے حلیے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھی کسی جرم کے الزام میں وہاں لائے گئے ہوں۔

ایس ایچ او بھدے جسم کا خبیث صورت آدمی تھا۔ وہ اس وقت وردی کی بجائے شلوار قمیص میں تھا۔

سنتری نے مجھے اس کے سامنے کھڑا کر دیا۔

”یہ کون ہے بھئی؟“

”یہ عمران ہے سر.....“

”اچھا، اچھا، وہ سور ہا ہے جس نے پولیس کے ایک افسر کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور پھر فرار ہونے کی کوشش میں پولیس کے ایک اہلکار کو زخمی کر دیا؟“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں بھئی بڑی چربی چڑھی ہوئی ہے تجھ پر تو کیا پولیس کو بھی اپنا کوئی گھریلو ملازم سمجھتا ہے؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تو شکل سے تو مجھے شریف آدمی لگتا ہے؟“ اس نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔

”شکل پہ مت جائیں جناب عالی.....“ وہاں بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے خوشامدی انداز میں کہا۔ ”شکل سے بھولے بھالے نظر آنے والے ہی تو وڈے مجرم ہوتے ہیں۔“

www.pdfbooksfree.pk

میں نے گھوم کر بولنے والے کی طرف دیکھا' وہ مجھے حلیے ہی سے پولیس کا مخبر لگ رہا تھا۔

''مجھے ایک گلاس پانی مل جائے گا؟'' میں نے نحیف آواز میں کہا۔

''پانی کیوں پتر؟'' ایس ایچ او نے کہا۔ ''ہم ابھی تیرے لیے ٹھنڈی بوتل منگا دیتے ہیں۔'' پھر وہ روایتی پولیس والوں کے انداز میں بولا۔ ''تجھے اپنے جرم کا اندازہ بھی ہے؟ ہم اپنی جان جوکھم میں ڈال کر دن رات تم لوگوں کی حفاظت کرتے ہیں اور تم ہم ہی لوگوں پر ہاتھ اٹھاتے ہو؟''

''میری بہن اغوا ہوئی ہے سر.....!'' میں نے کہا۔ ''وہ ایس آئی تفتیش کرنے کی بجائے ہم ہی سے ایسا سلوک کر رہا تھا جیسے اس واردات کے ذمے دار ہم ہی ہوں۔''

''پولیس کی تفتیش کا ایک انداز ہوتا ہے' اب ہم تمہارے کہنے پر تو نہیں چل سکتے نا؟'' ایس ایچ او نے اپنا مکروہ چہرہ لہکاتے ہوئے کہا۔

''ایس آئی نے میری ہی بہن کو بدچلن ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو اس بات پر بضد تھا کہ اغوا کی واردات سرے سے ہوئی ہی نہیں ہے بلکہ میری بہن گھر سے بھاگ گئی ہے اور ہم اغوا کا ڈرامہ رچا رہے ہیں.....''

''تو اور آج کل کیا ہوتا ہے' یہ کیبل اور کمپیوٹر دیکھ دیکھ کر لڑکیاں اور سیکھتی کیا ہیں؟'' پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''میں تجھ سے بحث نہیں کروں گا۔'' وہ گھوم کر اس مخبر نما شخص سے مخاطب ہوا۔ ''کرم علی' اسے باہر لے جاؤ اور اپنی زبان میں سمجھاؤ' شاید بات اس کی سمجھ میں آ جائے۔''

کرم علی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور سنتری سے بولا۔ ''اسے ذرا دوسرے کمرے میں لے چلو.....''

سنتری مجھے جانوروں کی طرح کھینچتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔

''مجھے ایک گلاس پانی پلا دو۔'' میں نے کہا۔

''اسے پانی پلاؤ۔'' کرم علی نے کہا۔

کانسٹیبل نے زنجیر کا سرا اس کمرے کی گرل سے باندھا اور باہر نکل گیا۔

''تمہارا کس چیز کا بزنس ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہم لوگ گارمنٹس کی ایکسپورٹ کرتے ہیں اور باہر سے الیکٹرانک کا سامان اور مختلف مشینوں کے فاضل پرزے منگاتے ہیں۔''

''اور تمہارا دفتر کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہمارا ہیڈ آفس ایم آئی آئی چندریگر روڈ پر ہے۔ اس کے علاوہ ملتان' لاہور اور اسلام آباد میں بھی ہمارے دفتر ہیں۔''

اس دوران میں سنتری جگ اور گلاس لے آیا۔ اس نے پانی گلاس بھر کے مجھے دیا جسے میں نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ پانی بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ پانی پیتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم میں نئی توانائی آ گئی ہو۔

میں نے پانی کا گلاس سنتری کی طرف بڑھا دیا۔ وہ جگ اور گلاس لے کر باہر نکل گیا۔

''بھائی عمران.....! بات یہ ہے کہ تم نے ایک پولیس افسر پر ہاتھ اٹھایا ہے' اس کا کچھ نہ کچھ جرمانہ تو ہونا

چاہیے نا۔''

''قصور میرا نہیں تھا لیکن میں جانتا ہوں کہ پولیس افسر پر ہاتھ اٹھانا جرم ہے۔'' میں نے کہا۔

''اللہ تمہارا بھلا کرے۔'' اس نے کہا۔ ''بس اَن پڑھ اور پڑھے لکھے آدمی میں یہ ہی فرق ہوتا ہے۔ وہ سب انسپکٹر تو تمہارے خلاف کیس بنانے پر بضد تھا لیکن ایس ایچ او صاحب بہت اچھے انسان ہیں' انہوں نے سب انسپکٹر اور اس سپاہی کو بہت مشکل سے راضی کیا ہے کہ وہ تمہارے خلاف کیس نہ بنائیں۔ اب تمہیں بھی ہمارے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔''

''کیسا تعاون؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہیں جرمانے کے طور پر سب انسپکٹر اور اس پولیس کانسٹیبل کو پچاس لاکھ روپے دینا ہوں گے۔''

''پچاس لاکھ.....؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''پچاس لاکھ تو بہت ہیں؟''

''اس مصیبت کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے جو رقم ادا نہ کر سکنے کی صورت میں تم پر آ سکتی ہے۔''

''دیکھو کرم علی.....'' میں نے کہا۔ ''میں نے سرکاری اہلکار پر ہاتھ اٹھا کر جرم کیا ہے' اس جرم کے تحت سب انسپکٹر صاحب چاہیں تو مجھ پہ کیس بنا دیں' میں پچاس لاکھ روپے تو نہیں دوں گا.....''

''تم کوئی غریب اور مسکین تو ہو نہیں.....'' کرم علی نے کہا۔ ''اس سے چوگنی رقم تو اس وقت تمہارے اکاؤنٹ میں ہوگی۔''

''میرے اکاؤنٹ میں رقم موجود ہے لیکن میں ایک غیر قانونی کام سے بچنے کے لیے دوسرا غیر قانونی کام نہیں کروں گا۔ رشوت لینا اور دینا بھی تو جرم ہے؟''

''او بھائی.....تم نے یہ کیوں سوچ لیا کہ یہ رشوت ہے؟ یہ تو تمہاری اس حرکت کا جرمانہ ہے۔''

''ٹھیک ہے' میں پچاس لاکھ روپے دے دوں گا۔'' میں نے کہا۔

کرم علی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''یہی امید تھی کہ تم خاصے عقل مند اور سمجھدار آدمی ہو۔'' پھر اس نے آواز لگائی۔ ''احمد دین۔'' فوراً ہی ایک سنتری کمرے میں آ گیا۔

''جا' نکڑ والے ہوٹل سے نہاری اور نان لے آ' کچھ کباب وغیرہ بھی لے لینا۔''

احمد دین فوراً ہی کمرے سے نکل گیا۔

کرم علی نے کہا۔ ''تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ تمہارے ماں باپ تمہاری وجہ سے کتنے پریشان ہیں؟''

''مجھے خوب اندازہ ہے کرم علی۔'' میں نے کہا۔ ''ان بے چاروں پر تو دہرا صدمہ پڑ گیا' میری بہن بھی اغوا ہوئی اور مجھے خود بھی حوالات کا مزہ دیکھنا پڑا۔''

''اس لیے تو کہا گیا ہے کہ غصہ حرام ہے۔'' کرم علی نے کہا۔ ''اب جرمانہ تو آپ کو دینا پڑے گا۔''

اسی وقت احمد دین نہاری اور روٹی لے کے آ گیا۔ روٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو سے میری بھوک چمک اٹھی۔

''آیئے' پہلے کھانا کھائیں۔'' کرم علی نے یوں کہا جیسے وہ میرا میزبان ہو۔

میں بھی کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ میں جانتا تھا کہ میرا جواب سن کر وہ میرے آگے سے کھانا کھینچ لے گا۔ اس نے

www.pdfbooksfree.pk

تو برائے نام میرا ساتھ دیا۔ میں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ اس دوران میں اس نے احمد دین سے چائے بھی منگالی تھی۔ وہ اپنے خیال میں مجھ پہ انویسٹ کر رہا تھا۔ آخر اس پچاس لاکھ میں اس کا حصہ بھی تو ہوگا۔

کھانے اور چائے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنی جیب سے سگریٹ نکالی اور میری طرف بڑھا دی۔ میں عادی سگریٹ نوش تو نہیں تھا لیکن کھانے اور چائے کے بعد اکثر سگریٹ نوشی کر لیا کرتا تھا۔ اس وقت تو سگریٹ بھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد میرے جسم میں گویا ایسی توانائی آ گئی جیسے میں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوا ہوں۔

میں نے سگریٹ ختم کی تو اس نے مسکرا کر کہا۔ "اب آپ گھر ٹیلی فون کریں اور کیش منگا لیں۔"

میں نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

"اوہ، میں سمجھا۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "آج کل گھر میں اتنا کیش کون رکھتا ہے؟ پھر ایسا کریں، آپ چیک منگا لیں اور میں آپ کے سونے کا بندوبست کر دوں گا۔ آرام سے سوئیں، صبح چیک کیش ہوتے ہی آپ گھر جا سکتے ہیں۔"

"یہ جرمانہ کیا سرکاری خزانے میں جائے گا؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"ظاہر ہے، جرمانہ تو سرکاری خزانے میں ہی جاتا ہے۔"

"آپ لوگ..... میرا مطلب ہے کہ ایس ایچ او صاحب مجھے اس کی رسید دیں گے؟"

"کیوں نہیں دیں گے جناب؟" اس نے مسکرا کر کہا۔ "صاحب آپ کو پکی رسید دیں گے۔"

"کرم علی صاحب، آپ مجھے کوئی چھاپڑی والا سمجھ رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "میں جانتا ہوں کہ اس قسم کے تمام جرمانے کورٹ کے ذریعے سرکاری خزانے میں جاتے ہیں۔ ایس ایچ او صاحب جرمانہ لگانے والے کون ہوتے ہیں؟ ان کا کام تو صرف کورٹ میں کیس پیش کرنے کا ہے۔ باقی کام تو کورٹ کا ہے؟"

"عمران صاحب، ہم آپ کو کورٹ کچہری کے چکر سے تو بچانا چاہتے ہیں۔ وہاں مٹھوں تو تاریخ پڑے گی، کورٹ کا خرچہ ہوگا، وکیل کے اخراجات ہوں گے۔ آپ معروف آدمی ہیں، آپ کا قیمتی وقت بھی ضائع ہوگا اس لیے....."

"سوری۔" میں نے کہا۔ "میں اس قسم کے کسی بھی جرمانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

کرم علی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "گویا آپ انکار کر رہے ہیں؟"

"میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ پولیس قانونی کارروائی کرے اور مجھے کورٹ میں پیش کر دے۔"

"آپ جرمانہ نہیں دیں گے؟" کرم علی کا لہجہ بدل گیا۔

"میں رشوت نہیں دوں گا....." میں نے کہا۔ "رشوت کو جرمانے کا نام مت دیں....."

"احمد دین....." کرم علی نے جھنجلا کر بانک لگائی۔ "اسے صاحب کے پاس لے چلو۔"

احمد دین نے میری ہتھکڑی کی زنجیر کھڑکی کی گرل سے کھولی اور اس مرتبہ بہت انسانیت سے مجھے ایس ایچ او کے کمرے میں لے گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ کرم علی کی مجھ سے ڈیل ہو چکی ہے۔ میں کھانا کھا چکا تھا، چائے اور سگریٹ بھی پی چکا تھا اس لیے اب اس کی نظروں میں معزز تھا۔

میں دوبارہ ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچا تو وہ اسی سب انسپکٹر کے ساتھ بیٹھا تھا جو مجھے گرفتار کر کے لایا تھا۔

"جی عمران صاحب!" ایس ایچ او نے کہا۔ "بات سمجھ میں آ گئی آپ کے؟"

"نہیں سر جی۔" کرم علی نے کہا۔ "اس نے کوئی بھی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے۔"

"اچھا ایسا کریں....." ایس ایچ او نے کہا۔ "جرمانے کی رقم کم کر کے تیس کر دیں۔"

"تیس لاکھ.....؟" میں نے پوچھا تو ایس ایچ او نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تیس لاکھ تو دور کی بات ہے، میں تو اس سلسلے میں تیس روپے بھی نہیں دوں گا۔"

"تو خود کو سمجھتا کیا ہے اوئے؟" ایس ایچ او گرج کر بولا۔ "بند یہ علی.....!" اس نے سب انسپکٹر سے کہا۔ "ذرا اسے مہمان داری کی ایک جھلک دکھا دو۔ ایک ہی رات میں اس کی سب ہیکڑی نکل جائے گی۔"

ایس آئی نے مجھے یوں دیکھا جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ میں کتنا تشدد برداشت کر سکتا ہوں پھر اس نے کرم علی سے کہا۔ "ذرا احمد خان کو بھیجو۔"

احمد خان شاید وہی آدمی تھا جس کا ذکر حوالاتیوں نے بھی کیا تھا۔ کرم علی خاموشی سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک لمبا تڑنگا، مضبوط ہاتھ پیروں اور کسرتی بدن کا ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دھوتی باندھ رکھی تھی اور جسم کے اوپری حصے پر قمیص تھی۔ شاید وہ قمیص بھی اس نے صاحب کے کمرے میں آنے کے لیے پہنی تھی۔ اسے غالباً نیند سے جگایا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ان میں نیند کا خمار تھا۔ اس نے مؤدب انداز میں کہا۔ "حکم جناب عالی.....؟"

"احمد خان....." ایس آئی نے کہا۔ "ذرا اس بندے کی اوور ہالنگ کرنا ہے۔"

"اس سے کچھ اگلوانا ہے سر؟" احمد خان نے یوں پوچھا جیسے مکینک گاڑی دیکھ کر پوچھتے ہیں کہ اس کی سروس کرانی ہے یا پھر انجن میں کوئی فالٹ ہے؟

"تم مہمان داری شروع کرو، میں اتنی دیر آ کر اس سے خود سب کچھ اگلوا لوں گا۔"

احمد خان نے اچانک میرے بال پکڑ لیے اور انہیں زوردار جھٹکا دے کر بولا۔ "چل بھئی..... ذرا تیری سروس کر دیں۔" وہ مجھے اسی حالت میں کھینچتا ہوا ایک ایسے کمرے میں لے گیا جس میں عجیب و غریب ساز و سامان تھا، رسیاں تھیں، پانی کی خالی اور بھری ہوئی بالٹیاں تھیں، ڈنڈے تھے، زنجیریں تھیں اور عجیب و غریب قسم کے لکڑی کے کھانچے تھے۔

"احمد دین....." احمد خان نے کہا۔ "پہلے اسے ذرا الٹا لٹکا دو۔"

احمد خان نے میرے پیروں میں رسی باندھی اور اچانک اسے کھینچ لیا۔ میں دھڑام سے فرش پہ گر پڑا۔ اس کا دوسرا سرا ایک چرخی میں لگا ہوا تھا۔ احمد دین نے میری ہتھکڑی کھول کر اس کا سرا کھینچنے کی کوشش کی اور آہستہ آہستہ میرے پیر چھت کی طرف اٹھنے لگے۔ اس نے زمین سے تقریباً پانچ فٹ کی بلندی پر مجھے معلق کر دیا اور رسی کا دوسرا سرا ایک کھپ میں باندھ دیا۔

احمد خان نے اپنی قمیص اتار کے دیوار پہ لگی ہوئی ایک کھونٹی پر ٹانگی پھر اپنی قمیص سے سگریٹ اور ماچس نکال کر اطمینان سے وہاں رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر اس کا گہرا کش لگاتے ہوئے بولا۔ "یار مجھے تجھ پہ رحم آ رہا ہے تو صاحب کی بات مان جا تو فائدے میں رہے گا۔"

www.pdfbooksfree.pk

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے یوں افسردگی سے سر ہلایا جیسے اسے میرے اس فیصلے پر بہت افسوس ہوا ہو۔ وہ آہستہ سے بولا۔ ”ٹھیک ہے بھئی جیسی تیری مرضی جب تک میں سگریٹ ختم کروں تو کوئی فیصلہ کرلے اچھا ہے۔ میں یوں بھی سوچا کرتا ہوں لوگ جانتے ہیں کہ جب میں کچی نیند سے اٹھتا ہوں تو غصہ دگنا ہو جاتا ہے۔“

وہ بکواس کرتا رہا اور میں خاموشی سے ستاتا رہا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے جسم کا تمام خون میرے سر میں جمع ہو گیا ہو اور ابھی تھوڑی ہی دیر میں میرے کانوں اور ناک سے ٹپکنے لگے گا۔

احمد خان نے سگریٹ ختم کی اور اٹھ کھڑا ہوا پھر وہ میرے نزدیک آ کر بولا۔ ”میں تجھ سے آخری دفعہ پوچھ رہا ہوں کہ ہاں یا نہیں؟“

”نہیں.....“ میں نے کہا۔

اس نے زناٹے سے میرے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا۔ میں پینڈولم کی طرح جھولتا ہوا کرسی کے دوسرے سرے کی طرف گیا اور دوبارہ آیا تو پھر اس نے مجھے زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔

وہ شاید مجھے پندرہ منٹ تک جھلاتا رہا اور تھپڑ مارتا رہا۔ میرے دونوں گال سن ہو کر رہ گئے تھے۔ کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی اور شاید میری ناک سے خون بھی بہنے لگا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے چہرے سے زمین پر جو کچھ گر رہا ہے وہ پسینہ ہے یا خون؟

جب احمد خان نے دیکھا کہ میں اس کا یہ حربہ برداشت کر گیا ہوں تو اس نے احمد دین کو حکم دیا کہ اسے کھول دو۔

مجھے سر کے بل کھڑا ہونے کا تجربہ تھا۔ میں روزانہ صبح آدھے گھنٹے تک سر کے بل کھڑا ہوتا تھا پھر جوگنگ کے لیے نکل جاتا تھا۔ شام کو باقاعدگی سے جم جاتا تھا اس لیے مجھے تکلیف تو ہوئی لیکن اتنی نہیں ہوئی جتنی کسی عام آدمی کو ہوتی۔

میں فرش پر بیٹھا تو توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اوندھے منہ گر گیا۔ احمد دین نے میرے پاؤں کھولنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اب تو وہ میرے ہاتھ بھی پشت پر لے جا کر باندھ رہا تھا۔

میرے ہاتھ باندھنے کے بعد احمد خان نے ایک بالٹی اٹھائی اور میرے سر پہ انڈیل دی۔ بالٹی کے کنارے میرے شانوں پر ٹک گئے۔ اب مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اچانک میرے کانوں میں زوردار دھماکہ ہوا' میں بری طرح اچھل پڑا اور ایک دھماکہ ہوا تو میری سمجھ میں آیا کہ احمد خان یا احمد دین باہر سے بالٹی پر کسی بھاری چیز یا ڈنڈے سے ضربیں لگا رہے تھے۔ اس کی آواز اتنی خوفناک تھی کہ جیسے لگ رہا تھا جیسے میں ہمیشہ کے لیے بہرہ ہو جاؤں گا.....

تھوڑی دیر بعد احمد خان نے بالٹی میرے چہرے سے ہٹائی تو میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

”ہاں بھئی اب تجھے کوئی عقل آئی؟“ احمد خان نے کہا۔

میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا جو میری نظروں میں دھندلا رہا تھا پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو احمد خان موت کے فرشتے کی طرح کمرے میں موجود تھا۔ اب سب انسپکٹر بھی وہاں آ گیا تھا۔

”اسے تختے پر باندھ دو.....“ سب انسپکٹر غرا کر بولا۔ ”جب میں اس کے جسم پر جگہ جگہ چرکے لگا کر اس پہ نمک چھڑکوں گا تو اس کی ساری خودداری ناک کے رستے نکل جائے گی۔

احمد خان نے مجھے لمبی اور پتلی سی ایک میز پر باندھ دیا۔ اس نے مجھے اتنی مضبوطی سے باندھا تھا کہ میں اپنی جگہ سے معمولی سی حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”ٹھہرو احمد خان.....“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”پہلے اس کے جسم سے کپڑے اتار لو۔“

احمد خان نے دوبارہ مجھے کھولا اور لمحوں میں مجھے مادرزاد برہنہ کر دیا۔

جسم سے کپڑے اترتے ہی میرا سارا اعتماد رفو چکر ہو گیا۔ کسی کی عزت نفس پر حملہ کرنے کا سب سے خوفناک طریقہ یہ ہے کہ اسے بے لباس کر دیا جائے۔

اس نے مجھے اسی حالت میں باندھ دیا۔

”ارے جان تو خوب بنا رکھی ہے تو نے؟“ سب انسپکٹر نے کہا۔

”یہ جان میں نے اپنی حلال کی روزی سے بنائی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تیری طرح رشوت لے کر اور لوگوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈال کر اپنے پیٹ کا دوزخ نہیں بھرا ہے۔“

مجھے اس وقت مصلحت سے کام لینا چاہیے تھا لیکن بے لباس ہونے کے بعد مجھے اپنے ذہن پر بھی اختیار نہیں رہا تھا۔ میں جو کچھ سوچ رہا تھا' اسے زبان سے ادا بھی کر رہا تھا۔

احمد دین نے وہاں رکھی ہوئی میز سے ایک استرا اٹھایا اور ایس آئی کو دے دیا۔ اس نے استرے میں نیا بلیڈ فٹ کیا اور اس سے میرے سینے پر ہلکا سا چرکا لگا دیا۔ میرے سینے سے پیٹ تک کراس کی شکل میں ایک لکیر کھنچ گئی دوسری لکیر کھینچ کر اس نے ضرب X کا نشان بنا دیا۔ تیسری لکیر اس نے میرے سینے سے ناف کی طرف کھینچی اور احمد خان سے بولا۔ ”اب ذرا اس کے زخموں پر نمک چھڑکو.....“

اچانک احمد خان نے میرے زخموں پر نمک چھڑک دیا۔ میرے حلق سے بے ساختہ چیخ برآمد ہوئی۔ اس نے نہ صرف نمک چھڑکا بلکہ اب وہ اس نمک کو ہاتھوں سے مل بھی رہا تھا۔

”بولو.....“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”صاحب کی آفر قبول کرتے ہو یا نہیں؟“

میں نڈھال سا ہو گیا تھا۔ وہ مجھ پہ جھکا ہوا پوچھ رہا تھا۔ ”بتاؤ..... صاحب کی آفر.....“

میں نے اچانک اس کے منہ پر تھوک دیا۔

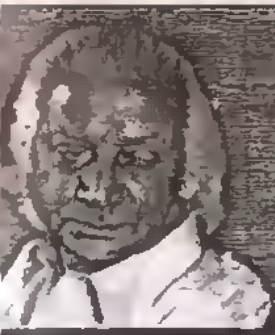
جواب میں اس نے میرے منہ پر زوردار تھپڑ مارا لیکن اس نے میرے چہرے پر اتنے تھپڑ مارے تھے کہ میرے دونوں گال سن ہو گئے تھے۔

”اب میں تیرے جسم کے نچلے حصے پر چرکے لگاؤں گا اور وہ زخم اتنے گہرے ہوں گے کہ تو چیخ چیخ کر صاحب کی آفر قبول کرنے کا وعدہ کرے گا۔“

اس نے استرے میں ایک نیا بلیڈ فٹ کیا اور استرا گویا لہراتا میری طرف بڑھا۔

یہ پرتجسس اور سنسنی خیز داستان ابھی جاری ہے
بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

www.pdfbooksfree.pk



اَب انہیں ڈھونڈ

میرا شہر اِن دنوں پھر بجلی کے بحران کا شکار ہے۔ لوڈشیڈنگ کے بہانے شہریوں کو گھنٹوں اور بعض علاقوں میں دنوں عذاب میں مبتلا رکھا جاتا ہے۔ اِس نام نہاد ''لوڈشیڈنگ'' میں عام آدمی پس کر رہ گیا ہے۔ ایک طرف تو یہ صورتِ حال ہے اور دوسری طرف معاملہ اِس کے بالکل برعکس ہے۔ کراچی کے مختلف پارک اور کھیلوں کے میدان رات رات بھر سرچ لائٹس کی خیرہ کن روشنیوں سے جگمگاتے رہتے ہیں۔ یہ روشنیاں نہ صرف رات بھر جلتی رہتی ہیں بلکہ سارا سارا دن لاکھوں بلب روشن رہتے ہیں۔ اسٹریٹ لائٹس کا بھی یہی حال ہے۔ شادی ہال اور لان بقعۂ نور بنے رہتے ہیں۔ کوئی تقریب ہو یا نہ ہو آرائشی جھالریں اور تیز روشنیاں عام آدمی کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرتی رہتی ہیں۔ پھول بیچنے والوں کے چھوٹے چھوٹے کیبنوں میں ہزار ہزار واٹ کے کئی کئی بلب روشن رہتے ہیں۔ یہ چھوٹے دکاندار عموماً کے ای ایس سی کی ملی بھگت سے ناجائز کنکشن لیتے ہیں پھر کراچی کے بعض علاقے ایسے بھی ہیں جہاں پوری پوری بستیوں میں کنڈا سسٹم کا نظام رائج ہے اور یہ کے ای ایس سی کے بدعنوان اہلکاروں کی ملی بھگت سے چل رہا ہے۔

ریڈیو، ٹی وی اور ذرائع ابلاغ پر توانائی بچانے کی مہم پر کروڑوں روپیہ صرف کیا جارہا ہے اور دوسری طرف یہ اُلّلے تُلّلے ہیں۔ آخر توانائی کا یہ بحران صرف عام آدمی ہی کے لیے کیوں ہے؟ ایک طرف تو یہ صورتِ حال ہے اور دوسری طرف وہ علاقے ہیں جو تاریکی میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ہزاروں طالب علم محض اِس وجہ سے پڑھ نہیں پاتے۔ رات میں کام کرنے والے بیشتر افراد روزی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ گرمی اور حبس کی شدت سے بے شمار مریض جاں کنی میں مبتلا رہتے ہیں۔ بجلی نہ ہو تو پانی کا بھی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔

صورتِ حال کی اِس سنگینی کا ذمے دار کون ہے؟ کے ای ایس سی کے بڑوں سے یہ سوال کون کرے کہ لوڈشیڈنگ کا اثر مخصوص علاقے پر کیوں نہیں پڑتا؟ بجلی کی شکایات کے مراکز بھی موجود ہیں مگر ان کے فونز ہمیشہ مصروف رہتے ہیں۔ یہ بات بھی تجربے میں آئی ہے کہ متعلقہ افراد فون کا ریسیور اٹھا کر نیچے رکھ دیتے ہیں۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ اِس بین الاقوامی شہر میں جہاں چھوٹے بڑے اداروں کے پاس بھی ٹیلی فون کی بیس بیس لائنیں ہیں، وہاں ایک اہم ادارے کے پاس صرف ایک نمبر ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے اگر کوئی شکایت لگانے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو اُسے مختلف طریقوں سے ٹرخایا جاتا ہے اور ایسے وقت کا انتظار کیا جاتا ہے کہ جب کے ای ایس سی والوں کا ''اوور ٹائم'' بن سکے۔ نفسا نفسی کے اِس دور میں کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں ہے۔ یہاں ہر کام وعدۂ فردا پر ٹال دیا جاتا ہے اور عام آدمی یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ

آئے عُشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر
اَب انہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

سہام مرزا مرحوم نے یہ اداریہ مئی 1994ء میں ''دوشیزہ'' کی ''سچی کہانیاں'' کیلئے تحریر کیا تھا۔ ذرا سوچئے کیا یہ اداریہ ہمارے آج کے دور کا عکاس نہیں ہے؟

www.pdfbooksfree.pk